اُردو شاعری کا
سیاسی اور تاریخی پسِ منظر

۱۷۰۷ء ـــــ ۱۸۵۷ء

سید محمد ابوالخیر کشفی

نشریات

اُردو شاعری
کا
سیاسی اور تاریخی پس منظر

۱۷۰۷ء ـــ ۱۸۵۷ء

اُردو شاعری
کا
سیاسی اور تاریخی پس منظر

۱۷۰۷ء ـــــ ۱۸۵۷ء

سیّد محمد ابوالخیر کشفی

۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۰۳۲۱-۴۵۸۹۴۱۹

۸۹۱٫۴۳۹۱ کشفی، محمد ابوالخیر، سیّد، ڈاکٹر
اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر
۱۷۰۷ء ــــ ۱۸۵۷ء
لاہور: نشریات
۲۰۰۷ء ص ۴۲۸
ا۔ تاریخ ادب، شاعری کی تاریخ، ادبیات اُردو
ISBN 978-969-8983-15-4

نام کتاب	:	اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر
مصنف	:	سیّد محمد ابوالخیر کشفی
اہتمام	:	نشریات، لاہور
مطبع	:	میٹرو پرنٹرز، لاہور
قیمت	:	[illegible] روپے

ڈسٹری بیوٹرز

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون:2212991-2629724

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

باجی (والدہ مرحومہ)

اور

طاہرہ

کے نام

جن کے بغیر ہر خوشی ناتمام ہے

ترتیب

حرف آغاز

اردو میں ادبی تحقیق کی روایت اس زبان کی عمر کو دیکھتے ہوئے خاصی پرانی ہے۔ بیسویں صدی میں اردو کے عالموں اور محققوں کے طریق تحقیق میں مشرقی روایات کے ساتھ ساتھ مغرب کے طریقۂ کار کا امتزاج بھی نظر آنے لگا۔ مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسن رضوی، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مالک رام، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور محمد عتیق صدیقی وغیرہ نے مختلف موضوعات، بالخصوص کلاسیکی اردو شعری ادب، صحافت اور افسانوی ادب کے نئے پہلوؤں کو اپنی تحقیقات کے ذریعے پیش کیا ہے، اور کئی موضوعات پر سے وقت کی گرد کو جھاڑ کر نئے نتائج سے ہماری ادبی تاریخ کو متاثر کیا ہے۔

ادبی تحقیق کا تنقید اور مطالعۂ ادب ہی سے نہیں بلکہ ثقافتی، ماضی اور تمدنی تاریخ کے مطالعہ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ تنقید، تحقیق کے بغیر صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتی۔ تحقیق سے تنقید کی راہیں منور ہوتی ہیں۔ تحقیق سے دامن بچانے کا نتیجہ اکثر غیر ذمہ دارانہ بیانات کی صورت میں مرتب ہوتا ہے۔

اردو شاعری اس باب میں خاص طور پر مظلوم رہی ہے۔ ہمارے نہایت ''معتبر'' نقادوں نے بارہا ایسی باتوں کو دہرایا ہے کہ ''قدیم اردو شاعری، گل و بلبل کی داستانوں سے عبارت ہے''۔ ''قدیم اردو شاعری میں ایران و توران کے نقشے ہیں، لیکن گرد و پیش اور برصغیر پاک و ہند کی زندگی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔'' اور ''قدیم اردو شاعری محض

جنسی جذبات یا ایسے ہی موضوعات تک محدود ہے۔ اس میں فکری عنصر نہیں'' وغیرہ وغیرہ۔ گزشتہ بیس پچیس سال میں یہ انتہا پسندی خاصی کم ہو گئی ہے' لیکن ابھی تک ہم نے اپنے ادبی ماضی کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا ہے۔ بعض جائزے ایسے ہیں جو شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں یا تاریخی واقعات کی غیر ضروری تفصیلات کو پیش کرتے ہیں' مگر ان میں نہ تو نتائج پیش کیے گئے ہیں اور نہ کسی واضح نقطۂ نظر کا اظہار ملتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالہ کے طور پر لکھی تھی' اور اب اسے آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے میں نے بعض ایسے حصے حذف کر دیئے ہیں جن کے بغیر یہ بحث زیادہ تشنہ نہ معلوم ہو گی۔

تحقیقی مقالہ کے عناصر کے بارے میں ماہرین کے خیالات کا خلاصہ ایف۔ ایم۔ ال باغ نے یوں پیش کیا ہے:

1. شخصی تحقیق و تلاش اور فکر
2. اس موضوع پر معلومات میں اضافہ
3. کوئی نیا نقطۂ نظر جو عام مسلمات و مفروضات کی جگہ کسی دوسری حقیقت کو پیش کرے۔
4. کسی مسئلہ کی نشان دہی' یا اس کا حل اور نتائج کا حصول

زیر نظر کتاب کے موضوع پر بعض دوسرے اصحاب نے تحقیقی کام بھی کیا ہے جو بڑی حد تک ''جائزہ'' تک محدود ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ بات محض ''جائزہ'' تک محدود نہ رہے بلکہ چند اہم نتائج تک پہنچا جا سکے۔ میں نہیں کہتا کہ اس مقالے سے اردو شاعری کے بارے میں موجودہ معلومات میں کوئی حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے' یا کوئی انقلابی اور نیا نقطۂ نظر وجود میں آیا ہے' لیکن انکسار کے ساتھ یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ اس میں مطالعہ کے ساتھ ساتھ شخصی تلاش و فکر کے عناصر موجود ہیں۔ بات ایک مثال سے واضح ہو سکے گی۔ ۱۷۰۷ء سے پہلے کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے میں نے

دکنی شاعری میں قومیت کے عناصر پر گفتگو کی ہے۔ میری دانست میں اس سے پہلے اس پہلو کی طرف لکھنے والوں نے دو چار سطروں میں اشارے ضرور کیے ہیں مگر ایک موضوع کے طور پر اسے نہیں پیش کیا گیا۔

تحقیقی مقالہ میں ''عالمانہ اخلاق یا علمی اخلاق'' نہایت ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی بڑے محقق اور عالم کی کوئی تحقیقی غلطی سامنے آئے تو ''حلق پھاڑ کر چلاّنا'' مناسب نہیں۔ یہ بات نہ تو کسی شریف آدمی کو زیب دیتی ہے اور نہ متلاشئ علم کو۔ معترض کی تحقیق میں اس سے زیادہ سنگین غلطی یا غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ غلطی کا ازالہ اور نشان دہی لازم ہے، لیکن شاید اس سے زیادہ اہم بات اس مصنف اور محقق کے کسی قدیمی اور غلط ماخذ کی نشاندہی ہے۔ اسی طرح ''با اخلاق لہجہ'' بات کو کمزور نہیں بنا دیتا۔ بدقسمتی سے گزشتہ چند برسوں سے تنقید کی طرح تحقیق کے میدان میں بھی جملہ بازی کا رواج بڑھ گیا ہے اور اسی نسبت سے غیر ذمہ دارانہ بیانات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ کسی محقق کی کسی غلطی کی نشان دہی کے ساتھ کسی علمی اور تعلیمی ادارے پر حملہ کرنے کا نیا فیشن بھی اس کی ایک شاخ ہے۔

غیر ذمہ داری اور علمی اخلاق سے بے گانگی کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

مصحفی کے بارے میں ایک ''محقق'' کے مضمون کے یہ دو ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

''مصحفی کی ولادت کے سال کا تعین ابھی تک نہیں ہو سکا''۔

''مولانا حسرت موہانی نے سالِ ولادت ۱۱۶۴ھ، عمر ۷۶ سال اور سالِ وفات ۱۲۴۰ھ قرار دیا ہے۔''

ہمارے ''محقق'' نے سب سے پہلے تو مصحفی کے سالِ ولادت کے متعین نہ ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا حسرت کے بیان کو دہرایا ہے۔ آگے چل کر موصوف اپنے ایک ہم عصر محقق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

''لکھتے ہیں کہ ۱۱۶۴ھ زیادہ قرینِ صحت ہے، لیکن ...... نے جہاں اپنے

قیاس سے کام لے کر سنین کا تعین کیا ہے وہاں ان سے سخت تسامح ہوا ہے۔"

ان تینوں اقتباسات کو یکجا کیجیے تو غیر ذمہ داری کے ساتھ ساتھ شخصی تعصب کا عنصر بھی نظر آ جائے گا۔ جس محقق پر اعتراض کیا گیا ہے اس نے مولانا حسرت موہانی اور مولوی عبدالحق کے پیش کردہ سنین کا تقابل کرتے ہوئے مولانا حسرت کے سن کو "زیادہ قرین صحت" قرار دیا ہے۔ "قرین صحت" میں ایسی قطعیت نہیں کہ اس انداز سے گرفت کی جائے اور پھر مولانا حسرت کا بیان اس کا ماخذ ہے' اس لیے اگر تسامح ہے تو مولانا حسرت کا۔ موصوف ایک محقق پر ایسی زبان میں اعتراضات کرنے کے بعد خود مصحفی کے سال ولادت کا تعین جس زبان اور اسلوب میں کرتے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو۔ ان کے نزدیک مصحفی ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے' مگر ان کے دلائل کی قوت کا اندازہ ایک ہی جملہ بلکہ فقرہ سے ہو جائے گا۔

"کیوں نہ ہم اسی سال کو ان کی ولادت کا سال مان لیں"۔

علمی اخلاق کے ساتھ ساتھ انکسار اور احتیاط بھی تحقیقی مقالہ کے عناصر ہیں۔ احتیاط اور انکسار دونوں اس امر کے طالب ہیں کہ "لازمی طور پر" اور "حقیقت تو صرف یہ ہے" جیسے فقروں اور ٹکڑوں کی جگہ "ہمارے نزدیک' غالباً' شہادتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے" جیسے ٹکڑوں سے کام لیا جائے۔ اسی طرح کسی بات کو کسی واقعہ کا واحد سبب قرار دینا بسا اوقات درست نہیں ہوتا' کیونکہ ہر بڑے واقعہ کے ساتھ اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اور یہ اسباب تلاش و فکر اور تحقیق سے آہستہ آہستہ نظر کے سامنے آتے ہیں۔

ان معروضات کے بعد زیرِ نظر مقالہ کے بارے میں چند اور باتیں بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے یہ موضوع میرے لیے تجویز فرمایا تھا۔ وہ اس موضوع سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ویسے دور کی تحدید میرے رہنما ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے فرمائی' ان شاء اللہ ۱۸۵۷ء سے عہد حاضر تک کے دور کا جائزہ

اس کتاب کے دوسرے حصے کے طور پر پیش کروں گا۔

۲ شاید مقالے کا عنوان میرے موضوع پر پوری طرح حاوی نہیں، لیکن میرے نزدیک عنوانات، ایک اشارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳ سیاسی پس منظر کو میں نے بہت زیادہ تفصیل سے نہیں پیش کیا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اردو کے محققین نے اس ضمن میں بہت کام کیا ہے۔ مثلاً جرأت پر اپنی کتاب میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے آج سے تقریباً بیس سال پہلے اٹھارویں صدی کے سیاسی اور سماجی ماحول پر بہت تفصیل سے لکھا تھا۔ یہی تفصیل ہمیں میر پر خواجہ احمد فاروقی کے مقالے میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے حالی کی نثر پر اپنے تحقیقی مقالہ میں سیاسی پس منظر کو ابھارا ہے۔ میں نے اس حقیقت کے پیش نظر اختصار سے کام لیا ہے، لیکن سیاسی پس منظر کی یہ تصویر مختصر ہونے کے باوجود غالباً روشن اور واضح ہے۔ اس ضمن میں میں نے کوشش یہ کی ہے کہ مختلف قوتوں کی کشمکش کا احساس قاری کو پوری طرح ہو سکے۔ دہلی اور لکھنؤ پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ واقعات کی ہم عصر تاریخی شہادتوں کو حسب توفیق و ضرورت پیش کیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اِس دور کے مؤرخوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ بعض پرانی تاریخی دستاویزوں سے اردو کے ادبی مؤرخوں نے استفادہ نہیں کیا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض چھپ چکی ہیں۔

۴ سیاسی پس منظر کے بیان میں، میں نے ممکنہ معروضیت اور غیر جانبداری برتنے کی کوشش کی ہے، ویسے میری ناچیز رائے میں مکمل غیر جانب داری نفسیاتی طور پر ممکن نہیں۔

تجزیہ میں بھی میں نے "معروضیت" کو اپنا مقصود جانا ہے، لیکن تجزیہ میں لکھنے والے کے نقطۂ نظر کی خاصی اہمیت ہوتی ہے۔ مختلف لکھنے والے ممکن ہے کہ ایک سے عناصر کو پالیں، لیکن ان عناصر کی اہمیت ان کے ہاں مختلف ہوگی۔ میرے نزدیک اسلام

سے دوری اور ''مسلم کردار کا بحران'' اس زوال کا بنیادی سبب تھا۔ میں نے دوسرے عناصر کو بھی مناسب اہمیت دی ہے۔

۵ بعض مقامات پر میں نے حوالوں کو اپنی عبارت کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ طریقِ کار واقعاتی حوالوں کے لیے نہایت مناسب ہے۔ لیکن جہاں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ مصنف کے الفاظ اہم ہیں' وہاں حوالہ میں اصل الفاظ ہی دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح میں نے حوالوں کی زبان کے سلسلہ میں اپنی قوتِ فیصلہ سے کام لیا ہے۔ کہیں حوالے اصل زبانوں (فارسی' انگریزی) میں دیئے گئے ہیں اور کہیں ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

۶ میں نے واقعات کی تفصیل سے زیادہ اسباب وعلل پر نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ سید احمد شہید کی تحریک' انتزاعِ سلطنتِ اودھ اور ۱۸۵۷ء سے متعلق ابواب سے اس بات کی وضاحت ہو سکے گی۔ میں نے واقعات کی تفصیلات نہیں لکھی ہیں' بلکہ اس عہد کی شاعری کے ذریعہ اس پہلو کو پیش کیا ہے۔ ان ابواب میں میں نے اردو کے اہلِ قلم کی نثری کتابوں کو ''ٹھیٹ'' تاریخی (ویسے تو یہ تحریریں بھی تاریخی ہیں) کتابوں پر ترجیح دی ہے۔ تاریخی پس منظر میں تاریخ کی کتابوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ذکرِ میر کو میں نے میر کی شاعری کے ساتھ ساتھ متعلقہ باب میں پیش کیا ہے اور اسے ''تاریخی پس منظر'' میں تاریخی ماخذ کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں ذکرِ میر کو غیر معتبر سمجھتا ہوں' بلکہ میرے نزدیک ذکرِ میر' میر صاحب کی زندگی کا حصہ ہے' جو ان کی شاعری کو سمجھنے میں ہماری معاونت کرتا ہے' ویسے بھی یہ کتاب ''تاریخی ربط'' کی وجہ سے اہم نہیں بلکہ میر کے مشاہدات اور آپ بیتی ہونے کی وجہ سے اہم ہے۔ ایسی تحریریں' بسا اوقات عام تاریخوں سے زیادہ کسی دور' واقعہ یا ماحول کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ مثلاً خطوطِ غالب میں مسلمانوں کی بے بسی اور ۱۸۵۷ء کے بعد دلی

کے مصائب کی جو تصویریں گہری دردمندی کے ساتھ ملتی ہیں ان سے ہماری تاریخیں محروم ہیں۔

۷ مقالہ کے آخری باب میں میں نے رموز و علائم اور اسالیب بیان پر سیاسی اثرات کی نشاندہی کی کوشش کی ہے۔ میں نے نظموں، مثنویوں اور دوسری اصناف سخن کے ساتھ ساتھ غزلوں کا مطالعہ بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے کیا ہے۔ جن اشارات و علائم کی سیاسی معنویت پر میں نے زور دیا ہے، بہت سے شاعروں نے انہیں روایتی طور پر بھی پیش کیا ہے۔ میں نے نہایت دیانت کے ساتھ کوشش کی ہے کہ روایتی عناصر کو توڑ موڑ کر کسی بات کے ثبوت کے لیے پیش نہ کروں۔ ''قفس'' ''گلستاں'' ''گل'' حسرتِ پرواز'' اور ''بے بال و پر'' جیسے اشاروں کی عمومیت پر تکیہ نہیں کیا ہے۔ جن شعروں کے اسلوب یا پس منظر سے ان کی سیاسی اہمیت نہیں ابھری ہے انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

۸ میں نے کوشش کی ہے کہ کم سے کم صفحات میں اپنے موضوع کا حق ادا کر سکوں، اس لیے شاعری کے نمونے بہت زیادہ نہیں دیئے ہیں۔ جن شعراء کا مطبوعہ کلام آسانی سے مل جاتا ہے ان کی نظموں، مثنویوں، شہر آشوبوں وغیرہ سے مختصر حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ حال ہی میں اردو شہر آشوب کے مجموعے اور کئی شعراء کے کلیات بھی شائع ہو گئے ہیں، جن شعرا کا کلام غیر مطبوعہ ہے یا آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا ان کے حوالے نسبتاً طویل ہیں۔

اشاعت کے لیے مقالہ کو ترتیب دیتے ہوئے میں نے بعض شعراء کے نمونوں اور ان کے ذکر کو حذف کر دیا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کی شاعری کے سلسلہ میں ''ریختی میں تاریخی پس منظر اور واقعات'' کو بھی مجبوراً حذف کر دیا ہے۔

اور اب میں حرف آغاز کے اختتام پر سب سے نازک مرحلہ تک آ گیا ہوں۔ ''حساب دوستاں در دل'' اپنی جگہ درست سہی، لیکن قلم چاہتا ہے کہ کم سے کم اعترافِ

احسان تو کر لیا جائے۔

بابائے اردو مرحوم نے پہلے اور دوسرے باب کے ابتدائی مسودے کو ملاحظہ کیا تھا اور چند نہایت مفید مشورے دیئے تھے۔

''ابتدائی ابواب کے بعد کئی سال طبیعت تحقیق کی وادی سے گریزاں رہی۔ ڈاکٹر ابواللیث صاحب نے محبت اور غصہ کے جذبوں اور دوسرے حربوں سے دلِ وحشی کو رام کر کے پھر اس کام کی طرف متوجہ کیا' قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور یوں مشکلوں کو سہل کیا۔ استادِ گرامی جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اس مقالہ کی بعض غلطیوں کی نشان دہی فرمائی۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے نہایت دلچسپی سے اس کا مطالعہ فرمایا اور کلماتِ خیر سے ابوالخیر کا دل بڑھایا۔

وطنِ عزیز کے عظیم مؤرخ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس مقالہ پر تنقیدی نظر ڈالی اور کئی مفید مشورے دیئے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا مشورہ تھا کہ ضروری مگر ایسے ضمنی و ثانوی نکات' جن کا تعلق شاعروں کے احوال سے ہے' متن سے نکال کر حواشی میں درج کیے جائیں۔ یوں عبارت کے راستے میں کئی مقام پر جو نکات رکاوٹ بن کر حائل تھے اب حاشیہ میں درج کیے گئے ہیں۔

اسی مقالہ کے سلسلہ میں دوسرے کتب خانوں کے چکر لگانے کے بعد جب رام پور پہنچا تو جناب امتیاز علی عرشی کی خضر صفتی کا اندازہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور اسی سفر میں ایک زندہ گوہر نایاب سے کیسۂ رفاقت و دوستی کو پُر مایہ بنایا۔ عابد رضا بیدار' نائب کتاب دار کی حیثیت سے ملے اور پھر مطلع دوستی پر یوں چمکے جیسے۔

جامعہ کراچی کے کتب خانہ میں ایک مردِ معقول ہیں جناب فضل اللہ فاروقی۔ انہیں جب اور جہاں کہیں کوئی ضروری حوالہ یا مواد نظر آیا انہوں نے مجھے اس سے مطلع کیا۔

جناب شاہ عالم اور جناب کیفی حیدر آبادی نے راتوں کو جاگ کر اس مقالہ کو

ٹائپ کیا۔ یہ مشینی کام انہوں نے اس محبت سے کیا کہ ٹائپ کی آواز میں دل کی آواز بھی شامل ہوگئی۔ اور پھر ٹائپ کی غلطیوں کی اصلاح مجھ سے زیادہ محنت سے کمال بھائی نے کی۔ مجھے اکثر تعجب ہوا کہ وہ ادب کی دنیا میں آنے کی جگہ بینک کاری کے ریگستان میں کیوں پھنس گئے اور جن راتوں کو جاگ کر ہم نے "صبح کیا" ان میں سلیمان بھائی نے چائے پلا پلا کر بیدار رہنے کا سامان مہیا کیا۔ اور اب عزیزی محمد یونس کی نگرانی میں ان شاء اللہ مقالہ شائع ہوگا لیکن وہ شکریہ ادا کرنے پر ناراض ہو جائیں گے۔

شکر کے بعد شکوہ کی باری آتی ہے۔ "خوگر حمد" نے بھی کبھی گلہ کیا تھا مگر مجھے جس شخص سے شکوہ ہے شاید وہ اس کا اہل نہیں، میں کیوں ناحق، اپنے قلم کو اس کے ذکر سے آلودہ کروں۔ ایسے لوگوں کا ظلم بھی کام کرنے والوں کے لیے معین و مددگار ہی ثابت ہوتا ہے۔

حرف آغاز کی نوعیت ذاتی بیان کی سی ہے، اسی لیے "میں" سے گریز ممکن نہ ہو سکا ویسے میں نے مقالہ میں "میں" سے نجات حاصل کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

ابوالخیر کشفی

اوساکا، جاپان

جولائی ۱۹۷۳ء

کچھ اشاعت ثانی کے موقع پر

اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی' ہمارے ایک دوست محمد یونس صاحب کا رسالوں کا اسٹال برنس تھا۔ انہیں ادبی کتابیں چھاپنے کا خیال آیا۔ اور انہوں نے مجھ سے میرا کوئی مسودہ طلب کیا۔ میں نے انہیں اپنے تحقیقی مقالے کی نقل فراہم کر دی۔ انہیں کتابوں کی اشاعت کا کوئی تجربہ نہ تھا اور غلطی سے انہوں نے گیارہ سو کی جگہ پندرہ سو نسخے تیار کرا لیے۔ زندگی کے تمام مسائل اور الجھنوں کے باوجود ابھی کتاب کا مطالعہ ہمارے معاشرے میں اجنبی نہیں ہوا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک سال کے اندر یہ کتاب فروخت ہوگئی' حالانکہ اسے یونس صاحب پنجاب کے تاجروں تک پہنچانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

آج دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان (جیسا کہ ہمارا دعویٰ ہے) میں کتابوں کی اشاعت کا یہ عالم ہے کہ تحقیقی وتنقیدی کتابوں کا ایڈیشن عام طور پر پانچ سو نسخوں کا ہوتا ہے۔ اور اس کی اشاعت کے لیے بھی ایک مستحکم تجارتی سلسلے (نیٹ ورک) کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صورت اردو کے ہر بہی خواہ کے لیے تشویش ناک ہے' ان حالات میں عزیز گرامی پروفیسر عبدالجبار شاکر کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا محرک بنے' میں عرصے سے اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ پنجاب سے کچھ اساتذہ اور تحقیق کے طلبا نے اس کی فرمائش کی تھی اور میں اس کی عکسی کاپیاں بھیج کر اپنے آپ کو زیر بار محسوس کرتا تھا۔

اس کتاب کی نئی اشاعت کے موقع پر میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ اس موضوع پر اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن اس کے مطالعے میں پڑھنے والوں کے لیے علمی منفعت کے کئی پہلو ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کتاب ہماری تاریخ کے نہایت نازک ڈیڑھ سو سال کی اردو شاعری کا احاطہ کرتی ہے۔ اور شاید اس موضوع پر کسی دوسری کتاب میں قومی تحریکوں کا

اس طرح ذکر نہیں کیا گیا میں نے دکنی شاعری میں قومیت کے سیاسی نظریے کی نشان دہی کی ہے۔ اور شاید پہلی مرتبہ حب الوطنی کے جذبے اور قومیت کے سیاسی نظریے کے درمیان اس تناظر میں تفریق کی گئی ہے۔ اسی طرح اس دور کی شاعری کے فکری' لسانی اور تمدنی تجزیے میں بہت سے قابل ذکر نکات آ گئے ہیں میں نے اس دور کی زبان کی تسہیل پر بھی گفتگو کی ہے اور تصورات کے اسباب اور پس منظر کو بھی اجالا ہے۔

مکمل طور پر غیر جانبداری نفسیاتی طور پر ممکن نہیں ہے' تاریخ کے مطالعے میں میں نے اسلامی تصورات اور تاریخی اہمیت کو اپنے پیش نظر رکھا ہے' لیکن نتائج اخذ کرنے میں حتی الامکان غیر جانبداری اور دیانت کا خیال رکھا ہے۔ سید احمد شہید کی تحریک اور ۱۸۵۷ء کے متعلق ابواب سے میری اس بات کی وضاحت ہو سکے گی۔ میں اپنے خیال پر قائم ہوں کہ برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کی حقیقی وجہ کردار کا بحران تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو شاعری میں قومی تحریکوں کا ذکر اور شاعروں کا سیاسی شعور مختلف کتابوں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ میری تمنا تھی کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی ہو۔ یہ ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن میں ان شاء اللہ ان تنقیدی مطالعوں کو پیش کروں گا جن میں موضوعاتی وحدت ہے اور جو مجموعی طور پر بعد کے ادوار کی شاعری کے سیاسی اور تاریخی پس منظر پیش کر سکیں گے۔

سید محمد ابوالخیر کشفی

۱۵ اپریل ۲۰۰۷ء

1...... ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ تک

سیاسی واجتماعی حالات کا مختصر تاریخی جائزہ

2...... ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک

تاریخی واقعات کا سیاسی' اقتصادی اور تمدنی تجزیہ

۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک

سیاسی و اجتماعی حالات کا مختصر جائزہ

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات ایک عظیم حکمراں' منتظم اور فاتح کی موت ہی نہ تھی' بلکہ ایک دور کے خاتمے کا اعلان تھی۔ اورنگزیب کی موت کے ساتھ تاریخ کا ایک عظیم دور ختم ہوگیا اور اس کی جگہ انتشار' ہنگامہ پروری اور بے نظمی کا ایسا عبوری دور شروع ہوا جو برعظیم پاک و ہند کو ڈیڑھ سو سال تک اپنی گرفت میں لیے رہا۔ یہ ڈیڑھ سو سال ایسی مدت کی طرح تھے جس کے بارے میں ہم میتھو آرنلڈ کے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ پرانی دنیا تھی کہ مر ہی نہیں چکتی تھی' اور نئی دنیا ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

یہ ڈیڑھ سو سال ایک تاریک رات یا پریشان خوابوں کے سلسلہ کی طرح ہیں۔ وہ سلسلہ جس میں بدیسی سامراج کا ہیولا ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں آہستہ آہستہ اُبھر کر ایک طاقت بنتا گیا اور ۱۸۵۷ء میں دوسرے سارے نقوش کو مٹا کر یہ نقش نوے سال کے لیے برعظیم کا مستقبل بن گیا۔ اس عہد کے تاریخ نویس کو کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ مسائل اور واقعات بکھرے ہوئے اور الجھے ہوئے ہیں' اور الجھاؤ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ اورنگ زیب نے ہار کے دھاگے کی طرح برعظیم کے مختلف جغرافیائی خطوں کو آپس میں منسلک کر رکھا تھا۔ اس دھاگے کے ٹوٹتے ہی یہ خطے ہار کے موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہونے سے مختلف صوبے بڑی حد تک خود مختار بن گئے۔ کئی انتشار پسند طاقتیں تاریخ کے دھاروں میں شامل ہوگئیں۔ مثلاً مرہٹے' سکھ' جاٹ۔ یہی دور ہماری شاعری کا تشکیلی دور ہے۔

۱۷۰۷ء (م ۱۱۱۸ھ) میں اورنگ زیب نے اپنی بیماری کو مرض الموت سمجھ کر

مستقبل کے بندوبست کی طرف دھیان دیا۔ چھوٹے بیٹے محمد کام بخش کو احمد نگر سے بیجا پور تک کے علاقہ کا صوبہ دار بنا کر روانہ کیا اور منجھلے بیٹے محمد اعظم شاہ کو مالوہ کی صوبہ داری دے کر رخصت عطا کی۔ بڑا بیٹا محمد معظم صوبہ کابل میں اپنے بیٹوں خجستہ اختر اور رفیع القدر کے ساتھ تھا۔ محمد معزالدین ملتان کا صوبہ دار تھا۔ اورنگ زیب نے خانہ جنگی کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے شمالی ہند کی سلطنت محمد معظم کو، دکن محمد اعظم شاہ کو اور بیجا پور کام بخش کو دے دیا تھا۔ مگر ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ کو اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی جانشینی کی جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اعظم شاہ چند فرسخ گیا تھا کہ لوٹ آیا اور ۱۰ ذی الحجہ (۱۵ مارچ ۱۷۰۷ء) کو احمد نگر میں تخت نشینی کی۔ محمد معظم بھی باپ کے انتقال کی خبر سن کر کابل سے روانہ ہوا۔ محمد معظم نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی تخت نشینی کی رسم ادا کی اور اپنے بھائی محمد اعظم کو لکھا: ''تم دکن کی سلطنت سنبھالو، مجھے ہندوستان دے دو''۔ خافی خاں کی روایت کے مطابق تو بہادر شاہ اول نے بھائی کے صوبوں میں اضافہ بھی کرنا چاہا تا کہ مسلمانوں کا خون باہمی خانہ جنگی میں نہ بہے۔

''نامۂ نصیحت آمیز بہ برادر بنویسند مشتمل براینکہ پدر بزرگوار بخط مبارک وصیت نامہ مبنی بر تقسیم ملک نوشتہ از جملہ شش صوبۂ دکن چہار پنج صوبہ مع صوبۂ احمد آباد بشما ارزانی داشتہ۔ سوائے آں یک دو صوبہ دیگر ہم شما تواضع نمائم ونمی خواہم کہ خوں ریزی مسلماناں بہ میان آید''۔[1]

اعظم نے جواب دیا کہ ''دو بادشاہ در اقلیمے نمی گنجند'' اور اس نے اپنے لشکر کے ساتھ کوچ کیا۔ میدانِ جا جو میں دونوں فوجوں کا محاربہ ہوا۔ اعظم کو شکست ہوئی، شہزادہ بیدار بخت اور اعظم شاہ مارے گئے۔ شہزادہ علی تبار کو چچا کے سامنے پیش کیا گیا'' ''بہادر شاہ بھائی کا سر دیکھ کر متاسف اور گریاں ہوا اور شہزادہ پر رحم فرما کر نظر پرورش فرمائی۔

[1] خافی خاں۔ منتخب اللباب۔ فولیو (دو ورقہ) نمبر ۱۴۔ مائیکروفلم کتب خانہ جامعہ کراچی

حین حیات تک اپنے لڑکوں کے برابر عزت کرتا رہا۔[۲]

اعظم کی طرح محمد کام بخش بھی مارا گیا اور یوں تخت نشینی کا یہ خونیں باب مکمل ہوا۔ چند دنوں کی ''حکومت'' کے لیے اعظم اور کام بخش نے بھی اپنے سکے لکھوائے اور اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کیا۔ مرزا محمد دانش مند خاں (نعمت خاں) نے بادشاہ نامۂ عہد مبارک میں اعظم شاہ کی تخت نشینی اور اس کے سکہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''آبروئے ذہب رفت ونرخِ فضہ شکست''[۳]

محمد معظم بہادر شاہ اول کے لقب سے عالم گیر کے جانشین بنے۔ محمد دانشمند خاں نے سکہ لکھ کر خدمت میں پیش کیا۔

''فدوی جانفشاں را کہ مخاطب بخطاب دانش مند خاں است بارِ دگر مامور بگفتنِ بیتے بجہتِ نقش سکہ مبارک شد' وایں بیت بداہۃً گفتہ از نظر انور مرحمت اثر گزرانید''

شاہِ عالم پادشاہ غازئ گردوں جناب
سکہ شد روشن زنام نامیش چوں آفتاب[۴]

بہادر شاہ اول کا دور ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک کا ہے۔ تقریباً پانچ سال کی اس مدت میں بہادر شاہ اول نے انتظام کو درست کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف مسائل سے نپٹنے کی کوشش بھی کی۔ تالیف قلب کے لیے اس نے لوگوں کو خطاب و منصب سے اس درجہ نوازا کہ ''عمدہ خطاب اور بڑے بڑے منصب ہر ایک کو ملنے لگے۔ کسی کا امتیاز نہ رہا۔ ہندو مسلمان شش ہزاری ہفت ہزاری ہو گئے۔ ......منصب و خطاب کا وہ بڑھاوا ہوا کہ اعتبار سے گھٹ گئے''[۵]

---

[۲] مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین (مترجم منشی گوکل پرشاد) جلد دوم صفحہ ۱ تا ۵۔ نولکشور پریس ۱۸۹۸ء۔ نیز ذکاء اللہ تاریخ ہندوتاریخ اعظم الحرب۔

[۳] دانش مند خاں۔ بادشاہ نامۂ عہد مبارک۔ مخطوطہ برٹش میوزیم۔

[۴] حوالۂ بالا ص ۶۲۔

[۵] مراۃ السلاطین جلد دوم صفحہ ۷

بہادر شاہ اول کو سکھوں اور مرہٹوں کی شورش کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سکھوں کی جماعت میں سیاسی رنگ تو جہانگیر کے دور ہی سے گرو ارجن کی قیادت میں پیدا ہو گیا تھا۔ عالمگیر کے عہد میں گرو تیغ بہادر باغیوں کی صف میں تھے۔ گرو گوبند کی قیادت میں سکھ عہدِ بہادر شاہ اول کا ایک بڑا فتنہ بن گئے۔ اسی سفر میں جب کہ بادشاہ عازم شہر راجپوتانہ کا تھا گرو گوبند کی سرکشی سنی گئی۔[6] سکھوں نے سرہند سے لے کر سہارن پور تک قتل و غارت گری کا سلسلہ پھیلا رکھا تھا اور ان کے مظالم کا یہ عالم تھا کہ

چناں بیداد و ظلم نمود ند کہ شکم عوراتِ حاملہ را پارہ ساختہ ...... و عمارات را سوختہ' فقیر و غنی را بیک صورت می ساختند' و ہر جا کہ مسجد و مقبرہ و مزارِ بزرگاں یافتند در شکستن و کندن آں و برآوردن استخوانِ مردہ ہا تقصیر نہ نمودند[7]

بہادر شاہ اول نے اپنے مختصر عہد حکومت میں حکومت کی شیرازہ بندی کے ساتھ لوگوں کی بہبود اور قیام امن کے لیے لگن سے کام کیا۔ فروری ۱۷۱۲ء میں اس کے انتقال نے ایک بار پھر تخت نشینی کی جنگ اور برادر کشی کی روایت کا موقع فراہم کر دیا۔

محمد عظیم الشان وقت نزع موجود تھا۔ امین الدولہ اور نعمت اللہ خاں کے کہنے سے جلوس کیا۔ ذوالفقار خاں معز الدین کے پاس گیا اور اسے مشورہ دیا کہ "رفیع القدر اور جہاں شاہ اور خجستہ کو فی الحال شامل کر لیجیے۔ بعد میں جب عظیم الشان پر دسترس ہو جائے جو کچھ مناسب ہو کیا جائے گا"۔[8] معز الدین بڑا شہزادہ اس جنگ میں کامیاب ہوا۔ عظیم الشان مارا گیا اور فاتح شہزادہ جہاندار شاہ کے لقب سے بابر و ہمایوں کے تخت پر ۱۷۱۲ء (م ۱۱۲۴ھ) میں بیٹھا۔

جہاندار شاہ کے عہد سے بادشاہ گری امرأ و وزراء کے ہاتھ میں آ گئی۔ ایک سال سے کم مدت میں خزانہ خالی ہو گیا۔ لال کنور بادشاہ پر چھا گئی اور ڈوم ڈھاڑی عمائد

---

۶ حوالہ بالا صفحہ ۷۔۸

۷ خافی خاں۔ منتخب اللباب فولیو ۵۶

۸ مراۃ السلاطین۔ جلد دوم صفحہ ۹

سلطنت بن گئے۔ انتہا تو یہ کہ بعض روایات کے مطابق لال کنور کی تفریح طبع کے لیے ایک کشتی دریا میں غرق کرا دی گئی' کیونکہ وہ کشتی کے ڈوبنے کا منظر دیکھنا چاہتی تھی۔

ہمہ برادران و خویشانِ دور و نزدیک لعل کنور بمنصب چہار ہزاری و پنج ہزاری و عطائے فیل و نقارہ و جواہر بیش بہا سرفرازی یافتہ میانِ ہم قومِ خود مختار گردیدند و اعتبارِ خانہ زادان و دیگر صاحبِ کمالاں و علما ازمیان برخواست...... گویند لعل کنور گفت می خواہم غرق شدن کشتی بہ بینم۔ فرمودند کہ یک کشتی پُر از آدم غرق نمایند کہ بعضے راکبانِ کشتی غرق گردیدند و چند نفر برآمدند۔[9]

خافی خاں نے اپنے اسی بیان کے سلسلہ میں ایک اور روایت نقل کی ہے کہ ایک رات جب بادشاہ' لال کنور کے ساتھ بدمست ہو کر کلال خانے سے لوٹا تو ہوش باختہ لال کنور' رتھ سے اُترتے وقت بادشاہ کو مطلقاً بھول گئی اور بادشاہ سلامت رتھ میں بے ہوش پڑے رہے۔ آخر جب بادشاہ کی خواصوں نے لال کنور سے پوچھا تو بادشاہ کی تلاش ہوئی اور وہ رتھ خانے میں پڑے پائے گئے۔ ویسے خافی خاں اس درجہ محتاط مؤرخ ہے کہ اُس نے اس روایت پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ "عقل در قبول ایں نقل تردّد دارد"۔ لیکن جہاندار شاہ کے دورِ حکومت اور دوسری ہم عصر یا قریبی زمانے کی تواریخ کے پیش نظر یہ واقعہ درست معلوم ہوتا ہے۔ خود خافی خاں نے بھی انکار نہیں کیا ہے محض شک کا اظہار کیا ہے۔

چہار گلشنِ محمد شاہی' کے مصنف نے جہاندار شاہ کے مختصر دور پر جامع تبصرہ کیا ہے جس میں لال کنور کے تسلط کے ساتھ ساتھ عام بدنظمی اور جہاندار شاہ کے عہد کے خاتمہ کا ذکر بھی شامل ہے۔

"جہاندار شاہ عرف محمد معز الدین پسرِ کلاں بہادر شاہ بعد فتح بر عظیم الشان در سنہ یک ہزار و یک صد و بست و چہار در لاہور جلوس نمودہ۔ بعد جنگ از ہر سہ برادرِ خود بہ دہلی آمدند۔ لال کنور کہ از نسلِ میاں تان سین کلاونت

---

[9] خافی خاں۔ منتخب اللباب۔ دو ورقہ ۵۶۔

بود و بحُسن و جمال آرا گری خالق بودٗ دلِ بادشاہ را در گروِ خود میداشت و برادران و اقربائے او بہ امارت رسیدہ بر مردم تعدیہامی کروند...... چوں محمد فرخ سیر کہ بہ صوبہ داریٔ عظیم آباد و پٹنہ بودند از استماع اخبار رحلتِ بہادر شاہ و شہادتِ پدر خود رسید...... ہفدہم محرم سنہ یک ہزار و یک صد و بست و پنج جنگ درمیان آمد۔ معزالدین ہزیمت یافتہ گریختہ آمد و در دہلی بدستِ نوکرانِ خود دست گیر شد و فتح و نصرت نصیبِ فرخ سیر شدٗ و بموجبِ حکم ایشاں بہ قتل رسید'' [۱۰]

اس اجمال کی کسی قدر تفصیل یہ ہے کہ جہاندار شاہ' لال کنور اور اُس کے کنبے کو ساتھ لے کر لڑنے نکلے۔ دونوں قید کر لیے گئے اور انہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں کی لاشیں تین دن بے گور و کفن پڑی رہیں۔ ذوالفقار خاں کے بوڑھے باپ جملۃ الملک اسد خاں کی ذلت میں کوئی کمی نہ چھوڑی گئی۔

۱۷۱۳ء سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایسا دور جس میں اختیار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر اُمراء کی ذات میں مرکوز ہو گیا۔ اس کا آغاز ساداتِ بادشاہ گر سے ہوتا ہے۔ صاحب چہار گلشن نے بتایا ہے کہ محمد فرخ سیر نے اس فوج کے ساتھ جہاندار شاہ کے خلاف جنگ کا عزم کیا جو ''از کمیابی طلب بہ نانِ خشک و ساگ گزران می کردند'' ۔ اور ایسی بے سروسامان فوج کی فتح کی وجہ ساداتِ بارہہ کی ''پُردلی و مردانگی'' تھی۔ حسین علی کو وزارت' بخشی کا عہدہ اور سپہ سالاری کا منصب ملا۔ وہ امیر الامرا بنے اور امام الملک کا خطاب حاصل ہوا۔ سید عبداللہ (حسن علی) وزیر اعظم بنے اور قطب الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

فرخ سیر کے عہد میں درباری سازشوں کا جال بچھ گیا۔ ایرانی تورانی اختلافات اُبھرے۔ اسی دور میں روہیلے ایک طاقت بننے لگے۔ معاشی حالات کا اندازہ جعفر زٹلی سے منسوب سکہ سے کیا جا سکتا ہے

---

[۱۰] رائے چترمن۔ چہار گلشنِ محمد شاہی صفحہ ۴۴' ۴۵۔ مخطوطہ لوہارو۔

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر
بادشاہِ دانہ کش فرخ سیر

سکھوں نے دوبارہ سر اٹھایا مگر عبد الصمد خاں صوبہ دار لاہور نے اس فتنہ کو پھر کچل دیا۔ اسی زمانے میں جاٹوں نے دہلی اور آگرہ کے درمیانی علاقہ کو اپنی مہم جوئی کی جولان گاہ بنایا۔ ان واقعات کی اہمیت اپنی جگہ ہے' مگر فرخ سیر کے عہد کے دو واقعات نے برعظیم کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ ایک تو سید برادران سے کشمکش اور دوسرے ڈاکٹر ہملٹن کی آمد۔ ڈاکٹر ولیم ہملٹن اُس برطانوی وفد کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا جو صوبہ دار بنگالہ مرشد قلی خاں کی شکایت کے لیے دلی گیا تھا۔ ڈاکٹر ہملٹن کے علاج سے فرخ سیر کو شفا ہوئی اور اُس کے بدلے انگریزوں کو نئی مراعات دی گئیں۔ وہ مراعات جو کمپنی بہادر کے اقتدار کے محل کی بنیاد بن گئیں۔

فرخ سیر یہ سمجھتا تھا کہ اُس نے سید برادران کو اعلیٰ عہدے دے کر ان کی وفاداری اور اپنی تخت نشینی کی قیمت چکا دی۔ دوسری طرف دونوں بھائی بادشاہ سے اپنی من مانی کرانا چاہتے تھے۔ عہدہ داروں کے تقرر میں سید برادران نے حد درجہ جانبداری سے کام لینا شروع کیا۔ خافی خاں کے الفاظ میں:

> ''در کُل امورِ ملکی و مالی کہ از سوائے مردمِ بارہہ و قومِ بقال را نوازش نمی نمودند (وکبیر و صغیر ہر قوم) متنفر بودند شرفائے ہر دیار بخواری و بے اعتباری زیست می نمودند''۔[۱۱]

سیدوں کی اس روش نے فرخ سیر میں شدید ردِ عمل پیدا کیا' اور تورانی امیر بھی اس رسہ کشی میں فرخ سیر کے ساتھ ہو گئے۔ اس گروہ کا قائد میر جملہ تھا۔ سارے ہنگاموں کے بعد مفاہمت و مصالحت کی یہ صورت نکلی کہ ایک طرف دربار شاہی میر جملہ اور تورانی عناصر سے پاک کیا گیا اور دوسری طرف سید حسین شش صوبہ دکن کی صوبہ داری پر چلا گیا۔ سید حسین نے دکن میں مرہٹوں کو اتنی مراعات عطا کیں کہ وہ اس بحرانی

---

[۱۱] خافی خاں۔ منتخب اللباب۔ فولیو ۱۳۰۔

دور کی فیصلہ کُن طاقت بن گئے۔ قطب الملک دلی میں بیٹھا ہوا اپنے بھائی کو بھڑکا تا رہا' آخر امیر الامرا سید حسین اپنے لشکر اور مرہٹوں کی فوج کے ساتھ دہلی پہنچا۔ ۱۷۱۹ء (م ۱۱۳۱ھ) میں شاہی محل پر سادات کا قبضہ ہو گیا۔ فرخ سیر کو گھسیٹ کر دیوان خاص میں لایا گیا۔ قطب الملک کے حکم سے اپریل ۱۷۱۹ء میں اُسے اندھا کیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اُس کی مظلومیت کا رعایا پر یہ اثر پڑا کہ ''جب جنازہ نماز کے لیے اکبر آبادی مسجد میں لایا گیا تو کم سے کم پندرہ بیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اور تمام لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔[۱۲] مرزا بیدل نے اس واقعہ پر اپنے اور عوامی ردِعمل کو ایک مصری میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ؎

سادات بوئے نمک حرامی کردند

فرخ سیر کے قتل کے بعد سادات نے رفیع الدرجات پسر سوئم رفیع القدر بن بہادر شاہ اول کو تخت نشین کیا۔ اُس نے تین ماہ اور چودہ دن حکومت کی اور دق میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ فرخ سیر کا سُسر' راجہ اجیت سنگھ بھی سیدوں کے ساتھ شریک تھا۔ یہ جودھ پور کا والی تھا اور اس نے شکست کھا کر مجبوراً اپنی بیٹی فرخ سیر کو دی تھی۔ اجیت سنگھ کے علاوہ دیوان رتن چند بھی سیدوں کا دست و بازو تھا۔ ان دونوں کے اثرات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ رفیع الدرجات کی ساڑھے تین ماہ کی بادشاہت کے پہلے دن جو فرمان جاری کیے گئے اُن میں ''تنسیخ جزیہ'' کا فرمان بھی شامل تھا۔

رفیع الدرجات کے بعد اُس کا بڑا بھائی رفیع الدولہ پسرِ ثانی رفیع القدر مئی ۱۷۱۹ء میں تخت پر بٹھایا گیا۔ اُس نے شاہ جہانِ ثانی کا لقب اختیار کیا' مگر جلد ہی وہ بھی مر گیا۔ یوں روشن اختر کی باری آئی۔ روشن اختر عرف محمد شاہ خلفِ دوم جہاں شاہ بن بہادر شاہ' اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۷۱۹ء (ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ) میں تخت پر بیٹھا۔ ''محمد شاہ رنگیلا'' کے کردار کا یک رُخا پہلو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جادو ناتھ سرکار نے زوالِ سلطنتِ مغلیہ کی پہلی جلد میں اُس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک متوازن تصویر

---

۱۲ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ جرأت۔ اُن کا عہد اور عشقیہ شاعری۔ ص ۳۶ اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۲ء۔

ہے۔ جادو ناتھ سرکار کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ تخت نشینی سے پہلے سات سال تک محمد شاہ حرم سرا میں قید رہا تھا اور اُسے کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی، لیکن اُس میں فطری ذہانت اور بصیرت تھی جو اپنے بزرگوں کا حشر دیکھ کر دب گئی تھی۔ جنسی بے اعتدالیوں نے چالیس سال کی عمر سے پہلے ہی اُسے حواس باختہ بنا دیا تھا اور جوانی کے جذبات کے دم توڑتے ہی محمد شاہ پر ایک اُداسی چھا گئی اور وہ فقیروں کی صحبت میں بیٹھنے لگا (شاہ مبارک' شاہ رمز وغیرہ)۔ تمام برائیوں کے باوجود اُس میں ظلم کا مادہ نہ تھا۔ نادر شاہ کے ظلم سے اپنی رعایا کو بچانے کے لیے اُس نے خود قیدی بننا پسند کیا اور کبھی کوئی ظالمانہ حکم جاری نہیں کیا۔[۱۳]

محمد شاہ کے دور کے تمدنی پہلو کا تجزیہ ہم اگلے باب میں پیش کریں گے۔ سیاسی طور پر یہ عہد بڑا ہنگامہ خیز اور بحرانی تھا۔ ساداتِ بارہہ کے خاتمہ اور نادر شاہ کے حملہ کو اہم تر واقعات کی حیثیت حاصل ہے مگر دربارِ شاہی کے امراء کی سیاست کی پیچیدگیاں کچھ کم اہم نہیں۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ پرانے مغل امیر' سیدوں کی بالا دستی کے خلاف متحد ہونے لگے۔ انہیں امیروں کو پہلے شیعہ مؤرخوں نے اور پھر دوسرے مؤرخوں نے بھی ''تورانی'' کہنا شروع کر دیا۔

دکن میں مالوہ کے صوبہ دار نظام الملک نے ساداتِ بارہہ کے خلاف بساطِ سیاست اُلٹ دی۔ اسیر گڑھ اور بُرہان پور کے قلعوں پر نظام الملک نے قبضہ کر لیا۔ بالا پور کی جنگ میں عالم علی مارا گیا جو حسین علی کا نائب تھا۔ سیدوں کے سپہ سالار بخشی صفدر علی کا بھی یہی انجام ہوا۔ جب دکن میں یہ کچھ ہو رہا تھا تو دونوں بھائی امیر الامراء اور قطب الملک آگرہ میں نئے بادشاہ کے ساتھ تھے۔ امیر الامراء نے قطب الملک کو دہلی بھیج دیا اور خود بادشاہ و لشکرِ شاہی کے ساتھ دکن کی طرف بڑھا۔ چند منزلوں کے سفر کے بعد ایک مغل امیر زادے نے اُسے ۱۷۲۰ء (م ذوالحجہ ۱۱۳۲ھ) میں قتل کر دیا۔

محمد شاہ نے انتظام مغل سرداروں کے حوالہ کیا اور لشکرِ شاہی نے دلی کی طرف رخ

---

[۱۳] جادو ناتھ سرکار کی اس رائے کی بنیاد اور ماخذ غالباً ''چہار گلشن محمد شاہی'' کی یہ عبارت ہے کہ ''بادشاہ بود با حلم وصحبت مجلس با فقرا داشت۔ دل او ہرگز بہ ایذائے کس نہ بود

کیا۔ قطب الملک سید عبداللہ ان حالات میں بھی ہمت نہ ہارا' اور اس نے بہادر شاہ اول کے ایک پوتے ظہیر الدین کو تخت پر بٹھا دیا۔ حسن پور کے قریب سخت جنگ ہوئی جس میں سید عبداللہ کا خواب بادشاہ گری شیشے کی طرح ٹوٹ گیا۔ محمد شاہ نے اس کی اور ظہیر الدین کی جاں بخشی کا حکم دے کر انسان دوستی کی اچھی نظیر قائم کی۔

سیدوں کے زوال کے بعد محمد شاہ کی ''آزاد'' بادشاہت کا دور شروع ہوا' اور اعتماد الدولہ اول محمد امین کو وزیر مقرر کیا گیا۔ اس کا دورِ وزارت نومبر ۱۷۲۰ء سے ۱۶ جنوری ۱۷۲۱ء تک ہے۔ اعتماد الدولہ اول کے بعد نظام الملک وزیر ہوا' مگر نظام الملک وقت گزاری کرنے والوں یا عہدہ سے چمٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔ جب وہ حالات کو نہ بدل سکا تو اس نے بددل ہو کر ۱۷۲۴ء میں استعفا دے دیا۔ سید ہاشمی فرید آبادی کے الفاظ میں جب نظام الملک نے ''دربار شاہی کو قدیم آئین پر مہذب و مرتب کرنے کی کوشش کی تو لاابالی بادشاہ کو اُس کی ثقاہت سے وحشت ہونے لگی۔[۱۴]

نظام الملک کے بعد محمد امین کا بیٹا قمر الدین خاں اعتماد الدولہ دوم وزیر ہوا۔ یہ رند مشرب اور غیر ضرر رساں آدمی تھا جو حالات کو سمجھنے کے باوجود بادشاہ کو حقیقی صورت حال سے آگاہ نہ کرتا تھا۔ اُس نے ۱۷۲۴ء سے ۱۷۴۸ء تک محض اپنی وزارت کو برقرار رکھا صورتِ حال کا اندازہ مراۃ الواردات کے اس حوالہ سے ہوسکتا ہے جسے جادو ناتھ سرکار نے زوالِ سلطنت مغلیہ کی جلد اول میں پیش کیا ہے کہ جب بادشاہ کو دکن' گجرات یا مالوہ میں مرہٹوں کے کسی نئے حملے کی خبر ملتی تو وہ غم بھلانے کے لیے سیرِ گلستاں کرتا۔

شاہ عالم بہادر شاہ کی بیوہ ملکہ مہر پرور کے انتقال کے بعد محل سرا کا انتظام محمد شاہ کی رضاعی بہن رحیم النساء کے ہاتھوں میں آ گیا۔ شاہی محلات عیاشی کے اڈے بن گئے۔ محمد شاہ زنان خانے میں اپنا وقت گزارنے لگا۔ وہ کسی مسئلہ پر غور نہ کرتا اور سید

۱۴۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت۔ جلد دوم صفحہ ۲۶ اور ۲۷۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۵۳ء۔

ویسے تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت میں نظام الملک کی واپسی کی تاریخ ۱۷۲۲ء درج ہے' یہ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ صحیح سنہ ۱۷۲۴ء ہے۔

برادران کے چنگل سے نکل کر کوکی جی (رحیم النساء) روشن الدولہ اور شاہ عبدالغفور کے دامِ اعتماد کا اسیر ہو گیا۔ عبد الغفور کے کردار کو جرأت' ان کا عہد اور عشقیہ شاعری میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ ان حالات میں جاٹ اور روہیلے اُبھرے۔ شہری انتظام درہم برہم ہو گیا' سرکاری عہدے دار ڈاکوؤں اور چوروں کے رفیق اور ساتھی ہوتے تھے۔ خان محمد ایسا ہی ڈاکو تھا۔ محمد شاہی دور میں جوتے والوں کا فساد ہوا۔ سبھ کرن جوہری اس ہندو مسلم فساد کا باعث تھا۔ سودا کے مشہور شہر آشوب اور پھر نظیر آبادی کے کلام میں اس عہد کے خدوخال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مرقعِ دہلی اس دور کا تمدنی مرقع ہے۔

کوکی جی' روشن الدولہ اور شاہ عبدالغفور ۱۷۲۳ء میں موردِ عتاب بنے اور رحیم النساء شاہی محل سے نکال دی گئی۔ ان کے بعد شمس الدولہ خانِ دوراں اور اُس کے بھائی مظفر خاں کے اثر کا دور شروع ہوا۔ جب یہ دونوں بھائی ۱۷۳۹ء میں مر گئے تو امیر خاں' محمد اسحاق' اسد یار اور صفدر جنگ بادشاہ کے ذہن اور زندگی پر چھا گئے۔ امیر خاں' میر میراں' امیر خاں اول کا بیٹا تھا جو عہدِ عالم گیری میں کابل کا گورنر رہا تھا۔ ابوالمنصو ر صفدر جنگ' برہان الملک سعادت خاں کا داماد تھا اور ۱۷۳۹ء میں اودھ کا صوبہ دار بنا۔ نظام کی فوج کے بعد اُس کا لشکر سب سے زیادہ منظم تھا جس میں چھ سات ہزار وہ قزلباش تھے جو نادر شاہ کے ساتھ آئے تھے اور واپس نہیں گئے۔

عہدِ محمد شاہ کا سب سے بڑا سیاسی سانحہ نادر شاہی حملہ ہے۔ نادر شاہی حملہ کے مقابلے کے لیے نظام الملک کو دکن سے بلایا گیا اور اسی کے مشورہ سے محمد شاہ ۱۷۳۸ء کے مئی جون میں مقابلہ کے لیے باہر نکلا۔ برہان الملک سعادت خاں بھی شاہی لشکر کے ہمراہ ہو لیا اور بعد میں نادر شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ برہان الملک کی گرفتاری بھی ایک نزاعی مسئلہ ہے جس کے تجزیہ کی کوشش اگلے باب میں کی جائے گی۔ نظام الملک کی کوشش سے نادر شاہ نے صلح نامہ کی تکمیل کی' لیکن پھر نادر شاہ نے نظام الملک اور محمد شاہ کو گرفتار کر لیا۔ سعادت خاں نے دہلی کی طرف اس کی رہنمائی کی اور ۱۷۳۹ء میں نادر

شاہ نے دہلی کے سہاگ کو لوٹ لیا۔ چند قزلباشوں کے قتل سے اسے اس غارت گری کا حیلہ مل گیا۔ سنہری مسجد میں اس نے تلوار نیام سے نکالی تو کوئی تیس ہزار آدمی اس اشارۂ قتلِ عام کا شکار ہو گئے۔

نادر شاہ کے حملہ اور اس قتل و غارت کے بعد بھی محمد شاہ اور اس کے عمائد نے ماضی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ دلی میں پھر وہی رقص و سرور کی محفلیں تھیں اور وہی بادۂ ناب کے دور تھے۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد سلطنت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ سندھ پار اور کشمیر کے علاقے مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ سندھ کے قبائل باہمی زور آزمائی میں مصروف ہو گئے۔ نادر شاہ کے حملہ کے اگلے ہی سال سرہند پر سکھوں اور جاٹوں نے حملہ کیا۔ آگرہ کے نواح میں جاٹوں کی تنظیم اتنی مضبوط ہو گئی کہ یہ علاقہ ان کا گڑھ بن گیا۔ پیشوا اور مرہٹے بھی اپنی طاقت بڑھا رہے تھے۔ گجرات اور مالوہ پر ان کا تصرف تھا۔ نادر شاہ کے جانے کے بعد انہوں نے بادشاہِ دہلی سے اپنی وفاداری کی تجدید کی اور خراج ادا کیا۔ یہ بھی ایک سیاسی منصوبہ تھا۔ بعد میں مرہٹے اسی راستے سے حکومت میں دخیل ہوئے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اپریل ۱۷۴۲ء سے ناگپور کے مرہٹوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر مسلسل سالانہ حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ حملے نو سال کے بعد ختم ہوئے اور یوں کہ اوڑیسہ سلطنتِ مغلیہ سے نکل گیا۔ دوآبہ میں علی محمد روہیلہ اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ کمایوں کے علاقے تک اس کا قبضہ تھا، اور وہ شاہی علاقے پر حملہ کر کے مغلوں کی طاقت کے کھوکھلے پن کو بار بار بے نقاب کر رہا تھا۔ ۱۷۴۵ء میں صفدر جنگ کے مشورہ سے علی محمد روہیلے پر فوج کشی کی گئی۔ ادھر محمد شاہ کے پاس کوئی فوج نہ تھی جو امن قائم کر سکتی۔ کرنال کے میدان جنگ اور دہلی کے قتلِ عام میں اس عسکری طاقت نے دم توڑ دیا تھا۔ یوں نادر شاہ کے جانے کے بعد محمد شاہ کو تخت تو مل گیا لیکن اس کی بے بسی کی کوئی نہایت نہیں تھی۔

ان حالات میں اسد یار خاں نے ایک مستقل فوج کی اہمیت محمد شاہ پر واضح کی اور دس ہزار کا لشکر تیار کیا۔ ہر سپاہی کے گھوڑے پر تلوار کا نشان داغا گیا اور اس فوج کا

نام ''شمشیر داغ رسالہ'' پڑ گیا۔ یہ لشکر ۱۷۴۰ء میں ترتیب دیا گیا۔ اسد یار خاں کو امیر خاں نے جون ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ کے حضور پیش کیا تھا۔ اسد یار خاں متوازن شخصیت کا مالک' عاقل' فیاض اور شرفاء کا قدر دان تھا۔ امیر خاں سے تعلقات بگڑنے کے بعد بھی اس کے احسانات نہ بھولا۔ اسد یار خاں ایسے بگڑے ہوئے معاشرے اور دور میں روشنی کی ایک کرن کا درجہ رکھتا ہے۔ جب امیر خاں کے بھڑکانے سے محمد شاہ نے ۱۷۴۴ء میں ''شمشیر داغ رسالہ'' کی تنخواہ ساڑھے بائیس لاکھ روپے نہیں دی تو اسد یار خاں نے باغی سپاہیوں کا غصہ اپنے ذاتی اثر سے ٹھنڈا کیا اور اپنا ذاتی سامان اور جواہرات بیچ کر یہ رقم ادا کی۔ ۱۵ اپریل ۱۷۴۵ء کو اس کی موت کے ساتھ ہی یہ مصیبتیں ختم ہو گئیں۔

محمد شاہی دربار سازشوں اور شیعہ سُنی قضیہ کا مرکز تھا۔ امیر خاں بقول جادو ناتھ سرکار سازشوں کا مرکزی کردار تھا۔ دہلی سے نظام الملک کے نکلتے ہی قمر الدین خاں کی جگہ امیر خاں کو وزیر بنایا گیا۔ جب قمر الدین خاں نے نظام الملک سے مشورہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ ''اس غیر ضروری ذمہ داری' بے کار بادشاہ اور خالی خزانے کو چھوڑ کر میرے ساتھ دکن چلو''۔

محمد شاہ کی تمام کمزوریاں مسلّم' مگر یہ بھی بڑی حد تک درست ہے کہ ''درعہد او خلق بہ آسائش زندگی نمود''۔[۱۵] تمام ہنگاموں' حملۂ نادری اور فتنوں کے باوجود صاحبِ سیر المتاخرین کے اس بیان کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود بادشاہ میں مردم آزاری نہیں تھی۔ ملک کا امن اسے عزیز تھا۔ اُس نے اپنے مرض الموت میں بھی اپنے ولی عہد اور وزیر قمر الدین کو احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ سرہند کی جنگ میں ۱۷۴۸ء (م ۱۱۶۱ھ) میں ابدالی کو شکست ہوئی لیکن قمر الدین اس معرکہ میں کام آیا اور اس کی جگہ سعادت خاں کا داماد اور بھانجا صفدر جنگ سر لشکر اور وزیر نامزد ہوا۔

محمد شاہ نے ۱۷۴۸ء میں انتقال کیا۔ صاحبِ چہار گلشن محمد شاہی کے حساب کے مطابق اس نے ترپن سال کی عمر پائی اور زمانہ حکومت تیس سال اور ایک ماہ ہے۔

۱۵ے سیر المتاخرین' بحوالہ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت۔ جلد دوم صفحہ ۴۰۔

احمد شاہ بن محمد شاہ باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ اُس کی کیفیت یہ تھی کہ ہفتوں حرم سرا سے باہر نہ نکلتا تھا۔ زندگی کی تمام اخلاقی اقدار اور مغلوں کے قائم کردہ طرزِ حیات پر نزع کا عالم طاری تھا۔ محل سرا پر اودھم بائی کا قبضہ تھا اور باہر جاوید خواجہ سرا کا حکم چلتا تھا۔ دربار کے عمائد کے اختلافات اپنی جگہ سہی مگر یہ "صاحبانِ سیف و تدبیر" ایک خواجہ سرا کی سیادت کیسے قبول کر لیتے۔ آخر صفدر جنگ نے جاوید خواجہ سرا کو قتل کرا دیا اور خود بھی اُسے دہلی سے مجبوراً اودھ جانا پڑا' وہ بھی بڑی تلخیوں کے ساتھ۔ نظام الملک کا بیٹا نواب شہاب الدین دہلی میں اپنے والد کا نائب تھا۔ والد کے انتقال پر وہ بھی دکن چلا گیا اور اپنے کم عمر بیٹے کو دہلی میں اپنا نائب بنا گیا۔

احمد شاہ کا عہدِ حکومت ۱۷۵۴ء (م ۱۱۶۷ھ) تک ہے۔ کم و بیش پانچ سال کی اس مدت میں مغل بادشاہت کا اقتدار اور وقار ختم ہو گیا۔ شمالی ہند میں ہر طرف انتشار پھیل گیا۔

صفدر جنگ نے مرہٹوں کو روہیلوں کے خلاف لڑنے کے لیے اپنی امداد کے واسطے بلوایا اور یوں مرہٹوں کے ذہن میں ملک گیری کا جو خیال تھا اُسے واقعات تقویت پہنچاتے رہے۔ دوسری طرف عماد الملک (شہاب الدین کے بیٹے) نے روہیلوں کی مدد کی اور مرہٹوں کو بھی صفدر جنگ سے توڑ لیا۔ اُس نے جاٹوں سے بھی مال گزاری وصول کر لی' اگرچہ اس کے بدلے جاٹوں میں سے کسی کو رئیس بنایا اور کسی کو راجہ کا خطاب دیا۔ ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ اور اس کی ماں اودھم بائی کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اندھا کر دیا گیا اور احمد شاہ کو قتل کر کے ایک دوسرے شہزادے کو اُس تخت پر بٹھا دیا گیا جو اب کٹھ پتلی کے تماشا کا اسٹیج بن گیا تھا۔[۱۶]

---

[۱۶] اس واقعہ کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ سیر المتاخرین اور جام جہاں نما میں لکھا ہے کہ اسے ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ (۲ جون ۱۷۵۴ء) کو قید کیا اور ایک ہفتہ کے بعد نابینا کیا گیا تھا۔ تنقیح الاخبار (رائے منو لال فلسفی بریلوی) میں منگل کے دن ۱۰ شعبان کو قید اور اندھا کرنے کی صراحت ہے۔ مفتاح التواریخ (تھامس ولیم) میں آخر جمادی الآخر میں اسیری اور ۱۰ شعبان کو آنکھیں پھوڑنا لکھا ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی نے مذکورہ بیانات کو پیش کرنے کے بعد سیر المتاخرین کے بیان کو زیادہ ←

چہار گلشنِ محمد شاہی میں دوسری ہم عصر کتب تواریخ کی طرح لفاظی کم ہے اور واقعاتی پہلو نمایاں اور صاف ہے۔ احمد شاہ کے عہد حکومت کو چڑمن رائے نے یوں پیش کیا:

"در جمادی الاول ۱۱۶۲ھ جلوس فرمودند وامرائے داعیان...... نذرِ جشن گزرانیدہ بانعامات و اضافہ امتیاز یافتند و زمام حل وعقدِ تمام سلطنت بہ جاوید خاں خواجہ سرا کہ مقربِ آں حضرت بود سپردہ خود (را) درعیش وطرب ولہو ولعب مشغول کردند۔ ایں معنی بر جمیع امراو ارکانِ سلطنت گراں آمد۔ خصوص بر صفدر جنگ ابو المنصور خاں کہ وزیر صاحب تدبیر بود سخت ناگوار شد۔ شدہ شدہ آزردگی برملا گردید و جاوید خاں بدغا درخانۂ صفدر جنگ کشتہ شد۔ ایں حرکت بر مزاج بادشاہ وہم اودھم بائی والدۂ ایشاں کہ گویا نائب السلطنت بود' بسیار گراں آمد...... آخر الامر بہ صفدر جنگ پیغام دادند کہ نیابت وزارت بر کسے مقرر کردہ خود صوبہ داری خود بروند"۔ [۱۷]

یہ روایت درست نہیں کہ صفدر جنگ' جاوید خواجہ سرا کو قتل کرا کے خود دہلی سے اپنی مرضی سے اودھ چلا گیا تھا۔ بادشاہ کا حکم اسے ناگوار گزرا۔ اس نے سورج مل جاٹ اور دوسرے زمین داروں کو اپنا رفیق بنا کر جنگ کی۔ ایک ماہ تک شہر کا محاصرہ کیے رہا' بادشاہی فوجیں ہر طرف موجود تھیں اور جنگ کرتی رہیں۔ تقدیر' صفدر جنگ کی تدبیر کے ساتھ نہ تھی' آخر اسے اپنے صوبہ جانا پڑا۔ [۱۸]

۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کے دور کے خاتمہ کے علاوہ دو اور اہم واقعات ہوئے۔ ایک تو معین الدین والئی پنجاب کا انتقال ہو گیا' دوسرے صفدر جنگ بھی دُنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کی جگہ شجاع الدولہ اودھ کی گدی پر بیٹھا۔ یوں عملی طور پر پنجاب'

← قرین صحت قرار دیا ہے۔

(امتیاز علی خاں عرشی۔ وقائع عالم شاہی درباب تشریحات' صفحہ ۱۴۶۔ سلسلۂ مطبوعات کتاب خانہ رام پور ہندوستان پریس رام پور ۱۹۴۹ء)۔

۱۷۔ چڑمن رائے۔ چہار گلشنِ محمد شاہی۔ مخطوطۂ لوہارو

۱۸۔ چڑمن رائے' چہار گلشنِ محمد شاہی' مخطولۂ لوہارو۔

اودھ اور مشرقی صوبے مرکز سے الگ ہو گئے۔

شہزادہ عزیز الدین بن معز الدین جہاندار شاہ جون ۱۷۵۴ء (م شعبان ۱۱۶۷ ھ) میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے "عالمگیر ثانی" کا لقب اختیار کیا۔ ایک طرف عالم گیر اول (اورنگ زیب) کے خوف سے مرہٹے دکن کے پہاڑوں میں چھپتے پھرتے تھے اور دوسری طرف عالمگیر ثانی کے عہد میں آگرہ کے محل، جاٹوں کی رہائش گاہ بنے، بلکہ ان میں جاٹوں کے جانور باندھے جاتے تھے۔ ان حالات میں احمد شاہ ابدالی نے اس کی حکومت کے چوتھے سال میں ہندوستان پر حملہ کر دیا۔

"درا واخر سنہ چہار جلوس، احمد شاہ ابدالی با فوج بسیار از کابل رسید۔ وزیر الملک سبب مخالفت نوکران خود مصلحتِ وقت چناں دانستہ کہ برائے ملاقات پیشتر روند۔ او خلافِ قول وعہد کردہ ایشاں راہمہ جا، نگاہ داشت وفوجِ خود فرستاد کہ گرد شہر دہلی...... محاصرہ نمایند واو دو ماہ وچند روز در دہلی و اکبر آباد ماندہ وتاخت وتاراج نمودہ باز باہ کابل رفت۔ [۱۹]

عالم گیر ثانی نے چہار گلشن کے بیان کے مطابق پانچ سال نو مہینے حکومت کی اور ۱۷۶۰ء (م ۱۱۷۳ھ) میں مارا گیا۔ [۲۰]

اس عہد کا سب سے اہم واقعہ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہے جس نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں "مرہٹوں کی شہنشاہیت" کے منصوبے کو ختم کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرہٹے دس سال کے عرصہ میں پھر ایک طاقت بن گئے، مگر دس سال بعد وہ برعظیم پر واحد مرہٹہ حکومت کا خواب دیکھنا بھول چکے تھے۔ ابدالی کے حملہ سے غازی الدین کا

---

۱۹ حوالہ بالا

۲۰ بعض تاریخوں میں قتل کا سال ۱۱۷۴ھ لکھا ہے۔ مثلاً لب السیر مصنفہ ابو طالب بن محمد تبریزی۔ ہمارے دور میں سید ہاشمی فرید آبادی نے بھی تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت میں ۱۱۷۴ھ لکھا ہے۔ سید غلام علی خاں نقوی نے عمادۃ السعادہ (مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۷ھ) میں ۱۱۷۲ھ لکھا ہے لیکن صحیح سال قتل ۱۱۷۳ھ ہی ہے اور اسی کو تمام معتبر تاریخوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ (امتیاز علی خاں عرشی۔ دیباچہ وقائع عالم شاہی۔ صفحہ ۱۴۸)۔

اقتدار بھی ختم ہو گیا۔

پانی پت کی تیسری لڑائی کے وقت مرہٹہ قوت اپنے عروج پر تھی۔ ۱۷۶۰ء میں نظام کو بیجا پور اور دولت آباد کے ضلعے مرہٹوں کے حوالے کرنے پڑے تھے۔ پیشوا شمالی ہند میں مرہٹوں کی شکست سے بے تاب ہو کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ جنوبی راجپوتانے کو غارت کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ پیشوا کا بیٹا وسواس راؤ سپہ سالار اور سدا شیو راؤ (پیشوا کا چچا) لشکر کا حقیقی منتظم تھا۔ ابدالی دہلی سے اپنی فوج ہٹا کر کرنال میں اپنی دوسری جنگی چوکی سے جا ملا۔ دہلی پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ آخر پانی پت کے میدان میں فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ تاریخی روایتوں اور شہادتوں کی بنا پر اس جنگ میں کوئی دو لاکھ مرہٹہ سپاہی اور ان کے حلیف مارے گئے۔ یہ جنگ جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ (۱۷۷۰ء) میں لڑی گئی۔ اگر مقتولین کی تعداد میں مبالغہ مان لیا جائے تو بھی اس پر سب متفق ہیں کہ مرہٹوں کا زبردست جانی نقصان ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کو برعظیم میں اپنی حکومت کے قیام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس نے کشمیر، سندھ اور پنجاب کا الحاق اپنی سلطنت سے کیا اور تختِ دہلی کو مقتول بادشاہ کے بیٹے شہزادہ عالی گہر کے حوالے کر گیا جو اس وقت بہار میں تھا۔ عالی گہر، شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔

شاہ عالم ثانی کا عہد کئی لحاظ سے تاریخ ہند میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اگرچہ میر تقی میر نے بجا طور پر اُس کی بادشاہی کو ''تہمت'' قرار دیا ہے۔ اس تہمت کی وجہ اس کے دور میں کمپنی کی بالا دستی اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر کمپنی کا قبضہ ہے۔ ۱۷۵۸ء سے شاہ عالم سندھیا کے ہاتھوں کا کھلونا تھا جسے جنرل لیک نے ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے چھین لیا۔

شاہ عالم کی تخت نشینی ۱۱۷۳ء میں کھٹولی کے پڑاؤ پر ہوئی۔ مدتوں اُسے دلی میں داخلہ نصیب نہ ہو۔ بہار سے وہ الہ آباد چلا گیا۔ لیکن تنظیم سلطنت کی جگہ روپیہ عیاشی میں صرف کرتا رہا۔ شجاع الدولہ نے بہار پر حملہ کیا تو نشان کے طور پر اُسے بھی ساتھ لے لیا، لیکن ۱۷۶۴ء میں بکسر کی تاریخی جنگ میں اُسے فیصلہ کن شکست ہوئی۔ کچھ

عرصہ کے بعد ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم نے بنگال کی دیوانی کمپنی کے نام لکھ دی۔ پھر شاہ عالم کے نام سے مرہٹوں نے اپنا کام نکالنا شروع کیا اور سندھیا کی تحریک پر اس نے دہلی کی طرف قدم بڑھایا۔ نجف خاں اس کے ساتھ تھا۔ اس نے مرہٹوں کی مدد سے روہیلوں اور جاٹوں کو شکست دی۔

شاہ عالم پر مرہٹے مسلط رہے۔ ان سے ذرا نجات ملی تھی کہ روہیلوں نے اپنا اسیر بنا لیا۔ نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر نے ۱۷۸۸ء (م ۱۲۰۲ھ) میں اس کی آنکھیں نکلوا لیں۔ سندھیا نے دہلی آ کر غلام قادر کو قتل کرا دیا۔ شاہ عالم نے سندھیا کو ''فرزند دلبند'' کا خطاب دیا۔ انگریزوں نے علی گڑھ میں مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد دہلی پر ستمبر ۱۸۰۳ء میں قبضہ کر لیا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک شاہ عالم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تین دن کے بعد جنرل لیک کو خلعت دی گئی اور صمصام الدولہ، اشجع الملک خان دوراں بہادر، سپہ سالار فتح جنگ کے خطابات دیئے گئے۔[۲۱] یوں شاہ عالم نے مرہٹوں کی جگہ انگریزوں کو دے دی اور سندھیا کی جگہ گورنر جنرل کو ''فرزندِ سعادتِ مند'' بنا لیا۔

اس نئے ''رشتہ'' کے قیام کے بعد کمپنی اور شاہ عالم ثانی کے تعلق کی نوعیت کے تعین کا اہم مسئلہ سامنے ایا۔ ولزلی نے بڑی چالاکی سے کام لیا، لیکن اس ''کاغذی جنگ'' میں اول اول شاہ عالم کو فتح حاصل ہوئی۔ جنرل لیک نے ''ملک معظم'' کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

"I Consider it to be a distinguished honour to execute Your Majesty's commands."[۲۲]

یوں مغل خود مختاری اور اقتدارِ اعلیٰ کو شاہ عالم کے عہد تک کمپنی نے کاغذی طور پر ہمیشہ تسلیم کیا۔ شاہ عالم ثانی اس واقعہ کے بعد تقریباً تین سال اور زندہ رہا اور ۱۸۰۶ء میں انتقال کیا۔

شاہ عالم ثانی کے عہد کا عمومی جائزہ (بعض مقامات پر تسلسل کی قید کے بغیر) اوپر

---

۲۱ سلطان احمد۔ آئینہ دہلی (مخطوطہ) ذاتی کتب خانہ مصنف۔

۲۲ ٹو الائٹ آف دی مغل بحوالہ تاریخ آزادی، پاکستان تاریخ سوسائٹی۔

کی سطروں میں پیش کیا گیا۔ لیکن اس عہد تک مغل شہنشاہ کی توقیر کتنی گھٹ گئی تھی اور حقیقی صورت حال کیا تھی' اس کا ایک نہایت مستند آنکھوں دیکھا حال وقائع عالم شاہی کی صورت میں موجود ہے۔ یہ "حال" ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جسے شاہ عالم سے ہمدردی ہے۔ وقائع عالم شاہی' کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ ہے جسے اُس نے شاہی لشکر میں قیام کے دوران مرتب کیا تھا۔ شاہی لشکر میں اس کا داخلہ اس زمانے میں ہوا جب افراسیاب خاں کی درخواست پر شاہ عالم آگرہ کے لیے روانہ ہو کر تلپت میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسی دوران شاہ عالم کے عہد کا وہ اہم واقعہ پیش آیا جس کو "شمالی ہند میں مرہٹہ گردی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے' یعنی افراسیاب خاں کا مارا جانا اور اس کی جگہ مہاجی سندھیا پٹیل کا برسرِ اقتدار آنا [۲۳] یہ روزنامچہ ۲۵ نومبر ۱۷۸۴ء (م ۱۲ محرم ۱۱۹۹) سے شروع ہو کر ۱۱ ربیع الاول ۱۱۹۹ھ پر ختم ہو جاتا ہے یعنی اس میں ایک دن کم دو ماہ کے حالات ہیں۔ بظاہر یہ مدت بہت مختصر ہے لیکن انقلابی اور پرفتن و ہنگامہ پرور ادوار میں ایسی مختصر مدت بھی حالات کے رخ کو سمجھنے کے لیے جتنی اہمیت رکھتی ہے اس کا اندازہ وقائع کے تین مختصر اقتباسات سے ہو سکے گا۔ یہ اقتباسات عبرت کے مرقعے ہیں اور ان کے الفاظ کے آئینے میں مغل سلطنت کی جان کنی کا نظارا کیا جا سکتا ہے۔

بھرے دربار میں ایک مرہٹہ سردار نے پٹیل پر چاندی کے روپے نچھاور کیے۔ اُس نے بادشاہ سے اجازت بھی نہ لی' کیونکہ پٹیل' مغل بادشاہ کے دربار میں اس سے زیادہ اہم شخصیت تھا اور پھر ان روپوں کو لوٹنے کے لیے فراش اور خادم' بادشاہ کی پردا کیے بغیر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے۔

"آنند راؤ نرسی چند مشت گلہائے نقرہ برسرِ پٹیل روبروئے بادشاہ عالم نواز بطریق نثار بہ یمین و یسار بینداخت و فراشاں و خادمان و بوابان حضور انور بہ گل چیدن کشادند و طرفہ تماشائے افتادن و استادن دست بغارت کشادن آں جملہٴ طامع کہ صورت عجیب و غریب بود۔" [۲۴]

---

۲۲ ٹوالائٹ آف دی مغل بحوالہ تاریخ تحریک آزادی' پاکستان۔ تاریخ سوسائٹی

۲۳ امتیاز علی خاں عرشی۔ دیباچہ وقائع عالم شاہی۔ صفحہ ۷۔

۲۴ کنور پریم کشور فراقی۔ وقائع عالم شاہی ص ۴۴

مغل بادشاہوں کا دستور تھا کہ اگر کوچ کا نقارہ بجوانے کے بعد کسی وجہ سے سفر ملتوی کر دیتے تھے تو نقارچیوں کو تاوانی انعام کے طور پر سوا سو روپے دیئے جاتے تھے۔ ایک بار پٹیل کے کہنے سے شاہ عالم ثانی نے سفر ملتوی کیا۔ نقارچیوں نے انعام کا مطالبہ کیا تو اپنی ''ہمت والا'' کا ثبوت دینے کے لیے شاہ نے بیس آنے عنایت کیے۔ نقارچیوں نے احتجاج کیا کہ مغل دستور کے خلاف ہے۔ ہمیں سوا سو روپے عنایت ہوں۔ شاہ عالم نے مطالبہ مسترد کر دیا اور جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''آں ورق برگشت و آں دفتر را گاؤ خورد''۔ اور اس ٹکڑے میں خود کتنی عبرت سامانی ہے۔

''موافق معمولِ قدیم بابت مقام (قیام) بعد نواختن کوس رحیل کہ پادشاہانِ اولی العزم صاحب السیف والفیل یک صد وبست و پنج روپیہ رسمِ جریمانہ بہ نقار چیاں انعام می کردند۔ پادشاہ سلطنت بخش یک روپیہ پاؤ بالا بر آنہا مرحمت نمود۔ ہر چند بیچارہ ہا...... غوغا کردند کہ خلافِ دستور سلف بہ عمل نیاید...... نشنودند و در جواب فرمودند ''آں ورق برگشت و آں دفتر را گاؤ خورد...... ایں ہم مقتضیٔ ہمتِ والا نہمت مابدولت است کہ در چنیں اوقات بصدائے طبلی بیست آنہ بخشیدیم''۔[۲۵]

جنسی الجھنوں اور اعتدال سے گزرے ہوئے عیش و عشرت سے شاہ عالم بھی اپنے اسلاف کی طرح دامن نہ بچا سکے۔ بڑھاپے میں ایک ادنیٰ درجہ کی طوائف عزیزن پر ''عاشق'' ہوئے اور اُسے ''ملکہ عالم'' کا خطاب عطا کر دیا۔ یہ ملکہ عالم ناراض ہو کر بادشاہ کو سب کے سامنے ذلیل کرتی اور اسے خوش کرنے کے لیے بوڑھا بادشاہ اس کے بھائیوں کی خوشامد کرتا۔ رات کو اگر جھگڑا ہوتا تو صبح گفتگو نہ کرتی اور بادشاہ سلامت حواس باختہ کبھی اُس کے بھائیوں سے رحم کی درخواست کرتے اور کبھی اس کی کنیزوں سے کہتے کہ ''تم ہی سمجھاؤ''۔

اگر چہ تکلم از طرفین نمی شد بدیداری تسلیٔ خاطر فاتر می نمودند و گہے بیروں

۲۵ کنور پریم کشور فاروقی۔ وقائع عالم شاہی ص ۹۷

خرامیدہ با برادر انش بامید وبیم مخاطب می شدند بہ عملہ وفعلہ اومی فرمودند
کہ باو بفہمانند کہ براہ آید" ۲۶ے

ان تلخ حقائق کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مصاحبین بادشاہ کو بھرے دربار میں منہ توڑ جواب دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جاتی تھی۔ حافظ عبدالرحمٰن نے بادشاہ کو جو دشنام آمیز جواب دیا تھا وہ وقائع کے صفحہ ۱۴۱ پر موجود ہے۔

یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے مغل بادشاہ کا دربار ایک سوانگ بن گیا تھا' ویسے تو معین الدین اکبر شاہ ثانی نے ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اور سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک "حکومت" کی' لیکن اس "حکمرانی" کا خلاصہ یہ ہے کہ "خلقت خدا کی' ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا"۔

۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ آخری پچاس سال کا وہ مرحلہ شروع ہوا جس کا اختتام بہادر شاہ ظفر کی اسیری کی صورت سامنے آیا۔ اس دور میں مغل بادشاہ کا ملک کے انتظام سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ وہ کمپنی کا پنشن خوار تھا اور پنشن کا وقت پر ملنا یا اس میں اضافہ...... یہ تھا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ۔ کبھی کبھی تو نام نہاد بادشاہت کی علامت کا وجود ہی خطرے میں نظر آتا۔ تخت نشینی کا مسئلہ بھی اہمیت رکھتا تھا۔ خوش خیالی اور خود فریبی کے تحت بادشاہ کمپنی کو اپنا انتظامی نمائندہ سمجھتے ہوئے کمپنی کے ارباب اختیار سے اپنے نام نہاد "اقتدار اعلیٰ" کو تسلیم کرانا چاہتا تھا۔ اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے موقع پر گورنر جنرل نے "یور میجسٹی" کو تہنیت کا پیغام بھیجا تھا۔ ریزیڈنٹ سیٹن (Setan) بھی بادشاہ سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا نائب مٹکاف اس ڈھونگ کو ختم کرنے کے سلسلہ میں انتہا پسندانہ رائے رکھتا تھا۔

۱۸۱۳ء سے ۱۸۲۳ء تک ھیسٹنگز کے عہد میں کمپنی کی پالیسی میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ گورنر جنرل کے دورے کے مسئلہ پر اختلافات پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی چاہتا تھا کہ گورنر جنرل رعایا کی طرح نذر پیش کرے مگر وہ آمادہ نہ ہوا۔

۲۶ے حوالۂ بالا صفحہ ۱۱۶

ہیسٹنگز نے انتقاماً نواب وزیر اودھ کو اپنی بادشاہی کے اعلان پر اکسایا اور کمپنی کی طرف سے نذر کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ انتہا یہ کہ ۱۸۲۰ء میں اکبر شاہ ثانی کو شہنشاہ انگلستان کی موت پر تعزیتی خط بھیجنے کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ مارچ ۱۸۲۷ء میں بے بس مغل بادشاہ نے اپنے وکیل افضل بیگ کے ذریعہ گورنر جنرل کو وہ وعدے یاد دلائے جو کمپنی کی حکومت نے جنرل لیک کی معرفت کیے تھے۔ جواب میں اُن وعدوں اور جنرل لیک کے خطوط کو ''اخلاقی تحریریں'' قرار دیا گیا۔ مٹکاف دہلی کا ریزیڈنٹ ہو چکا تھا اور گورنر جنرل ہر بات پر اس سے متفق تھا۔ مجبور ہو کر ''شہنشاہ'' نے دادرسی کے لیے راجہ رام موہن رائے کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا' لیکن یہ سفارت بھی ناکام ہو گئی۔ اکبر شاہ ثانی کو پنشن میں تین لاکھ کے اضافے کی خاطر مجبور ہو کر ۱۸۳۳ء کے بعد ''راضی نامہ'' پر دستخط کرنے پڑے۔ بادشاہ سے شاہی خاندان کی فہرست مانگی گئی اور اس فہرست کو رد کر کے کمپنی نے اپنی فہرست خود مرتب کی۔ کمپنی کی فہرست کو اکبر شاہ ثانی نے قبول نہ کیا اور راضی نامہ کی واپسی کا مطالبہ کیا' مگر اسی اثنا میں ۱۸۳۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس اجمال سے بھی بادشاہ اور کمپنی کی باہمی کشمکش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مغل بادشاہ میں ابھی کچھ حمیت و غیرت باقی تھی۔

۱۸۳۷ء میں ابو المظفر' سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی تخت نشین ہوئے۔ اُن کے دور کا آغاز بھی کشمکش سے ہوا۔ کمپنی اختیارات سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کرتی تھی اور بہادر شاہ پنشن میں اضافے کا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ''یہ درویش'' بادشاہت کی علامت کی توقیر کا قائل بھی تھا۔ لارڈ آک لینڈ نے دہلی میں بادشاہ سے مساویانہ سطح پر ملنا چاہا' یعنی وہ کوئی نذر پیش نہ کرے اور بادشاہ بھی اس سے ملنے کے لیے جائے۔ بہادر شاہ نے انکار کر دیا اور یہ ملاقات نہ ہو سکی۔ لارڈ لن برو نے بعد میں نذر کی رسم کو باضابطہ طور پر ختم کر دیا اور کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔

اگلا قدم ڈلہوزی نے اٹھایا۔ وہ شاہی خاندان کو لال قلعہ سے نکالنا چاہتا تھا' تاکہ

قلعہ کی علامت بھی عوام کے ذہنوں سے ختم ہو جائے۔ وہ اس سلسلہ میں تشدد پر بھی آمادہ تھا' لیکن اس مسئلہ پر انگلستان میں کورٹ آف ڈائریکٹرز اور بورڈ آف کنٹرول میں اختلاف ہو گیا۔ بورڈ' ڈلہوزی کی رائے کے حق میں تھا' لیکن کورٹ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس سے مسلمانوں میں بے چینی پھیلے گی۔ ڈلہوزی اپنی رائے پر جما رہا مگر اس وقت مصلحت کے پیش نظر کوئی قدم نہ اٹھایا۔

۱۸۴۹ء میں ولی عہد دارا بخت کا انتقال ہو گیا۔ ڈلہوزی نے مرزا فخر الدین کو بلا کر کہا کہ اگر تم لال قلعہ چھوڑنے کا وعدہ کرو تو تمہیں جانشین بنا دیا جائے۔ مرزا فخرو رضا مند ہو گئے اور بہادر شاہ کی مخالفت کے باوجود انہیں ولی عہد بنا دیا گیا۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا بھی انتقال ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے زینت محل کے کہنے سے مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کے لیے ہر کوشش کی' لیکن کمپنی نے اسے ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ایک دوسرے شہزادے کی حمایت کی کیونکہ وہ بادشاہ کے خطاب' رہے سہے اختیارات اور لال قلعے کو چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ مگر ولی عہد کا مسئلہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ۱۸۵۷ء میں تاریخ نے ایک اور کروٹ لی اور وہ ساغر ہی ٹوٹ گیا اور ساقی کو دیارِ غیر میں ادنیٰ قیدی کی حیثیت سے بھیج دیا گیا۔ کون جانے کہ مرتے وقت بہادر شاہ ظفر کو اس خیال سے اطمینان سا ہو کہ ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

اودھ

نادری حملہ اور پھر ابدالی کی غارت گری کے بعد دلی کے با کمالوں کو اودھ کے دامن میں پناہ ملی۔ ان با کمالوں میں اردو کے شاعروں کے نام سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے طوائف الملوکی اور صوبوں کی عملی خودمختاری کا جو سلسلہ شروع ہوا اُس نے اودھ اور حیدرآباد دکن کی ریاستوں کو جنم دیا۔ یہ دونوں ریاستیں بعد میں تمدنی اور تہذیبی طور پر دلی کی قائم مقام بنیں۔ حیدرآباد دکن دور تھا' اس لیے تمنا کے باوجود اہل فن کا وہاں پہنچنا آسان نہ تھا (ویسے شاہ نصیر اور ان کے بعد داغ اور امیر مینائی کی نسبت سے دکن کو اعتبار حاصل ہوا) اسی لیے اودھ ان فنکاروں کے لیے زیادہ کشش رکھتا تھا۔

اودھ کے نواب وزیروں (صفدر جنگ' شجاع الدولہ اور آصف الدولہ) کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے' لیکن اودھ کی ادبی اہمیت کے پیش نظر اس ریاست کی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مغلوں کے دورِ آخر میں صوبہ داری بھی موروثی بن گئی تھی' اسی لیے صوبہ داروں کے سلسلے بھی ''نوابی'' میں بدل گئے۔ سلطنتِ اودھ کا بانی برہان الملک محمد امین تھا۔ یہ ایک ایرانی سوداگر تھا جو فطرت میں مہم جوئی کا جوہر اور ترقی کے لیے اضطرابی کیفیت رکھتا تھا۔ محمد امین' فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد میں ہندون اور بیانہ کا فوجدار تھا۔ ساداتِ بارہہ کے مقابلہ میں اُس نے محمد شاہ کی مدد کی۔ محمد شاہ نے ان خدمات کے صلے میں اُسے سعادت خاں بہادر کا خطاب دیا اور اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ یوں تاجر محمد امین ''برہان الملک سعادت خاں'' بن کر نواب وزیروں اور اودھ کے حکمرانوں کا جد امجد اور بانیٔ سلسلہ بن گیا۔ اُس نے نادری حملے کے موقع پر بھی محمد شاہ کی ''مدد'' کی تھی جس پر اگلے باب میں گفتگو کی گئی ہے۔

برہان الملک سعادت خاں کے بعد اس کا داماد اور بھانجا منصور علی خاں صفدر جنگ اس کا جانشین بنا۔ روہیلے اس زمانے میں اپنی شیرازہ بندی کر چکے تھے۔ صفدر جنگ سے ان کے معرکے ہوئے۔ محمد شاہ کے آخر زمانے میں صفدر جنگ کو وزیر سلطنت بنا دیا گیا تھا' لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اسے آخر میں اپنے صوبہ لوٹنا پڑا تھا۔ اس وقت تک صوبہ اودھ کا صدر مقام فیض آباد تھا اور الہٰ آباد بھی اسی صوبے میں شامل تھا۔ پھر یہ صوبہ داری بنارس سے آگے بہار کی سرحد تک پہنچ گئی تھی' اسی لیے یہ صوبہ خود ایک ریاست یا ''مملکت'' بن گیا تھا۔ صفدر جنگ کا عہد ۱۷۳۹ء سے ۱۷۵۴ء تک کا ہے۔ ۱۷۵۴ء میں فیض آباد میں اس کا انتقال ہوا' مگر دہلی میں دفن کیا گیا۔

صفدر جنگ کا بیٹا شجاع الدولہ ۱۷۵۴ء (م ۱۱۶۷ھ) میں اودھ کا نواب وزیر ہوا۔ شجاع الدولہ اپنے دائرہ اختیار و اقتدار کو وسیع کرنے کے لیے ہر جتن کرتا رہا۔ وہ سیاست میں درک رکھتا تھا اور زمانے کی رفتار کے مطابق قدم اٹھاتا۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کا رفیق بنا' مگر مرہٹوں سے بھی سلسلۂ سلام و پیام جاری رکھا۔ شاہ عالم کو شہزادگی کے دور میں جب وہ شہزادہ عالی گہر تھا اُسی نے اُکسا کر بنگالہ کی طرف بھیجا تھا پھر شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے کر انگریزوں سے آمادۂ جنگ ہوا' مگر بکسر کے میدان ۱۷۶۴ء میں ایسی شکست ہوئی جس کا خمیازہ صرف وہ ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی بھگتی رہیں۔ بکسر کی جنگ نے شجاع الدولہ کی فوجی قوت کو ختم کر دیا۔ برطانوی فوج لکھنؤ میں داخل ہو گئی مگر کمپنی کے حالات الحاق کی اجازت نہیں دیتے تھے' اسی لیے ایک ''معاہدہ'' کیا گیا جس کی خاص اور بنیادی دفعہ حسب ذیل تھی۔

> In case the Dominions of H.H. Shujaud Dowla at any time hereafter be attacked, the East India Company shall assist him with a part or whole of their forces. In the case of the English Company's forces being employed in His Highness Service the extraordinary expenses of the same to be defrayed by him.[۴۷]

---

۴۷ Panikar, k.m., The Evolution of British Policy Towards Indian states, p.s., Calcutta, 1929.

شجاع الدولہ ۱۷۷۵ء تک نواب وزیر رہا۔ وہ اکیس سال تک سخت موانع کے باوجود اپنے ''صوبہ'' کی شیرازہ بندی کرتا رہا' لیکن انگریز اودھ کی تعمیر کے خواہاں نہیں تھے۔ اُدھر روہیلے ایک بڑی طاقت بن رہے تھے۔ اُن کا مزاج اور کردار ایسا تھا کہ اس عہد میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا منصوبہ بنانے والوں نے انہیں اس مقصد کے لیے چُنا۔ وارن' ھیسٹنگز نے شجاع الدولہ کو روہیلوں سے لڑنے پر اُکسایا اور حافظ رحمت خاں ۱۷۷۴ء میں شہید کر دیئے گئے۔ روہیلوں کے علاقہ سے علی محمد خاں کے وارث فیض اللہ خاں کو رام پور کا علاقہ ملا اور یوں مسلمانوں کی یہ ''ریاست'' وجود میں آئی۔ باقی حصہ اودھ میں شامل کر دیا گیا لیکن اس علاقہ کی مال گزاری کے ایک تہائی سے زیادہ کے حصہ دار انگریز بن گئے اور یوں اودھ کی معاشی کشمکش کے دور کا آغاز ہوا۔

شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں مسند نشین ہوا۔ آصف الدولہ نے اپنی گدی نشینی کے بعد ہی فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو صدر مقام بنایا اور یوں لکھنؤ کی تمدنی اور تاریخی اہمیت و عظمت کا دور شروع ہوا۔ آصف الدولہ کو تعمیرات سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ ایک طرف تو لکھنؤ میں اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں سے ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے اس شعر سے:

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے
عمارت بناتے چلے جایئے

آصف الدولہ کے عہد میں ہی لکھنؤ ادبی مرکز بنا اور دہلی کے اکابر شعراء ہجرت کر کے اودھ پہنچے۔ سیاسی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا دباؤ اودھ پر بہت سخت ہو چکا تھا۔ آصف الدولہ کی گدی نشینی کو تسلیم کرنے کے لیے کمپنی نے یہ شرط رکھی کہ بنارس کو سلطنتِ اودھ سے الگ کر دیا جائے۔ ۲۱ مئی ۱۷۷۵ء کو جو معاہدہ کیا گیا اس کی پانچویں دفعہ اسی سے متعلق تھی۔ انگریزوں نے ہمیشہ کسی علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے یا دخل دینے کے لیے عذر تراشے ہیں۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں آصف الدولہ اور اودھ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے برطانوی ذہنیت بے نقاب ہو جاتی

ہے۔

نواب کی فوجوں کی حالت برطانوی علاقہ کے تحفظ کے لیے ایک خطرہ تھی۔ سرجان شور نے آصف الدولہ اور اودھ کے بارے میں ۱۲ مئی کو ڈونڈس (Dondus) کو لکھا کہ عدم اعتماد اور انتشار ہر طرف پھیلا ہوا ہے اور ہماری دو بریگیڈ فوجوں کی وجہ سے بغاوت رکی ہوئی ہے۔ نواب دیوالیہ پن کے حال کو پہنچ گیا ہے اور اسے اس کا احساس نہیں۔ [۲۸]

اودھ کی اس کیفیت کے لیے کمپنی کہاں تک ذمہ دار تھی؟ اس کا اندازہ اس باب کے بیان کردہ واقعات سے بھی ہو جاتا ہے اور اگلے باب میں ہم اس سوال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کمپنی کی دخل اندازی کی کیفیت یہ تھی کہ ۱۷۹۷ء میں سرجان شور خود لکھنؤ گیا اور وہاں اُس نے انگریزوں کے وفادار "تفضّل حسین کو وزیر اعظم بنوایا" [۲۹] اُس کے کلکتہ واپس جانے کے دو ماہ بعد ہی آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد وزیر اعلیٰ ۱۷۹۷ء میں اُس کا جانشین ہوا۔ وہ انگریزوں کا آلۂ کار بننے پر رضا مند نہ ہوا اور اسی لیے اسے چار ماہ کے بعد گدی سے اتار دیا گیا اور کمپنی نے اس باب میں کسی اخلاقی اصول اور ضابطہ کا خیال نہ کیا۔ ہمیں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے اس بیان پر حیرت ہوتی ہے کہ "اودھ میں عام طور پر وزیر علی کی جانشینی کو ناپسند کیا گیا...... اس کی طینت خراب تھی" [۳۰] مولانا حامد حسن قادری کا یہ بیان تاریخی حقائق سے زیادہ قریب ہے کہ رعایا وزیر علی کی طرفدار تھی لیکن ان کی کچھ نہ چلی۔ [۳۱] مولانا قادری کے اس بیان کی تصدیق ہم عصر شہادتوں سے ہوتی ہے اور خود

---

[۲۸] Dodwell. H.H. (editor), The Cambridge History of India, Vol, V, chapter XXI, p. 348, 1929.

[۲۹] ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ تاریخ ہند (عہد جدید) ساتواں باب۔ دارالطبع جامعہ عثمانیہ ۱۹۴۸ء۔

[۳۰] حوالہ بالا۔ صفحہ ۲۰۸۔

[۳۱] حامد حسن قادری۔ داستانِ تاریخ اردو۔ صفحہ ۱۷۲۔ لکشمی نرائن اگروال آگرہ۔ ۱۹۴۱ء۔

برطانوی مؤرخ اس مسئلہ پر شرمائے ہوئے لہجہ میں بات کرتے ہیں۔ جرأت نے وزیر علی کی برطرفی پر جو قطعۂ تاریخ کہا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورب کے امیروں کو ''بنگال کی مینا'' قرار دینے والے شاعر کا سیاسی شعور کتنا بیدار تھا۔

کیمبرج ہسٹری کے مؤرخ کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ ''عام طور پر وزیر علی کی جانشینی کو ناپسند کیا گیا''۔ کیمبرج ہسٹری میں اس بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''آصف الدولہ کی وفات کے بعد پہلے تو گورنر جنرل نے وزیر علی کو اس کے جانشین کی حیثیت سے تسلیم کرلیا...... نواب مرحوم کی والدہ کی اجازت بھی تھی اور لوگوں میں عام اطمینان بھی تھا لیکن...... جان شور نے پورے مسئلہ کا پھر سے جائزہ لیا اور اس بار وہ مختلف نتیجہ پر پہنچا۔ جنرل کریگ (Craig) اور سر کلارک کمانڈر ان چیف نے متنبہ کیا کہ فیصلہ بدلنے میں خطرہ ہے۔ لکھنؤ میں عام بغاوت کی ہر علامت موجود تھی...... لیکن جان شور نے خطرہ مول لیا۔ وزیر علی کو گدی سے اتارنے کا اعلان کر دیا اور اس کے چچا سعادت کو اس کی جگہ جانشین بنایا۔ ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو سعادت علی نے' جو اب مسند پر تھا ایک ایسا معاہدہ کیا جس سے انگریزوں کی طاقت قابل لحاظ حد تک بڑھ گئی۔ ۳۲ے

کیمبرج ہسٹری کے اس بیان پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ سعادت خاں جو اپنے بھائی کے عہد میں لکھنؤ میں رہ بھی نہیں سکتا تھا' وہ ''انگریزوں کی طاقت کو قابل لحاظ حد تک'' بڑھانے کے لیے مسند نشین کیا گیا۔ عہدِ حاضر کے مؤرخوں میں ڈاکٹر آر۔ سی مجمدار نے دوسروں کی نسبت زیادہ تفصیل کے ساتھ وزیر علی کے بارے میں لکھا ہے اور انہوں نے اس نکتہ پر زور دیا ہے کہ ''اگرچہ وزیر علی کا ہنگامہ کافی مشہور ہے لیکن انگریزوں کو نکالنے کی ایک منظم مگر ناکام کوشش کی حیثیت سے اس کی پوری اہمیت کو عام طور پر محسوس اور تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ ۳۳ے

۳۲ے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد پنجم ص ۵۰۔ ۳۴۹ کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۲۹ء۔

۳۳ے Mujamdar, R.C.; History of the fredom movement in India, Vol. 1, p. 95, Calcutta, 1963.

سعادت علی خان ۱۷۹۸ء میں مسند نشین ہوا۔ انگریزوں کے مقاصد اور منصوبے بہت جلد سامنے آ گئے۔ ولزلی نے دو سال کے بعد آدھا ملک چھین لیا۔ ۱۸۰۱ء میں روہیلوں کی تباہی میں بھی وہ کمپنی کا آلۂ کار تھا۔ سعادت علی خاں کے عہد میں فوج کی تعداد بڑھا کر بیس ہزار کر دی گئی' حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اودھ پر شاہ زماں کے حملہ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا اثر اودھ کی مالیات پر بہت برا پڑا اور سعادت علی خاں نے الگ ہو جانا چاہا۔ ولزلی اس پر آمادہ ہو گیا' مگر نواب نے دست برداری سے پہلے جانشینی کے فیصلہ پر زور دیا اور گورنر جنرل اس پر بہت ناراض ہوا۔ سعادت علی خاں کا عہد اودھ کے معاملات میں کمپنی کی غیر معقول دخل اندازی کے نئے دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ ۱۷۹۷ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی گئی۔ نواب کی فوج مکمل طور پر توڑ دی گئی۔ ۱۰ نومبر ۱۸۱۰ء کو ایک نیا معاہدہ مرتب کیا گیا جس کی رو سے روہیل کھنڈ اور دوآبہ کے زرخیز ضلع فوج کے اخراجات کے لیے کمپنی کے حوالے کر دیے گئے اور یوں اودھ کی ''سلطنت'' برطانوی ''علاقوں'' سے گھر گئی۔ الحاق کے بعد یہ ضلع بورڈ آف کمشنرز کے سپرد کیے گئے جس کا صدر گورنر جنرل کا چھوٹا بھائی ہنری ولزلی تھا۔[۳۴] ادبی طور پر سعادت علی خاں کا دور کافی اہم ہے۔ انشا' مصحفی' قتیل وغیرہ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سعادت علی خاں کی وفات کے بعد ۱۸۱۴ء میں غازی الدین حیدر مسند نشین ہوا۔ اودھ کی وزارت اسی کے عہد میں بادشاہت میں تبدیل ہوئی۔ غازی الدین حیدر ۱۸۱۴ء سے ۱۸۱۹ء تک نواب وزیر اودھ رہا۔ ۱۸۱۹ء میں اُس نے لارڈ ھیسٹنگز کے اشارہ پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے دربارِ دہلی سے اپنا رشتہ باضابطہ طور پر منقطع کر لیا۔ سلطنتِ دہلی کے تاریخی جائزہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاہ عالم کے بعد سے کس طرح کمپنی نے آہستہ آہستہ مغل اقتدار اعلیٰ کے خلاف عملی اقدام کیے۔ نذر کی رسم کے خاتمہ سے اودھ کی خود مختاری کے اعلان تک...... غازی الدین حیدر ۱۸۱۹ء سے ۱۸۲۷ء

---

۳۴ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ تاریخ ہند (عہد جدید) باب لارڈ ز ولزلی اور عہدِ معاونت''

تک بادشاہ اودھ رہا۔ یوں اس کا دور دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس بادشاہت کا ''دائرۂ اقتدار'' کیا تھا؟ اس کا اندازہ کلکتہ گزٹ کے اقتباس ذیل سے ہو سکے گا۔ یہ ۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء کی رپورٹ ہے اور اس کا عنوان ہے: ''لکھنؤ میں جشن تاج پوشی''۔

We are informed by a correspondent at Lucknow, of some particulars, relative to the coronation of His Majesty the King of Oude. Reports had been in circulation for several months, that it was the intention of the vizeir to assume the title of King, provided the sanction of our government could be obtained. [۳۵]

اس اقتباس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اگلے باب میں اسی رپورٹ کا باقی حصہ پیش کیا گیا ہے جس سے ''تاج پوشی کے جشن'' کی تفصیلات بھی سامنے آتی ہیں اور ''معزز انگریز خواتین'' کا کردار بھی جو ہوس زر میں اپنے شوہروں اور مردوں سے پیچھے نہیں تھیں۔ ادبی طور پر غازی الدین حیدر کا عہد لکھنؤ کا درخشاں زمانہ ہے۔ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش اور رجب علی بیگ سرور کے نام اس دور کے اہل قلم میں ممتاز ہیں۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک کا ہے۔ اس دور میں شاہی خاندان آپس کے فتنہ و فساد میں الجھا رہا۔ نصیر الدین حیدر اپنی ماں سے ناراض تھا۔ اس ناراضگی کی وجہ اپنے بیٹے فریدوں بخت سے اُس کے تعلقات کی کشیدگی تھی کیونکہ اُس کی ماں نے اپنے پوتے کا ساتھ دیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کا انجام عبرت ناک ہوا۔ اُسے زہر دیا گیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

نصیر الدین حیدر کی اچانک موت اقتدار کے لیے رسہ کشی کا سبب بن گئی اور لکھنؤ کی ''دونوں سرکاروں'' میں ٹکراؤ ہوا۔ ایک سرکار تو ''خاندان شاہانِ اودھ'' تھی اور

---

۳۵ Selections from Calcutta Gazettes, Vol. V, October 1869.

دوسری سرکار ریذیڈنٹ بہادر کی ذات۔ ریذیڈنٹ جنرل لو نے نصیر الدین حیدر کو چچا نصیر الدولہ کو تخت پر بٹھانا چاہا اور دوسری طرف بادشاہ بیگم' فردوں بخت کو لے کر تخت اودھ کی طرف بڑھیں۔ ریذیڈنٹ نے دولت خانہ شاہی کو مقفل کرا دیا تھا۔ بادشاہ بیگم نے بند' صدر دروازے کو ہاتھوں کے ذریعے تڑوا دیا اور فریدوں بخت کو تخت پر بٹھا کر احکام شاہی جاری کرنے شروع کر دیئے۔ ''صورت حال'' پر قابو پانے کے لیے انگریزی فوج بلوائی گئی۔ بادشاہ بیگم اور فریدوں بخت کو گرفتار کر لیا گیا۔ یوں نصیر الدولہ محمد علی شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ محمد علی شاہ کے عہد حکومت میں ہر فیصلہ پر رزیڈنٹ کی مُہر توثیق ثبت ہوتی تھی۔ ان حالات میں برطانوی مؤرخوں کی بدنظمی اودھ کی شکایت عجیب معلوم ہوتی ہے۔

امجد علی شاہ کا دور بہت مختصر ہے۔ وہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک فرماں روائے اودھ رہے۔ انہیں عام طور پر ''مذہبی حکمراں'' قرار دیا جاتا ہے۔ مذہب کے رسمی پہلوؤں کی حد تک یہ بات درست ہے۔ امجد علی شاہ مجالس عزا برپا کرتے' غم حسینؓ میں سیہ پوش رہتے اور انیس و دبیر کی مجالس میں شرکت کرتے۔ لیکن دوسری طرف جنسی لذتوں کے دریا میں پیراکی کرتے اور شرعی پابندیوں پر متعہ کے اسم اعظم سے قابو پالیتے۔ مذہب کو ذاتی مقاصد کے لیے بادشاہوں نے اکثر استعمال کیا ہے۔ دین کو اجتماعی زندگی اور دل و نظر کی گہرائیوں سے الگ کر کے محض رسمی طور پر اس کے شعائر کی پابندی سے نہ دنیا بنتی ہے' نہ آخرت۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھنے کے بعد امجد علی شاہ کے مذہبی رجحانات اور ان کے عہد کی اس تصویر میں کوئی تضاد نہیں رہتا جو رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عبرت میں پیش کی ہے۔

> ''اس دورے میں رنڈیوں کا دور ہوا...... اگر پیشِ خدمت ہمشیر ہے تو برادرِ عزیز حضرت کا مشیر ہے۔ خالہ' خلوت میں پائیں نشیں' بھانجا جلوت میں صدر رانشین۔ اُخت سرکار میں' اخی اخبار میں اور جس کی اندر جوان

لڑکی ہے' اس کی باہر سواری بڑے ہلڑ کی ہے۔"[۳۶]

امجد علی شاہ کے بعد واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے اور ان کی ذات کے ساتھ یہ سلطنت ختم ہوئی۔ واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۶ء تک بادشاہ کہلائے۔ نو سال کی یہ مدت رہس' راگ رنگ کے ساتھ فنونِ لطیفہ اور شعر و ادب کی قدر دانی میں گزر گئی اور اس کے بعد وہ فورٹ ولیم کلکتہ میں نظر بند رہے۔ واجد علی شاہ کا دور ختم ہو گیا مگر "پیا جانِ عالم" کا نام زندہ ہے۔ واجد علی شاہ کے عہد' ان کی ذات اور اُس دور کی شاعری سے متعلق اس مقالہ میں ایک علیحدہ باب ہے مگر آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک اودھ کے نواب وزیروں اور بادشاہوں کے جو تعلقات کمپنی کے ساتھ رہے وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس بد انتظامی کی ذمہ داری بڑی حد تک کمپنی پر تھی جس کی آڑ لے کر اس ریاست کو ضبط کیا گیا۔

دہلی اور اودھ کی جو تاریخ اختصار سے پیش کی گئی اس کے آئینے میں ایسٹ انڈیا کمپنی روہیلوں' مرہٹوں' سکھوں اور جاٹوں کے خدوخال بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ آخر میں بنگالہ اور میسور کے ذکر کے ساتھ چند اور باتوں کی قدرے وضاحت مناسب رہے گی۔

بنگالہ

سلطنتِ مغلیہ کی مرکزیت کے خاتمہ کے ساتھ ہی صوبے بڑی حد تک خود مختار ہو گئے تھے۔ اودھ بھی ایک ایسا ہی صوبہ تھا۔ دوسرا اہم صوبہ بنگالہ تھا جس میں بہار اور اوڑیسہ کو بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ فرخ سیر نے بنگالہ سے چلتے وقت یہ صوبہ' دیوان مرشد قلی خاں کے سپرد کر دیا تھا۔ جس نے مقصود آباد کو صدر مقام بنا کر اسے مرشد آباد کا نام دیا۔ بنگالہ کی تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں اور سرگرمیوں کی بنا پر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

---

۳۶ رجب علی بیگ سرور۔ فسانہ عبرت' مرتبہ سید ابوالخیر کشفی (مخطوطہ)

مرشد قلی خاں کے بعد اس کا داماد اسد خاں شجاع الدولہ ۲۵-۱۷۲۶ء (م ۱۱۳۸ھ) سے ۱۷۳۹ء (م ۱۱۵۲ھ) تک ناظم بنگالہ رہا۔ اُس کے بیٹے سرفراز خاں کی مدت نظامت صرف ایک سال ہے۔ علی وردی خاں مہابت جنگ نے اُس سے نظامت چھین لی اور ۱۷۴۰ء (م ۱۱۵۳ھ) سے ۱۷۵۶ء (م ۱۱۶۹ھ) تک وہ بنگالہ کا حاکم اعلیٰ رہا۔ علی وردی خاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں سے ہمیشہ چوکنا رہتا تھا۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے مستقبل کے اس سب سے بڑے خطرے کو سمجھ لیا تھا ان میں حیدر علی و ٹیپو سلطان کے علاوہ علی وردی خاں بھی شامل ہے۔ اُس نے کئی بار انگریزوں کی تجارتی کوٹھیوں کی فصیلوں اور عسکری تنصیبات کو ڈھا دیا۔ وہ انگریزوں کی منصوبہ بندی پر کڑی نظر رکھتا تھا۔

علی وردی خاں کی موت کے بعد سراج الدولہ کی منصب نشینی کے ساتھ ہی انگریزوں نے ایک سنگین فیصلہ کر لیا۔ اس خانوادہ کے اقتدار کو ختم کرنے کا فیصلہ۔ انہوں نے سراج الدولہ کی خدمت میں نذر پیش نہیں کی اور اس کے دشمنوں کو پناہ دی۔ سراج الدولہ نے غیرت اور جرأت کے ساتھ اس کا جواب دیا۔ کلکتہ کے بحری مورچہ کو فتح کر کے وہ شہر میں جون ۱۷۵۶ء میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا۔ فروری ۱۷۵۷ء میں واٹسن اور کلائیو نے مشترکہ بحری اور بری حملہ کیا۔ نواب سراج الدولہ اور کمپنی میں صلح ہو گئی۔ لیکن یہ صلح ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ تھی۔ ۱۷۵۷ء ہی میں فیصلہ کن جنگ ہوئی اور پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ اس جنگ کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ پلاسی کے میدان میں تاریخ نے اپنا فیصلہ بڑی حد تک انگریزوں کے حق میں دے دیا اور اس فیصلہ کی تکمیل بعد میں ٹیپو سلطان کی شہادت سے ہو گئی۔

میسور

بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں میسور کی سلطنت کا قیام اس بات کا ثبوت ہے کہ برعظیم کی مسلمان قوم اپنے عہد زوال میں بھی بانجھ نہیں ہوئی تھی۔ حیدر علی نے کئی

"وڈیاریوں" اور چھوٹی بڑی جاگیروں کو ایک ریاست کی شکل دی۔ ۱۷۶۷ء میں میسور میں حیدر علی کی اُبھرتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر مادھو راؤ نے اس پر حملہ کیا اور شکست دے دی...... مادھوراؤ کی طاقت اور شخصیت کے پیش نظر بمبئی کونسل نے موسٹین (Mostyn) کو پونا بھیجا تاکہ وہ صورتِ حال کا جائزہ لے اور کسی معاہدہ میں شامل ہوئے بغیر اُسے میسور یا حیدر آباد کے حکمرانوں سے اتحاد قائم کرنے سے روکے۔ [۳۷] اگلے سال پھر معرکہ ہوا۔ ۱۷۶۸ء میں میسور کی پہلی جنگ میں مرہٹے اور انگریز حلیف تھے۔ حیدر علی نے "اتحادیوں" کو یادگار شکست دی۔ وہ شبانہ روز میں ایک سوتیس میل سے زیادہ کا فاصلہ طے کر کے مدراس پہنچا اور انگریزوں کو (ان کے مرکز) مدراس کے دروازے پر اپنے سامنے جھکا کر اپنی شرائط پر ان سے صلح کی۔ عہد نامہ مدارس مارچ ۱۷۶۹ء میں مرتب کیا گیا تھا۔

دس سال بعد میسور کی دوسری جنگ ہوئی' جس کے محرکات میں یورپ میں برطانیہ و فرانس کی جنگ بھی شامل تھی۔ اسی طویل جنگ کے دوران دسمبر ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کا انتقال ہو گیا اور سلطان ٹیپو اس کا جانشین ہوا۔ اس وقت سلطنتِ میسور کا رقبہ کم و بیش ایک لاکھ مربع میل تھا اور فوج نوے ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ مگر ٹیپو کو مسلسل مرہٹوں اور نظام سے لڑنا پڑا۔ یہ دونوں دیسی طاقتیں وسیع اور قومی نقطۂ نظر سے مستقبل کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ ۱۷۸۶ء میں مرہٹوں اور نظام نے ٹیپو کے خلاف اتحاد کر لیا۔ اس جنگ کا خاتمہ ایک عارضی صلح پر ہوا۔ ۱۷۸۷ء میں ٹیپو نے کمپنی کے منصوبہ کو اچھی طرح جان لیا اور انگریزوں کے عزائم کو بھانپ لیا۔

He had begun to perceive that the English were more dangerous than he had thought. [۳۸]

دوسری طرف نظام اور مرہٹے' ٹیپو کو انگریزوں سے زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔

---

۳۷ Teh Cambridge History of India, Vol V, p. 252 (Chapter by C.E. Luard)

۳۸ حوالہ بالا ص ۳۴ بیسواں باب (تحریر کردہ ڈبلو۔ ایچ ہٹن)

کارنوالس کی نظر عالمی نقشۂ سیاست اور یورپ و امریکہ میں برطانیہ کے مفادات پر تھی۔ وہ ٹیپو کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ ۱۳ مئی ۱۷۹۱ء کو برطانوی فوجیں لارڈ کارنوالس کی قیادت میں سرنگا پٹم سے نو میل دور تھیں، لیکن "ٹیپو نے غیر معمولی فوجی قیادت کا مظاہرہ کیا اور برسات کے شروع ہونے پر کارنوالس اپنی فوجوں کے ساز و سامان کی مکمل ناکامی کی وجہ سے پسپائی پر مجبور ہو گیا"۔[۳۹] اس جنگ کے بعد ۱۷۹۲ء کا معاہدہ عمل میں آیا۔ انگریزوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور ٹیپو کو کئی ضلعے انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کو دینے پڑے۔ اس کے علاوہ دو بیٹے یرغمال کے طور پر دشمن کے حوالے کرنے پڑے۔

ٹیپو نے ہمت نہ ہاری۔ فرانسیسیوں سے رشتہ جوڑا۔ نپولین اور سلطان ترکی سے ذاتی رابطہ قائم کیا، لیکن اُس کے دربار میں وطن دشمنوں کا ایک پورا حلقہ تھا جو انگریزوں کو سلطان کی تدابیر سے باخبر کرتا رہتا تھا۔ میر صادق، غلام علی، بدر الزماں اور قاسم علی وغیرہ اس گروہ کے سربراہ تھے۔

انگریز، ٹیپو کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہوئے اُسے اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے، اسی لیے میسور کی چوتھی جنگ ٹیپو پر تھوپ دی گئی۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کے مؤرخ ہٹن کو بھی اعتراف ہے کہ اس جنگ پر انگلستان میں بھی غیر منصفانہ ہونے کی تنقید کی گئی، مگر اُس نے اس عہد کے انگریز مؤرخوں کی رائے کا سہارا لیا ہے جن کے نزدیک یہ جنگ ناگزیر تھی۔ ولزلی کے عہد میں انگریزی لشکر تین طرف سے فروری ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹم کی طرف بڑھے۔ ٹیپو سلطان نے ایک بار پھر بے مثل عسکری قیادت کا مظاہرہ کیا، لیکن غداروں نے جنگ کا نقشہ پلٹ دیا۔ قاسم علی نے انگریزوں کو سرنگا پٹم کے قلعہ کا راستہ دکھایا اور سلطان ٹیپو ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو شجاعت سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ اس جنگ سے انگلستان کے باضمیر افراد اپنی حکومت کی جارحیت اور ظلم کے خلاف چلّا اٹھے اور انہوں نے ٹیپو کو اپنے وطن کی جارحیت کا شہید قرار دیا۔ ہٹن نے کتنی "سامراجی جارحیت" کے ساتھ اپنے

---

۳۹ حوالہ بالا صفحہ ۳۳۶۔

باضمیر ہم وطنوں کی تذلیل کی ہے۔

Tipu was regarded by ignorant pamphletters in England as a martyr to English aggression.[۴۰]

سراج الدولہ کی شکست کے بعد سلطان ٹیپو شہید کی شہادت نے برعظیم کے مستقبل پر غلامی کی سیاہی پھیر دی۔ مغل سلطنت کی حالت کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ مرہٹے ایک عسکری طاقت ہونے کے باوجود کبھی با اصول نہیں رہے۔ انہوں نے برعظیم کی آزادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ وہ مرہٹہ راج کا خواب ضرور دیکھ رہے تھے' مگر پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد عرصہ تک انہوں نے چوتھ' خراج اور لوٹ مار کو اپنے لیے کافی سمجھا۔ شمالی ہند میں روہیلے ایک ایسی ابھرتی ہوئی طاقت تھے جن میں بحیثیت جماعت اس عہد کے عام عیوب نہیں تھے اور جنہیں اس دور کے مسلمان مصلحین نے احیائے سلطنت و حکومت کے لیے منتخب کیا۔ لیکن انگریزوں نے روہیلوں اور سلطنت اودھ کو جس طرح ایک دوسرے سے لڑوایا اس کا کسی قدر اندازہ گزشتہ صفحات سے ہوسکتا ہے۔ یہ کشمکش صفدر جنگ کے دور ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ محمد خاں بنگش کے بعد احمد خاں بنگش نے صفدر جنگ اور جاٹوں کو پے در پے شکستیں دی تھیں۔ روہیلوں کی تاریخ میں نشیب و فراز دونوں موجود ہیں۔ لیکن ہماری رائے میں روہیلے تاریخ کے رُخ کو نہیں موڑ سکتے تھے۔ ایسی آخری شخصیت سلطان ٹیپو کی تھی۔ ٹیپو جو آج' آزادی کا نشان ہے اور جس کے ساتھ غداری کرنے والوں کو زمانہ ''ننگِ آدم' ننگِ دیں' ننگِ وطن'' کہتا ہے۔

---

۴۰ حوالۂ بالا صفحہ ۳۴۱

۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک

تاریخی واقعات کا سیاسی' اقتصادی اور تمدنی تجزیہ

۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا تاریخی پس منظر گزشتہ باب میں اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس باب میں اُس دور کے واقعات و حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب واضح ہو سکیں' اودھ کی ''بادشاہت'' کی حقیقت سامنے آ سکے' مرہٹوں کے کردار کو سمجھا جا سکے اور کمپنی کے خدوخال اس کے اعمال کے آئینے میں اُبھر سکیں۔

سلطنتِ مغلیہ

اورنگ زیب کی وفات کے وقت ۱۷۰۷ء میں مغل سلطنت اپنی انتہائی وسعت پر تھی۔ شمالی ہند میں یہ سلطنت مشرق میں آسام کی سرحد تک اور مغرب میں کوہ ہندوکش کے سلسلہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ دکن کی ریاستیں فتح ہو چکی تھیں اور تنجور تک کا علاقہ عالمگیر کے زیر نگیں آ چکا تھا۔

اورنگ زیب پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُسے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں سے نہیں الجھنا چاہیے تھا۔ اس معاملہ کو بعض مؤرخ اورنگ زیب کے کٹر سُنی ہونے اور اُس کی شیعہ دشمنی کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ عالم گیر کے معترض اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ ریاستیں اپنی کمزوری کی وجہ سے مرہٹہ فوجوں کا گڑھ بن گئی تھیں۔ جادو ناتھ سرکار نے تاریخ اورنگ زیب میں واضح طور پر یہ کہا ہے کہ ان ریاستوں کا خفیہ تعلق مرہٹوں سے تھا۔ گول کنڈہ میں اختیارات بڑی حد تک برہمنوں کے ہاتھ میں تھے جو مسلم دشمن تھے۔[۱]

۱؎ Qureshi, I.H., The muslim community of the Indo-Pakistan Subcontinent, p.165, the Hague, 1962.

مرہٹوں سے جنگ ناگزیر تھی۔ شیوا جی سے مصالحت کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ مرہٹے گوریلا اندازِ حرب کے ماہر اور ایک مبہم وگروہ تھے۔

اسی سلسلہ میں اورنگ زیب کے مذہبی رجحان طبع پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے دین اور سیاست کو ملا دیا جب کہ اس کے پیش رووں اور خاص طور پر اکبر نے مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھا تھا۔ یہ اعتراض مغرب کے ذہن کی پیداوار ہے یا برعظیم میں جھوٹی قومی وحدت اور ''ایک ہندوستانی قوم'' کے مدعیوں کا نعرہ ہے۔ مغرب میں مذہب کا تصور بہت محدود ہے' یعنی ''قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور خدا کا حق خدا کو'' لیکن اسلام ایک ہمہ گیر اور جامع نظامِ حیات ہونے کی وجہ سے اپنے ماننے والوں سے زندگی کے ہر شعبہ میں قوانین الٰہی پر عمل پیرا ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر ہندو اور مسلمان برعظیم میں اپنی صدیوں طویل تاریخ میں کبھی ایک برادری کے رُکن نہیں بنے۔ دیانتدار ہندو مؤرخ بھی اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر مجمدار ''متحدہ قومیت'' کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''سیاسی ضرورتوں نے ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرہ کو جنم دیا...... دانستہ اور شعوری طور پر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندو اور مسلمان اپنی انفرادی خصوصیات کو اس حد تک ختم کر چکے تھے کہ ان دونوں کے تمدن مل کر ایک ہو گئے تھے اور ان میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ اگرچہ ہر سچے ہندوستانی کو خلوص کے ساتھ یہی تمنا کرنی چاہیے' لیکن بدقسمتی سے یہ بات کبھی تاریخی حقیقت نہیں بن سکی...... ایک ایسی بات کو تسلیم کر لینا جو پسندیدہ ہو لیکن حاصل نہ کی جا سکی ہو...... صرف ایک بڑی تاریخی غلطی ہی نہیں ہے بلکہ نہایت ہی نمایاں اور ایک ایسی سیاسی حماقت ہے جس کے نتائج بسا اوقات نہایت المناک ہوتے ہیں۔''[۲]

---

۲ Majumadr, R.c, History of the Freedom Movement, Vol. 1, pp xviii & xix, Calcutta, 1963.

سطور بالا میں ہم نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا سبب اورنگ زیب کی اسلامی روشِ حیات نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس زوال کا ابتدائی سراغ اکبر کی مذہبی اور سیاسی پالیسی میں ملتا ہے۔ وہ پالیسی جسے ''مذہبی روشن خیالی'' کے نام سے سراہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''اکبر کی لبرل ازم میں حقیقت پسندی نہیں تھی''۔ ۳

اورنگ زیب کی وفات کے بعد انتشار کا ذکر کرتے ہوئے برطانوی اور بعض ہندو مؤرخ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ہی اس انتشار کا ذمہ دار تھا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عالمگیر کے کردار اور اس کے کارناموں کے سائے نے کئی برس تک سلطنت کو خانہ جنگی اور دوسری خرابیوں کے باوجود بکھرنے نہیں دیا۔ جادو ناتھ سرکار نے یہ بات نہایت قوت اور یقین کے ساتھ کہی ہے۔

> His wonderful capacity, strength of character, and lifelong devotion to duty had generated a force which held together the frame of the Delhi Government seemingly unchanged for thirty years after him. ۴

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں میں نہ تو اس کا سا کردار تھا' نہ سیاسی بصیرت اور نہ قوت و حشمت۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امرائے سلطنت نے بادشاہ گری کی منزل کی طرف قدم بڑھایا اور اسی سلسلہ میں ان میں شدید کشمکش پیدا ہوئی۔ جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ یہ نیا عنصر نمایاں طور پر اُبھرا اور اُمراء حصولِ سلطنت کی جنگ میں شہزادوں اور تخت کے امیدواروں سے زیادہ اہم ہو گئے۔ ۵

بادشاہ پر اپنا اثر قائم کرنے کے لیے ان امیروں میں گروہ بندی شروع ہوگئی۔

---

۳ Qureshi, Muslim Community, p. 170

۴ Sarkar, J.N., Fall of the Mughal Empire, Vol. 1, p, 2, 1949.

۵ Tara Chand, History of the Freedom Movement in India, Vol. one, p. 40, 1961

ایک کمزور بادشاہ کے دور میں یہ بات بالکل فطری ہے۔ محمد شاہی دور میں خاص طور پر اپنے تحفظ کے پیش نظر امیروں نے گروہ بنا لیے' اس گروہ بندی میں نسلی اور مذہبی عناصر زیادہ اہم تھے۔ ''تورانی'' اور ''ایرانی'' امیروں کی آویزش اور سازشوں نے سلطنت کے رہے سہے وقار اور اقتدار کو ختم کر دیا۔ ان گروہوں نے اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لیے دوسری طاقتوں سے امداد حاصل کی۔ اس کا سلسلہ ساداتِ بارہہ سے شروع ہوا جنھوں نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ شریک کر کے انہیں شمالی ہند کی سیاست میں دخیل ہونے کا موقع دیا۔

اس گروہ بندی میں سیاست کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی دخل تھا۔ تورانی امیر سُنی تھے اور ایرانی امیر شیعہ۔ تورانی گروہ کے اولین رہنماؤں میں اعتماد الدولہ دوم کا نام زیادہ اہم ہے۔ ایرانی گروہ کی شیرازہ بندی پہلے برہان الملک سعادت خاں نے کی' اور ۱۷۳۹ء میں اُس کے انتقال کے بعد صفدر جنگ نے۔ سعادت خاں کے بارے میں بعض مؤرخین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نادری حملہ کے وقت وہ بادشاہ کی ممانعت کے باوجود محض دکھاوے کے لیے ہم مذہب ایرانیوں سے جا بھڑا اور گرفتار ہوا' لیکن اس کی گرفتاری محض ڈھونگ تھی۔ اُس نے اپنے ہم مذہب ایرانیوں کے مقابلہ میں ہندوستان کے سُنی بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ نظام الملک سے اس کی رقابت بھی تھی۔

عالمگیر کے جانشینوں میں اتنی ہمت اور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ان امیروں کی سازشوں کا مقابلہ کر سکتے۔ اگر اُن میں جرأت ہوتی تو مرہٹے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس کا سبب مغلوں کی عسکری قوت کا کمزور ہو جانا تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں سپاہیوں کو تنخواہ بھی نہیں مل پاتی تھی اور بے تنخواہ سپاہی ڈاکوؤں کی طرح رعایا کو لوٹتے پھرتے تھے۔ ''شمشیر داغ رسالہ'' کا قیام' عسکری قوت کے حصول کی طرف ایک مناسب قدم تھا' مگر اس کا جو حشر ہوا وہ گزشتہ باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔

اس ضمن میں یہ کہنا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ مغلوں نے کبھی بحری فوج کے قیام اور ترقی کی طرف توجہ نہیں دی۔ انگریزوں کے مقابلے کے لیے بحری قوت کا ہونا ناگزیر

تھا۔ انگریز مشترکہ بحری اور بری حملہ کرتے تھے۔ سراج الدولہ کے خلاف ایک طرف امیر البحر واٹسن اپنے بیڑے کو لے کر بڑھا تھا اور دوسری طرف کلائیو نے اپنی میدانی فوج کے ساتھ پیش قدمی کی تھی۔ ''مشترکہ بحری و بری حملے'' مسلمانوں کے لیے کوئی نئی بات نہ تھے۔ محمد بن قاسم کا حملہ اس کی ایک مثال ہے۔ اس کی منجنیق ''عروس'' اور دوسرا بھاری سامان سندھ تک بحری جہازوں کے ذریعہ بھیجا گیا تھا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں فاتح صقلیہ ابوالاغلب' عبید اللہ المہدی' محمد فاتح اور مرادِ اعظم جیسے امیر البحر ملتے ہیں لیکن برعظیم پاک و ہند میں وہ بحری بیڑے کے قیام سے بالکل بے نیاز رہے۔

محمد شاہ کے عہد میں ہندو مسلم تلخیوں اور فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ خانہ جنگی اور سیاسی کمزوری کے زمانے میں ایسے فسادات اور شہری آبادی کے تلخ جذبات بھی زوال کی رفتار کو تیز تر بنا دیتے ہیں۔

مغلوں کے زوال میں ان سارے عناصر کی کارفرمائی سے انکار نہیں' لیکن ہمارے نزدیک اس زوال کا سب سے اہم سبب مسلمانوں کے کردار کی عمومی پستی ہے۔ وہ اسلامی' اخلاقی اور انسانی قدروں کے تصور سے بھی نا آشنا ہو گئے تھے۔ یوں ہم نے محض ایک سلطنت نہیں کھوئی' بلکہ ایک قوم طویل مدت تک اخلاقی موت میں مبتلا رہی۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کردار کی پستی کو ''کردار کا بحران'' کہہ کر نہایت جامعیت کے ساتھ اس سبب کو کم سے کم لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔

> The foremost cause of the loss of political power was a crisis in the Muslim character itself...... It was not only an empire that fell; it was a community that fell from its moral pedestal and brought down with it all that had made it great and powerful.[٦]

پچھلے باب میں اخلاقی زوال کے جو چند واقعات پیش کیے گئے ہیں ان کو اس نظریہ کی شہادت کا درجہ دیا جا سکتا ہے' لیکن مرقع دہلی اس عہد کے مسلمانوں کے اخلاقی

---

٦ Qureshi, Muslim community, pp. 172-3.

زوال کی عبرتناک دستاویز ہے۔ یہ کتاب نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ کی تصنیف ہے۔ جب محمد شاہ نے نظام الملک کو مرہٹوں کے مقابلے اور اپنے انتظام حکومت کو درست کرنے کے لیے دکن سے بلایا تو خان دوراں اُن کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ نظام الملک "آخر ماہ ربیع الاول ۱۱۵۱ھ میں دہلی پہنچے۔ ؎ اُن کی واپسی کی تاریخ ۲۰ جمادی الاول ۱۱۵۴ھ (م ۲۶ جولائی ۱۷۴۱ء) ہے۔ اس طرح درگاہ قلی خاں نے دہلی میں تین سال سے زیادہ مدت گزاری۔ جب وہ دہلی پہنچے تو ان کی عمر انتیس سال تھی۔ وہ کوئی درویش یا زاہد نہیں تھے، لیکن دہلی میں فواحش و منکرات کے وہ مناظر سامنے آئے کہ انہیں یہ کہنا پڑا کہ آنکھ نہ کھولنا عین بصیرت ہے۔ عیش و عشرت، جنسی لذات اور جنسی معکوسیت (Perversion) کی آخری منزل اس مرقع میں نظر آتی ہے۔

چند اقتباسات سے محمد شاہ کی دہلی کا یہ پہلو واضح طور پر سامنے آ جائے گا۔

خلد منزل کا نقشہ درگاہ قلی خاں نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"معاشراں بہ محبوبانِ خود در ہر گوشہ و کنار دست در بغل و عیاشاں در ہر کوچہ و بازار بہول مشتیہات نفسانی در رقص ...... وشہوت طلباں بے واہمۂ مزاحمت سرگرم شاہد پرستی...... ہجومِ امارِدِ نو خطان توبہ شکنِ زہاد و آہو پسراں بہ عشق بے مثال" ؎

اردو غزل میں امرد پرستی کے رجحان کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ فارسی شاعری کی تقلید کا اثر ہے۔ ہم نے ایک روایت کو تقلیدی طور پر اپنے شعر و ادب کا حصہ بنا لیا ہے۔ لیکن مرقع دہلی سے یہ بات درجہ تحقیق تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ "گناہِ قوم شکن" عوامی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ اربابِ طرب کے ذکر میں ہمیں اللہ بندی امرد، رجی امرد اور سلطانہ امرد کے نام ملتے ہیں۔ سلطانہ امرد کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی عمر بارہ سال ہے اور رقص کا ماہر ہے۔

؎ حکیم مظفر حسین۔ مقدمۂ مرقعِ دہلی۔ ص ۱۵ مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد دکن۔

۸ درگاہ قلی خاں۔ مرقع دہلی

امرد پرستی کے مظاہرے ایک طرف بازاروں میں ہوتے تھے تو دوسری طرف رؤسا اور عمائدِ سلطنت اس پر فخر کرتے تھے۔ "ذکرِ کیفیتِ چوک سعد اللہ خاں" میں خانِ دوراں ہمیں بتاتے ہیں کہ "ہر طرف رقصِ امارد خوش رُو قیامت آباد"[9] اعظم خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "از امرائے عظیم الشان است...... طبیعتش امارد پسند است و مزاجش بہ محبتِ سادہ رویاں دربند"[10] مرزا منو کی امرد پرستی کا یہ عالم تھا کہ "ہر نو خط رنگین کہ بایں محفل ربط نہ داد' فرد باطل است...... مجلس دار العیارِ شاہداں است"[11]

طوائفوں اور اسی قبیل کے تمام اربابِ طرب کے لیے ایک محلّہ بسایا گیا تھا جس کا نام کسل پورہ تھا۔ اس کے بسانے میں بڑی نفاست اور تکلف سے کام لیا گیا تھا۔ یہ نام اپنے بسانے والے سے نسبت رکھتا ہے' گویا یہ کوئی بڑے فخر یا نیکی کا کام تھا۔

"کسل سنگھ از عمدہ ہزاریان بادشاہی است۔ پورہ درنہایت تقطیع و تکلف احداث کردہ از ہر قسم طوائف و فواحش بازاری کہ عبارت از مال زادیہا باشد آمادہ نمودہ و اربابِ مناہی و مسکرات را بحمایت خود جاگیر زادہ"[12]

دہلی کے مشاہیر کے تذکرے میں درگاہ قلی خاں نے چند بزرگوں اور شاعروں کے نام پیش کیے ہیں' مگر سب سے طویل فہرست اربابِ طرب کی ہے' ان میں بین نواز' طنبورچی' ربابی' سارنگی نواز' قوال' کلاونت' پکھاوجی' ڈھولک نواز' دھمدے نواز' سبوچہ نواز' نقال' بھگت باز' شعبدہ طراز سبھی شامل ہیں' اور انہیں کے ساتھ ساتھ ڈومنیوں اور طوائفوں کو بھی مشاہیر میں شمار کیا گیا ہے۔

چمنی کے بارے میں لکھا ہے: "از مشاہیر دہلی است و بادشاہ رس...... بادشاہ ہم گاہ گاہے یادی فرمایند والتفات می کنند"[13]

---

[9] درگاہِ قلی خاں' مرقعِ دہلی۔

[10] حوالہ بالا

[11] حوالہٗ بالا

[12] حوالہٗ بالا

[13] حوالہٗ بالا

ایک اور طوائف تھی جو اپنے نچلے جسم پر کچھ نہیں پہنتی تھی بلکہ نقش و نگار سے ''ستر پوشی'' کرتی تھی۔ ''ادا بیگم در دہلی مشہور و معروف اند کہ پائجامہ نمی پوشند و بدنِ اسفل را بہ رنگ آمیزی ہائے خامۂ نقاش باسلوب پاجامہ رنگین می کنند'' [۱۳]

زوال کے رنگوں اور حقیقت کے موقلم سے تاریخ کے کینوس پر بنی ہوئی یہ تصویریں دلی (اور برعظیم) کے مسلمانوں کی عمومی حالت کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن اس صورت حال کا دوسرا رخ بھی ہے جو ہمیں اُن بزرگوں کی جدوجہد کی تصویر دکھاتا ہے جو اس اخلاقی زوال سے نبرد آزما تھے۔

ان بزرگوں میں شاہ عبدالرحیمؒ کا خاندان نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اسی خاندان کے بطلِ جلیل ہیں۔ ان بزرگوں کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ حد درجہ بگڑے ہوئے حالات میں بھی اصلاح کے چراغ روشن تھے۔ یہ خاندان ایک تحریک اور ادارہ کا درجہ رکھتا ہے جس نے ایک طرف شمالی ہند میں دینی فکر و علم کو آگے بڑھایا اور یوں کہ شریعت و طریقت کو یک جا کر دیا اور دوسری طرف آزادی کی منزل کو قوم کے قدموں میں لا ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

شاہ عبدالرحیمؒ نے مدرسۂ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ مدرسہ محض درس و تدریس تک محدود نہ تھا' بلکہ کردار سازی کا ایک مرکز بھی تھا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے فرخ سیر کے عہد میں انتقال فرمایا' اور اس یقین کے ساتھ کہ اُن کا سولہ سالہ بیٹا ولی اللہ رشد و ہدایت کے اس چراغ کی لو کو اور بھی فروزاں کر دے گا جسے انہوں نے ہوا کے سامنے روشن کیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ اورنگ زیب کی وفات سے تقریباً چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ یوں جب مسلمانوں کے اقتدار کا سورج ایک اُفق پر غروب ہو رہا تھا تو دوسرے اُفق پر علم و عمل کے سورج نے اپنی اولین کرنوں کی جھلک دکھائی۔ اُس عہد کی تاریکی میں آپ کی ذات روشنی کا مینار بن کر اُبھری۔

شاہ صاحب نے درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ

---

[۱۳] درگاہ قلی خاں' مرقعِ دہلی۔

مسلمانوں کے احیاء کے لیے تنظیمی کام بھی کیا۔ دوسری طرف علما و مشائخ اور امرا و سلاطین کو بقائے مسلمین کے لیے دعوت دی۔ ہم نے ابدالی کے جہاد اور مرہٹوں کی شکست کے سلسلہ میں آنے والے صفحات میں شاہ صاحب کے کردار اور حصہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب نے نجیب الدولہ' پائندہ خاں روہیلہ اور سہارن پور کے فوجدار زماں خاں جیسے اکابرِ سیف و سیاست کی رہبری بھی فرمائی۔ شاہ صاحب کو ظلم سے نفرت تھی۔ انہوں نے مرہٹوں کی شکست تک ہی اپنے منصوبہ کو محدود نہ رکھا' بلکہ اہلِ دہلی کی عزت و ناموس اور ملک کے امن و امان کو بھی اپنے مقاصد کے دائرے میں شامل فرمایا۔ نجیب الدولہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''چوں عبورِ افواجِ شاہیہ بہ دہلی واقع شود' اہتمام کُلّی باید کرد کہ مثلِ سابق پامالِ ظلم نہ گردد۔ اہل دہلی چندیں دفعہ نہب اموال و ہتک ناموس دیدہ اند''[15]

شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے صاحبزادوں نے اُن کے مشن کو آگے بڑھایا۔ شاہ عبدالعزیز' شاہ رفیع الدین' شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی کا مقام ہماری ملی تاریخ میں محفوظ ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے علم' ہمہ دانی اور شستی تقریر کے اعتراف کا سلسلہ سر سید احمد خاں کے آثار الصنادید سے مولوی محمد رحیم بخش کی حیاتِ ولی تک جاری ہے اور دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔[16] شاہ عبدالعزیز عربی کے اچھے شاعر تھے اور اردو زبان و ادب کے بارے میں آپ کے تبحر کا اندازہ آب حیات سے ہوتا ہے جس میں آزاد نے ذوق کی شاعری کے سلسلہ میں آپ کی رہنمائی کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے انگریزی حکومت کے خلاف فضا ہموار کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ جب آپ سے اس باب میں فتویٰ مانگا گیا کہ انگریزی نوکری جائز ہے یا نہیں' تو آپ نے جواب دیا۔

---

[15] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات' مرتبہ خلیق احمد نظامی۔ صفحہ ۶۰۔ مطبوعہ علی گڑھ۔

[16] مولوی رحیم بخش۔ حیاتِ ولی۔ صفحات ۵۹۹ اور ۶۰۰ المکتبۃ السلفیہ لاہور۔ مطبوعہ ۱۹۵۵ء

''اگر در نوکری ارتکاب معصیت کبیرہ متوقع باشد' مانند محاربہ با مسلمین در پلٹن و مانند آوردنِ شراب و گوشتِ مُردار خنزیر در خدمت گاراں' ایں قسمِ روزگار ممنوع است'' [۱۷]

اودھ

دہلی کی مرکزیت کے خاتمہ نے جن ریاستوں کو جنم دیا' اُن میں ہمارے موضوع کے اعتبار سے ریاست اودھ سب سے اہم ہے۔

اودھ اپنے ابتدائی دور ہی سے کمپنی کی گرفت میں آ گیا تھا' جس کا اندازہ باب اول میں بیان کردہ واقعات سے ہوسکتا ہے۔ اودھ کو ہر جگہ آلۂ کار اور کٹھ پتلی حکومت کی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔ انگریزوں نے اُس کے مالیہ کو تباہ کر کے اپنی فوجوں کو برقرار رکھا۔ جب چاہا اُس کے علاقوں کو ہتھیا لیا' یا مالگزاری سے اپنا حصہ وصول کر لیا۔ اودھ کی ریاست کمپنی کا ''خزانہ'' تھی۔ نواب وزیر الدولہ کو گورنر جنرل نے بادشاہ بنا دیا۔ مقصد محض یہ تھا کہ دہلی کے رہے سہے اقتدار کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ ''شاہِ اودھ'' کی تخت نشینی کے سلسلہ میں کلکتہ گزٹ کی ایک خبر کا اقتباس پیش کیا جا چکا ہے۔ اُس خبر میں تاج پوشی کا ذکر پڑھ کر یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے لڑکیاں گڈے گُڑیا کی شادی رچا رہی ہوں۔ کمپنی نے بھی یہ سوانگ رچایا مگر دلچسپی کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفاد کے لیے' رپورٹ کا بقیہ حصہ درج ذیل ہے:

''۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو صبح ہوتے ہی تقریباً ساٹھ افسر ریذیڈنسی میں جمع ہو گئے۔ ریزیڈنٹ جنرل مارشل اور دوسرے اَفسروں کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر وزیر کے محل فرح بخش کی طرف روانہ ہوئے...... محل پہنچ کر مسٹر مونکٹن' جنرل مارشل اور کچھ دوسرے (عہدہ دار) اُتر پڑے اور انہوں نے ہز ایکسلنسی کو گلے سے لگا لیا...... ناشتہ کے بعد یہ لوگ بارہ دری کے لیے روانہ ہوئے۔ ہز ایکسلنسی تخت کے پیچھے کے دروازے سے داخل ہوئے۔ پہلی ہی سیڑھی پر وزیر نے انہیں ایک تاج پیش کیا جس میں نہایت قیمتی

---

[۱۷] مجموعۂ فتاویٰ عزیزی۔ جلد دوم ص ۱۱۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ ۱۳۱۴ھ۔

ہیرے اور جواہر لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تاج پہن لیا اور مسٹر مونگٹن نے انہیں مبارک باد دی اور اودھ کے بادشاہ کی حیثیت سے انہیں سلام کیا۔ پھر تیس ہزار روپے کی قیمت کے موتی اور جواہر دیکھنے والوں پر سے نچھاور کیے گئے جن میں سے بہت سے "ہماری معزز خواتین نے اٹھائے"۔ [۱۸]

۱۸۵۶ء میں انتزاعِ سلطنت اودھ کی وجہ بدانتظامی قرار دی گئی تھی، لیکن جیسا کہ پہلے باب میں عرض کیا گیا ہے، اس بدانتظامی کی ذمہ دار کمپنی اور اس کا ایجنٹ یعنی اودھ کا ریزیڈنٹ تھا۔ دیسی ریوستوں کے ساتھ کمپنی کے تعلقات کی تاریخ اگر تاریک ہے تو اودھ کے سلسلہ میں تاریک تر ہے۔ سر ہنری لارنس جیسے مرتبہ کے سیاستدان اور مدبر نے اس کا اعتراف کیا ہے اور اس کے اعتراف میں کرنل سدر لینڈ بھی شامل ہے۔ پانی کر کے حوالہ سے ہنری لارنس کی رپورٹ کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

> The facts furnished by every writed on Oudh all testiry to thc same point, that British interference with that province has been as prejudicial to its court and people as it has been disgraceful to British name. To quote the words of Col. Sutherland____, there is no state in India with whose government we have interfered so systematically and so uselessly as with that of aside.[۱۹]

یہ اقتباس اودھ کے حالات کا اجمالی لیکن نہایت جامع تجزیہ ہے۔ انگریزوں کی یہ دخل اندازی منظّم تھی اور اودھ کے عوام اور حکمرانوں کے ساتھ ظالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود کمپنی کے لیے باعث شرم قرار دی گئی۔

مرہٹے، روہیلے اور دوسری ملکی طاقتیں

یہ مرہٹہ خطرہ ہی تھا جس نے عالمگیر کو دکن کی جنگوں پر مجبور کیا۔ اورنگزیب عالمگیر کے بعد مرہٹے اپنے پہاڑی اڈوں سے نکل آئے اور تاریخ کے دھارے پر بہتے ہوئے

---

۱۸ کلکتہ گزٹ

۱۹ Panikar, K.M., (The) Evolution of British Policy towards Indian States, pp. 66.67, 1929.

شمالی ہند تک پہنچ گئے۔ ۱۷۴۰ء میں پیشوا اپنے لشکر کے ساتھ دہلی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اُس وقت مغل شہنشاہیت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد پچیس سال [۲۱] کے اندر برعظیم کی سیاست میں عظیم اور دُور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مرہٹوں نے مرہٹہ راج کے لیے ہر چیز داؤ پر لگا دی۔ انہوں نے پنجاب فتح کر لیا لیکن ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹہ راج کا منصوبہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر گیا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے محرکات میں امام الہند شاہ ولی اللہؒ کی دعوت و تبلیغ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ صاحب کے ذخیرۂ خطوط میں سے ان کے سیاسی خطوط کو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کا دوسرا خط ''بنام شاہے'' احمد شاہ ابدالی کے نام ہے۔ یہ تفصیلی خط ہندوستان کے مسائل، خطرات اور مسلمانوں کے سیاسی زوال کا آئینہ ہے۔ شاہ صاحب نے مذہب اور علومِ دینی سے مسلمانوں کی بے تعلقی، اقتصادی توازن کے فقدان، خالصہ کے علاقوں کے محدود ہونے، خزانہ کی قلت، جاگیرداروں کی کثرت، اجارہ داری اور افواج کو وقت پر تنخواہ نہ ملنے کو، ابتری اور انتشار کے اسباب کے طور پر بیان فرمایا ہے اور اس کے بعد مرہٹوں کے فتنہ کا ذکر کیا ہے جس میں اُن کی قوت کا تجزیہ بھی شامل ہے اور اس فتنہ کو مٹانے کی دعوت بھی۔

''اگر غازیانِ اسلام کمر ہمت بر بندند دو سہ صف آنہا بشکنند۔ دراصل قوم مرہٹہ قلیل اند و ملحق بہ ایں طائفہ کثیر...... فتنۂ قومِ مرہٹہ در ہندوستان اعظم فتنہ ہا است'' [۲۰]

برعظیم میں مغل بادشاہ علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ یا کوئی اور مقامی قوت اس فتنہ کو ختم نہیں کر سکتی تھی، اسی لیے حضرت شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو اس کا فرض یاد

۲۰۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات۔ صفحہ ۸، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۹ء

۲۱۔ حوالہ بالا صفحہ ۱۱

دلایا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ جاگیرداروں کو اپنی جاگیروں میں عمل دخل حاصل نہ تھا' اور حالت یہ تھی کہ:

''از سلطنت بجز نامی باقی نماند...... بالجملہ ایں جماعتِ مسلمین قابل ترحم اند۔ دریں وقت ہر عملے دخلے کہ درسرکارِ پادشاہی جاری است بدستِ ہنود است...... ہر دولت وثروتے کہ ہست درخانہائے اینہا جمع شدہ و ہر افلاسے وتخمصۂ کہ ہست بر مسلمانان [۲۱]

''غیر از ملازمانِ آنحضرت موجود نیست۔ لاجرم برآں حضرت فرضِ عین است قصدِ ہندوستان کردن و تسلطِ کفارِ مرہٹہ برہم زدن و ضعفائے مسلمین را کہ در دستِ کفار اسیر اند' اخلاص فرمودن'' [۲۲]

بہر حال مرہٹے ۱۷۶۱ء کے دس سال بعد ہی دوبارہ ایک عسکری طاقت بن گئے' اس نکتہ پر سرکار' تارا چند اور بعض دوسرے مؤرخوں نے بڑا زور دیا ہے' لیکن اس کوشش میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مسئلہ کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ مرہٹوں میں پھر مرکزیت پیدا نہ ہو سکی۔ پانچ خود مختار مرہٹہ ریاستیں وجود میں آئیں۔ پونا (پیشوا)' ناگپور (بھونسلا)' بڑودا (گیکوار)' گوالیار (سندھیا) اور اندور (ہلکر)۔

ان ریاستوں کی کوئی مشترک پالیسی نہیں تھی۔ سندھیا اور ہلکر مل کر برعظیم کے مستقبل کو بدلنے کی کوشش کر سکتے تھے' لیکن مرہٹوں میں اعلیٰ سیاسی سوجھ بوجھ کا فقدان تھا۔ وہ لالچی اور ہتھیا لینے والے تھے۔ [۲۳]

مرہٹے مہم پسند تھے' جنگجو تھے لیکن سیاسی بصیرت کے فقدان کی وجہ سے وہ کوئی ایسی پالیسی نہیں بنا سکے جو ان کے مستقبل بعید کے لیے سود مند ہوتی یا برعظیم کے مفادات کو پورا کرتی۔ مرہٹہ سرداروں نے فورٹ ولیم کلکتہ میں کمپنی کی حکومت کو نواب

---

۲۲ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات' صفحہ ۱۱ اور ۱۲

۲۳ ڈاکٹر یوسف حسین۔ تاریخ ہند۔ عہدِ جدید صفحہ ۱۲۹

بنگال کے خلاف جنگ میں اپنی امداد کی پیش کش کی تھی۔ اسی طرح وہ ٹیپو کے خلاف نظام کی طرح انگریزوں کے حلیف بن گئے اور برعظیم کی تحریک آزادی کے اولین مرحلے کو ناکام بنا دیا۔

اگر مرہٹے پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست نہ کھاتے تو بھی ان کے کردار اور تاریخ کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کے لیے نئے دور کا عنوان نہیں بن سکتے تھے۔ اُن کے اپنے نظام میں رخنے پڑ چکے تھے۔ شیواجی کے گھرانے سے وفاداری اُن کی وحدت کا ایک وسیلہ تھی۔ پیشوا کے ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی نے اس وسیلہ کو بھی ختم کر دیا۔ پھر مرہٹوں کا اپنا علاقہ غریب تھا اور اس کے قدرتی وسائل محدود تھے۔ لوٹ مار کو انہوں نے اپنے مالیہ کی بنیاد بنا لیا تھا۔ عموماً ایسی جماعتیں تہذیب وتمدن کے مظاہر کو تباہ کر سکتی ہیں، کسی دور میں انسانی ارتقا کی رفتار کو کچھ عرصہ کے لیے روک سکتی ہیں، لیکن قائم رہنے والی حکومت قائم نہیں کر سکتیں۔ مرہٹوں نے جب علی وردی خاں کے عہد میں بنگالہ پر حملہ کیا تھا تو انہوں نے ہندو مسلمانوں پر یکساں مظالم کیے تھے۔ اسی طرح سکھوں، جاٹوں اور راجپوتوں سے بھی وہ تعلقات استوار نہ کر سکے۔ مرہٹوں نے راجپوتانہ اور جاٹوں کے علاقہ کو بھی اپنی غارت گری کا ہدف بنایا، کیونکہ یہ دونوں طاقتیں اجمیر اور آگرہ پر اُن کے قبضہ کے راستہ میں رکاوٹ کا درجہ رکھتی تھیں۔ اسی طرح رگھوناتھ راؤ اور ہلکر نے دوآبہ کے علاقہ کو لوٹا۔ اس لوٹ مار کو عسکری کارناموں کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

سکھوں اور جاٹوں کے ساتھ مرہٹوں کے تعلقات کے تجزیہ میں اُس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سکھوں اور جاٹوں کا کردار اور ان کی تنظیم بھی مرہٹوں سے مختلف نہ تھی۔

سکھوں کے سیاسی عزائم کا اظہار مغلوں کے عہدِ قوت ہی میں ہو چکا تھا۔ جہانگیر کے دور ہی سے وہ محض ایک مذہبی گروہ نہیں رہے تھے بلکہ اُن کی عسکری ذہنیت سامنے آنے لگی تھی۔ گرو ارجن نے جہانگیر کی ناراضگی کے علی الرغم شہزادہ خسرو کو پناہ دی اور

اسے اس جرم کی سزا دی گئی۔ اسی طرح تیغ بہادر نے اورنگ زیب کے خلاف کشمیر میں بغاوت کی تنظیم کی اور اُسے بغاوت کے جرم میں قتل کرا دیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتح اور مرہٹوں کی شکست کی بنیادوں پر سکھوں نے اپنے اقتدار کی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی اور مختصر مدت کے لیے وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن پنجاب میں ان کی حکومت ایک بے اصول ٹولے کی لوٹ کھسوٹ کا نام تھی۔ "سکھا شاہی" کی اصطلاح آج بھی بدنظمی کے مُرادف ہے۔ یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ سکھ بھی مرہٹوں کی طرح اپنی بار بار کی شکستوں سے بددل نہیں ہوتے تھے۔ مُغلوں نے اپنے عہدِ زوال میں بھی انہیں کئی بار شکست دی، مگر سکھ موقع پاتے ہی دوبارہ لوٹ مار کی قوت حاصل کر لیتے۔ اُن کے مزاج اور مظالم کا اندازہ سیر المتاخرین کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ "زنہائے حاملہ را شکم دریدہ جنین را کشیدہ می کشتند" [۲۴]

سکھوں کے فتنہ و فساد کا ذکر حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ مولوی ثناء اللہ سنبھلی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں دل کو ایک سخت صدمہ پہنچا ہے۔ پچھلے مہینے کفار سکھ تھانیسر کے قلعہ پر قابض ہو گئے اور انہوں نے خوب قتل و غارت کیا۔ [۲۵]

سید احمد شہید کی تحریک اگرچہ بنیادی طور پر مغربی سامراج کے خلاف تھی لیکن سکھوں کی بڑھتی ہوئی چیرہ دستی سے پنجاب اور بِرِ عظیم کے شمال مغربی حصہ کے مسلمانوں کو بچانے کے لیے انہیں سکھوں کے خلاف جہاد کرنا پڑا۔

جاٹوں کا ذکر پہلے باب میں آ چکا ہے۔ جاٹوں نے اپنی تنظیم اُس عہد میں کی جب اورنگ زیب دکن کی جنگوں میں مصروف تھا۔ جاٹ کسانوں کو عسکری تربیت دی گئی اور اُنہیں اسلحہ دیئے گئے۔ پھر اس گروہ نے سرکاری فوجوں سے لڑنا اور ٹکرانا شروع کیا۔ جاٹ سیاسی طور پر زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ جاٹوں میں نہ اعلیٰ قیادت تھی اور نہ ایسی

---

۲۴ سیر المتاخرین بحوالہ رئیس احمد جعفری۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ ص ۶۷ طبع دوم لاہور ۱۹۵۷ء

۲۵ مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط: مترجمہ و مرتبہ خلیق انجم ص ۱۳۴۔ دہلی ۱۹۶۲ء۔

عسکری قوت کہ وہ ایک بڑی طاقت بن سکتے۔ ان کی لوٹ مار کا دائرہ دہلی اور آگرہ کا درمیانی علاقہ' اور آگرہ ان کا مرکز تھا۔ اس علاقے میں انہوں نے گڑھیاں بنا لی تھیں۔ یہ گڑھیاں یا قلعے ان کے لوٹے ہوئے سامان کا ذخیرہ بھی تھیں اور لوٹ مار کا اڈہ بھی۔ عام طور پر ان کی تعمیر گھنے جنگلوں میں کی جاتی تھی تا کہ دشمن کو کوئی فوجی سہولت اور فائدہ حاصل نہ ہو سکے۔ جاٹوں کے مظالم اور کردار کا مطالعہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے آئینہ میں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں ''بنجارا نامہ'' کی فضا اور بعض تفاصیل میں جاٹوں کے طرزِ حیات کا دخل ہے۔ میر صاحب کی شاعری میں بھی سکھوں اور مرہٹوں کے ساتھ ساتھ جاٹوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

روہیلوں کا ذکر پہلے باب میں آ چکا ہے اور ان کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس عہدِ زوال میں شمالی ہند میں صرف روہیلے ہی عیش و عشرت کی خرابیوں سے بڑی حد تک دور تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں روہیلوں کی تنظیم اور ریاست کا وجود میں آنا برعظیم کی مسلمان (قوم) کی قوتِ تخلیق کا ایک پہلو ہے۔ روہیلوں کے دورِ تشکیل میں مسلمانوں کی زندگی تضاد کا مجموعہ تھی۔

بزرگوں کے مزارات کی زیارت اور طوائفوں کے کوٹھوں کے چکر۔ رِندی اور ''مذہبیت'' دونوں چیزیں ایک مرکز پر آ گئی تھیں۔ صورت حال شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں یہ تھی کہ

''اند کے از زماں نہ گزرد کہ قومے شوند کہ نہ اسلام را دانند نہ کفر را''[۲۶]

ان حالات میں شمالی ہند میں روہیلہ حکومت اور جنوب میں سلطنتِ خداداد میسور کا قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے' کیونکہ یہ دونوں حکومتیں اس حقیقت کی شاہد بن گئیں کہ مسلمانوں کی انفرادیت ختم نہ ہو گی۔

۱۷۱۴ء میں نواب محمد خاں بنگش (غضنفر جنگ) نے مالوہ اور الٰہ آباد کی صوبہ داری کی آمدنی سے قائم گنج کے قریب نیا شہر آباد کیا' یہی فرخ آباد تھا۔ صفدر جنگ نے شروع ہی سے اس ریاست کو اپنے لیے خطرہ سمجھا اور معرکہ آرائی شروع کر دی۔ محمد خاں کا بیٹا

۲۶۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۱۲

قائم خاں میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ پھر محمد خاں کے بھائی نواب احمد خاں بنگش نے جاٹوں اور صفدر جنگ کو کئی بار شکست دی اور نتیجتاً شجاع الدولہ نے احمد خاں سے صلح کر لی اور اسے اپنا بھائی بنا لیا۔ مرہٹوں اور درانیوں کے حملوں کے وقت فرخ آباد ایک جائے پناہ سمجھا جاتا تھا۔

دوسری طرف روہیل کھنڈ میں پٹھانوں کا مرکزی مقام آملہ ضلع بدایوں تھا۔ اس ریاست کا بانی علی محمد خاں تھا اور بجنور تک کا علاقہ اس کے زیرنگیں تھا۔ نجیب آباد میں نجیب الدولہ نے اپنی ریاست قائم کی۔

ان پٹھانوں میں کردار تھا' حوصلہ تھا مگر ان کے خلاف موانع بہت شدید تھے۔ ۱۷۴۹ء میں علی محمد خاں کے انتقال کے بعد ایک ریاست کئی ریاستوں میں بٹ گئی۔ حافظ رحمت خاں نے مرکزیت پیدا کرنے کی بڑی کوشش کی' مگر اس کی شہادت کے ساتھ یہ ورق بھی اُلٹ گیا۔

روہیلوں کو نواب وزیرانِ اودھ کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے بھی ہمیشہ خطرہ سمجھا۔ اودھ کی حکومت ایک ''کٹھ پتلی'' حکومت تھی' اس لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ روہیلہ سلطنت کا خاتمہ انگریزوں کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔

روہیلوں کی غیرت اور حمیت ایک بار پھر برعظیم میں مسلمانوں کے اقتدار کے خواب کو حقیقت بنانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک طرف انہوں نے بعض علاقوں کو آزاد کرا لیا' دوسری طرف نجیب الدولہ نے ابدالی سے خط و کتابت کی۔ اُس کی عسکری قیادت اور صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ مظفر نگر کے قریب مہینوں مرہٹوں سے مقابلہ کرتا رہا' یہاں تک کہ کمک آ گئی۔

عسکری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ روہیلے' انتظامی امور کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ جان فارسٹر نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ روہیلوں نے صرف اپنی تنظیم ہی نہیں کی' بلکہ اپنے علاقوں میں معاشی خوش حالی اور اطمینان و امن بھی پیدا کر دیا۔[۲۷]

---

۲۷ J, Forster, From Bengal to England, pp. 98-100, 1793.

اپنے علاقہ کے علاوہ دہلی پر بھی روہیلوں کا خاصا اثر تھا۔ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کی خانقاہ ان کا مرکز تھی۔ اس عہد کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ کرنے والوں نے اکثر تصوف کو بے کسی اور مجبوری کی پیداوار کہا ہے۔ یہ تجزیہ نیم صداقت ہے۔ اگر ایک طرف محمد شاہ اپنی نا آسودگیوں کا شکار ہو کر فقیروں کی صحبت میں بیٹھنے لگا' تو دوسری طرف صوفی مسلمانوں کی آزادی کی خاطر جدوجہد کے منصوبے بنا رہے تھے' مسلمانوں کی مختلف طاقتوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کر رہے تھے اور مسلمان سرداروں کو ان کے فرائض یاد دلا رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ ایسے ہی بزرگ تھے۔ عوام پر ان کے اثر اور وسیع دائرۂ اقتدار سے بادشاہ اور اس کے امیر وزیر خائف رہتے تھے۔ نجف خاں کی سازش سے حضرت مظہر جانجاناں کی شہادت بنیادی طور پر ایک سیاسی واقعہ ہے' اگرچہ اس میں مذہبی اختلاف کا دخل بھی تھا۔

دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ بنگالہ اور دوسرے علاقوں کے سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کردار کا واقعاتی پہلو گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ کمپنی کی بے اصولیاں' عہد شکنی اور اقتصادی تشدد اتنا نمایاں ہے کہ اس کے تجزیہ کے لیے کسی گہری تاریخی یا سیاسی بصیرت کی ضرورت نہیں۔ یہ کمپنی کا المیہ ہے۔

کمپنی کے عہدہ دار ''ڈریک' واٹس اور ہال ویلس کی طرح کے لوگ خوانچہ فروش اور بساطی حیثیت کے تاجر تھے'' ''حیثیت'' سے مراد ان کی تجارتی حیثیت نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ لوگ ''اس بڑے گروہ کے مفاد کا بھی خیال نہیں کرتے تھے جس کے وہ رکن تھے''[۲۸] کمپنی کو دہری اجارہ داری حاصل تھی' ہندوستان میں بھی اور انگلستان میں بھی' لیکن کمپنی کے حکام نے اسے ''اجارہ در اجارہ'' بنا دیا۔ ہر زیادہ منفعت بخش تجارت کو یہ لوگ ذاتی طور پر اپنا لیتے اور کمپنی کے ضابطوں کی کوئی پروا نہ کرتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نہایت بے قاعدہ اقتصادی تشدد ان کا طریقۂ کار تھا۔ کاری گروں کی مصنوعات کی قیمت کا تعین من مانے طور پر کیا جاتا۔ اس تشدد نے ملکی صنعت کو زوال کا نشانہ بنا دیا۔

---

۲۸ عبداللہ یوسف علی۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ صفحہ ۷ اور ۸' ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد۔ ۱۹۳۶ء

غلام حسین خاں کمپنی کے اعمال اور پالیسیوں کا تجزیہ کرنے والے پہلے مورخ ہیں۔ ان کے تجزیہ کو عبداللہ یوسف علی نے اپنی کتاب ''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ'' میں نقل کیا ہے۔ یہ تجزیہ مسئلہ کے متنوع اور مختلف پہلوؤں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ کمپنی کے حکام نے صرف برِعظیم کے آداب' رسم و رواج اور لوگوں کی سیرت کو سمجھنے میں ہی کوتاہی نہیں کی بلکہ بلا سمجھے ان چیزوں کے بارے میں ''گستاخانہ اظہار'' کو اپنا شیوہ بنایا۔ نااہل لوگوں کا اعلیٰ عہدوں پر تقرر' عوام سے دوری' گورنر جنرل کی کونسل کی کارروائی کا سست اور طویل ہونا' ملک کی تجارت پر قبضہ اور عوام کو ذرائع معاش سے محروم کر دینا' کاشتکاروں پر زمینداروں کے مظالم میں تعاون' اپنے ہم قوم اور ادنیٰ ترین متوسلین کی رعایت' کھلے دربار کی جگہ خانگی طور پر فیصلے کرنا' کلکتہ کی عدالتِ عالیہ کے ضوابط و قواعد سے ناواقفوں اور غریبوں کو نقصان پہنچانا۔[۲۹] یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر کمپنی کی حکومت کی عمارت تعمیر کی گئی۔

کمپنی نے اپنے علاقوں کے عوام کی بہبود کے لیے کبھی کوئی معقول کام نہیں کیا۔ ۱۷۷۰ء اور ۱۷۸۹ء میں بنگال دوبار قحط کی لپیٹ میں آیا۔ ۱۷۷۰ء کے قحط میں اُس عہد کے انگریز مؤرخوں کے تخمینہ کے مطابق بنگال کی ایک تہائی آبادی (کوئی ایک کروڑ افراد) موت کا شکار بن گئی' لیکن ''اس قحط کے زمانے میں بھی مالگزاری کے مطالبات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ کمپنی کے گماشتوں نے اپنی فوجی اور شہری ضروریات کے لیے اضلاع سے غلہ خرید کر حاصل کیا۔''[۳۰] اسی طرح ولیم ہکی نے ۱۷۸۹ء کے قحط کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ کلکتہ میں بے کس لوگوں کا ایک دریا اُمڈ آ رہا تھا۔ نعشیں اور سسکتے ہوئے لوگ جابجا سڑکوں پر پڑے ہوئے تھے۔[۳۱]

کمپنی کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں کی اخلاقی سطح کیا تھی؟ اس سوال کا جواب صرف لارڈ کلائیو اور وارن ھیسٹنگز کی زندگی سے مل جائے گا۔ کلائیو نے امی چند کے ساتھ مل کر سازش کی اور پھر جعلی دستاویز تیار کر کے امی چند کو دھوکہ دیا۔ کہا جاتا ہے

---

۲۹ حوالہ بالا۔ صفحہ ۴۳ تا ۴۵

۳۰ ڈاکٹر یوسف حسین۔ تاریخ ہند۔ عہدِ جدید' ص ۱۲۹۔

۳۱ عبداللہ یوسف علی۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ' ص ۹۔

کہ لٹیرے اپنے ''اخلاقی ضوابط'' کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور اپنے ''قانون'' کے مطابق ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیتے۔ کمپنی کے عہدہ دار اس معیار پر بھی پورے نہیں اُترتے' وارن ھیسٹنگز کے مظالم اور کارناموں پر ایک زندہ تبصرہ برک کی یادگار اور تاریخی تقریر ہے۔ فاکس نے اُس کے بارے میں پارلیمنٹ میں سخت تقریر کی اور قانونی بل پیش کیا جو دارالامراء میں روک لیا گیا تھا۔ مگر بعد میں پٹ نے اپنی وزارت کی تشکیل کے بعد بورڈ آف کنٹرول قائم کیا۔ ہیسٹنگز انگلستان واپس بلا لیا گیا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا۔

کمپنی کے حکام کی پالیسی کیا تھی؟ اس کا جواب ہے ''ملک گیری'' نئے علاقوں کو فتح کرنا اور روپیہ بٹورنا اور وہ بھی اس حد تک کہ خود کمپنی کے اربابِ حل وعقد اور انگلستان کا ضمیر چلا اٹھے۔

یہ جواب ہمارا نہیں ہے بلکہ لارڈ ولزلی کا ہے۔ ولزلی نے لیڈی این برنارڈ (Lady Anne Barnard) کو خط میں لکھا:

> I will heap kindgdoms upon kingdoms, victory upon victory, revenue upon revenue, Iwill accumulate glory and wealth and power until the ambition and advice of my masters shall ory mercy.[۳۲]

---

۳۲ Panikar, The Evolution of British Policy towards Indian States, p. 38.

❀ اردو شاعری میں سیاسی و تاریخی واقعات۔ ۱۷۰۷ء سے پہلے

❀ میر جعفر زٹلی سے مظہر جانِ جاناں تک

❀ سودا، میرؔ درد اور اُن کے شاگردوں کا عہد

❀ مہاجر شعرائے دہلی، دبستانِ لکھنؤ کا آغاز اور نظیر اکبر آبادی

❀ دلی کا دوسرا عہدِ زرّیں۔ شاہ نصیر سے ۱۸۵۷ء تک

❀ سلسلہ ناسخ، آتش، مصحفی، جرأت...... دبستان لکھنؤ۔ ۱۸۵۶ء تک

اُردو شاعری میں سیاسی و تاریخی واقعات ۱۷۰۷ء سے پہلے

۱۷۰۷ء سے ہمارے مطالعہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات ایک طرف تو برعظیم کی تاریخ میں ایک ایسے موڑ کا درجہ رکھتی ہے جب ہمارے سیاسی اقتدار کا سورج نصف النہار پر پہنچنے کے بعد مغرب کی طرف سفر کرنے لگا اور دوسری طرف ۱۷۰۷ء کے بعد اردو، بازاروں اور محفلوں سے گزر کر شعر و سخن کی دنیا میں ذریعۂ اظہار بننے لگی تھی۔ لیکن اس سے پہلے بھی اردو شاعری کے آئینہ خانے میں ہمیں سیاسی، تاریخی، تمدنی اور ثقافتی واقعات و کوائف کے ساتھ مختلف ادوار کے افکار کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ تاریخ کے وسیع تر مفہوم میں کسی قوم یا گروہ کے اندازِ فکر اور طرزِ زیست کا مطالعہ شامل ہے۔ تاریخ اپنی بلند تر سطح پر تمدن و ثقافت کے سرچشموں اور ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم اختصار کے ساتھ ۱۷۰۷ء سے پہلے کے حالات کا جائزہ اردو شاعری کے آئینے میں لیتے چلیں۔ اس سے بعد کے رجحانات کی تفہیم میں بھی مدد ملے گی۔ خاص طور پر دکنی شاعری کے مطالعہ سے ایک نہایت اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے "قومیت کے نظریہ" کا سوال۔

بعض ادبی مؤرخوں نے ہماری شاعری کی روایت کا آغاز پرتھی راج راسا سے کیا ہے لیکن یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کی تصنیف نہیں ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم نے اس باب میں مستحکم دلیلیں پیش کی ہیں۔ مثلاً بعض بیانات غلط ہیں جیسے شہاب الدین کے بھائی کا نام یا اس میں ان آتشیں اسلحوں کا ذکر ملتا ہے جن کا رواج کئی صدیوں بعد ہوا۔[1]

امیر خسرو سے جو کلام منسوب ہے اس پر ہمارے محقق لسانی اعتبار سے گفتگو کر

---

[1] حافظ محمود خاں شیرانی۔ پنجاب میں اردو صفحہ ۸۔۱۶۷، طبع چہارم، لاہور۔

سکتے ہیں، یا امیر خسرو کی شخصیت اور جامعیت کے سلسلہ میں اسے موضوع بحث بنایا جا سکتا ہے، لیکن ان کے ریختہ میں ہمارے نقطۂ نظر سے کوئی قابل ذکر مواد موجود نہیں۔ کبیر داس[۲] کی شمولیت بھی لسانی اعتبار سے بحث طلب ہوسکتی ہے کہ ان کی زبان کو اُردو کے دائرہ میں شامل کیا جائے یا نہیں۔ کبیر نے اپنی بولی کو اکثر مقامات پر ''پوربی'' کہا ہے لیکن اس میں ''برج بھاشا' کھڑی بولی' پنجابی' راجستھانی سبھی کے الفاظ ملتے ہیں''[۳] اسی طرح ان کی زبان میں بہاری اثرات بھی موجود ہے۔ مجموعی طور پر کبیر کی زبان اور اسلوب کو اُردو کے ارتقاء کا ایک مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کبیر کی شاعری میں تاریخی واقعات کا راست ذکر تو نہیں ملتا' لیکن بعض دوہوں میں ان واقعات کا احساس اور زندگی کے حقائق کی سنگینی پس منظر کے طور پر نظر آتی ہے۔

ہیرا تہاں نہ کھولیے جہاں کھوٹی ہے باٹ
کَس کر باندھو گاٹھری' اُٹھ کر چالو ہاٹ

❀❀❀

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوئی پٹ بھیتر آئی کے ثابت گیا نہ کوئے

کبیر کی شاعری کا مطالعہ ایک اور اعتبار سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے' اور وہ ہے ان

۲۔ کبیر کے مستند حالات کی تدوین وترتیب کا کام اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ ان کی زندگی افسانہ وافسوں کے پردوں میں چھپ گئی ہے۔ آئین اکبری میں ان کا ذکر سنین کے بغیر پیش کیا گیا ہے اور محض مسلمانوں اور ہندوؤں کی عقیدت کے بیان اور وفات کے واقعہ تک محدود ہے۔ (آئین اکبری حصہ دوم صفحہ ۸۲۔ نولکشور پریس ۱۸۶۹ء) وسکٹ نے سالِ پیدائش ۱۳۹۸ء اور سالِ وفات ۱۵۱۸ء بتایا ہے (منوہر لال زتشی۔ کبیر صاحب۔ صفحہ ۵۲۔ ہندوستانی اکادمی الہ آباد ۱۹۳۰ء) حکیم شمس اللہ قادری کے بیان میں سالِ وفات تو یہی ہے مگر سالِ پیدائش مختلف ہے۔ ان کی تحقیقات کے مطابق کبیر صاحب ۸۴۰ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ (شمس اللہ قادری۔ اُردوئے قدیم۔ صفحہ ۲۶۔ نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۰ء) یعنی عیسوی تقویم کے مطابق وہ ۱۴۳۶ء یا ۱۴۳۷ء میں پیدا ہوئے۔

۳۔ پنڈت منوہر لال زتشی۔ کبیر صاحب صفحہ ۱۳۰۔

کی شاعری اور فکر پر اسلام کا اثر۔ کبیر موحد ضرور تھے' لیکن مسلمان نہیں تھے۔ اس کی شہادت کے طور پر ان سے منسوب بہت سے دوہے پیش کیے جا سکتے ہیں' اور خاص طور پر یہ بالمقابلِ ذکر ہے کہ وہ تناسخ (آواگون) کے قائل تھے لیکن اسلامی تعلیمات نے انہیں ایک طرف توحید کے تصور تک پہنچا دیا اور دوسری طرف وہ انسانی مساوات سے آشنا ہوئے۔ ذات پات کے خلاف اُن کا شاعرانہ احتجاج اسلام کے اُسی ابرِ کرم کی چند بوندوں کا عطیہ ہے جو ہندوستان پر صدیوں برسا ہے اور جس کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں۔ ذات پات کے بارے میں کبیر کے دوہے بہت مشہور ہیں اور انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ توحید سے متعلق ایک دوہا نقل کیا جاتا ہے۔

صاحب میرا ایک ہے دوجا کہا نہ جائے
دوجا صاحب جو کہوں صاحب کھرا رسائے

کبیر کے افکار پر اسلام کے اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے پنڈت منوہر لال زتشی نے لکھا ہے:

''کبیر صاحب پر کیا موقوف ہے' اسلام کے عقائد اور اسلام کی مثال کا اثر ہندوؤں پر شمالی ہند میں عالمگیر تھا۔ مسٹر مہادیو گوبند رانا ڈے کی رائے ہے کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں کے بعض رسم و رواج میں جو بیّن فرق نظر آتا ہے' خصوصاً شودروں اور اچھوتوں کے ساتھ شمالی ہند میں جو کم سختی برتی جاتی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں اسلام کا اثر گہرا اور دیرپا تھا۔[۴]''

قطبن بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام اور سولہویں صدی عیسوی کے آغاز کے شاعر ہیں۔ ان کے دور اور ان کے سرپرست کے بارے میں محققین میں اختلاف ہے' لیکن حافظ محمود خاں شیرانی کا تحقیقی قیاس یہ ہے کہ ان کا سرپرست ''علاؤ الدین شاہ والئی بنگالہ ہوگا جس نے ۱۴۹۳ء (۸۹۹ھ) سے ۱۵۱۸ء (۹۲۵ھ) تک حکومت کی

---

۴ پنڈت منوہر لال زتشی' کبیر صاحب ص ۶۸

ہے‘‘۔۵ قطبن کی مثنوی مروگاوتی‘ پدماوت کے انداز کے ایک عشقیہ قصے پر مبنی ہے لیکن اس میں شاہ حسین کا حوالہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

شاہ حسین آہے بڑا راجہ چھتر رسنگاسن ان کو چھاجا

پنڈت اوبدھ دنت سیانا پڑھے پوران ارتھ سب جانا

عہد مغلیہ سے پہلے ادبی ذریعۂ اظہار کے طور پر شمالی ہند میں اُردو زبان نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔ اُردو عوامی سطح پر اس درجہ مقبول ہو چکی تھی کہ

’’جنگ پانی پت ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں جب بابر نے سلطان براہیم لودھی کو شکست دی تو کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے۔

نو سے اوپر تھا بتیسا پانی پت میں بھارت دیسا

اُٹھئیں رجب سکر وارا ابر جیتا‘ براہم ہارا[۶]

دکھنی ادب کا جائزہ لینے سے پہلے افضل جھنجھانوی کا ذکر مناسب ہوگا۔

افضل کا سال وفات ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۶ء) ہے۔[۷] افضل کے بارہ ماسہ میں شوہر کی جدائی میں ایک عورت کی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ بارہ ماسہ اس امر کی شہادت ہے کہ عورت کی زبانی عشقیہ کیفیات و جذبات کی عکاسی اس عہد میں شمالی ہند اور دکن دونوں کے شعری ادب کی مشترک خصوصیت ہے اور اس کا سرچشمہ ہندی شاعری ہے۔ برِعظیم کی پرانی شاعری میں عشقیہ جذبات کا اِظہار اکثر عورت کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہاشمی کے علاوہ کسی اور دکھنی شاعر کی شاعری کو ریختی کہنا شاید مناسب نہیں‘ کیونکہ ریختی ہمارے ادب میں مختلف اصطلاحی معانی رکھتی ہے اور ایک ایسی جداگانہ صنف ہے جو اپنی خصوصیات کے ساتھ بعد کی چیز ہے‘ جس پر آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔

افضل کے بارہ ماسہ کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکے گا۔

---

۵ حافظ محمود خاں شیرانی۔ پنجاب میں اردو‘ ص ۲۱۲۔

۶ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ فارسی پر اردو کا اثر‘ ص ۳۲۔ طبع اول ۱۹۵۲ء

۷ حافظ محمود خاں شیرانی۔ پنجاب میں اردو

نہ مجھ کو سوکھ دن، نہ نیند راتا　　برہوں کی آگ میں سینہ جراتا
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے　　کہ جس کی آگ میں سبھ جگ جلا ہے
وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے　　برہوں کی آگ تن من میں لگی ہے

بارہ ماسہ یا ''دوازدہ ماہ'' میں برعظیم کے بارہ مہینوں کی خصوصیات و کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ساون میں کوئل کی کوک فراق زدہ عورت کے تن بدن میں بارش کے چھینٹوں کے ساتھ ساتھ برہ کی آگ کو بھڑکا دیتی ہے۔

اری جب کوک کوئل نے سناہی　　تمام تن بدن میں آگ لاہی (کذا)

دکھنی شاعری میں ۱۷۰۷ء سے بہت پہلے سیاسی واقعات کو پیش کرنے کی روایت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کی ادبی وجہ تو مثنوی کا فروغ ہے، لیکن خود مثنوی کا فروغ سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ ہے۔ دکن کے سلاطین نے اپنی زبان کی سرپرستی کی۔ شعرا کی قدرافزائی کی مسلسل مثالیں پیش کیں۔ ان میں سے کئی خود بھی شاعر تھے۔ سلاطین دکن اور ان کے درباروں سے متعلق شاعروں کے کلام میں ان کی شخصی زندگی اور حالات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور تمدنی حالات و واقعات کی تصویر کشی اور ترجمانی بھی نظر آتی ہے۔ اس شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس میں ''قومیت'' کے عناصر اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ قومیت کا جذبہ اس شاعری میں آنکھیں کھولتا نظر آتا ہے۔

مغرب کی سیاسی اور ذہنی غلامی کے نتیجہ کے طور پر ہم ہر تحریک یا نظریہ کا منبع مغرب کو قرار دینے لگے ہیں۔ ''قومیت'' کو انیسویں صدی عیسوی کا ایک سیاسی نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ قومیت کے ارتقا یافتہ تصور کے پیش نظر یہ دعویٰ شاید کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے کہ قومیت ایک ''تازہ خدا'' ہے، لیکن ادبیات کا مطالعہ اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ اپنے جدید تصور کے اعتبار سے بھی فردوسی قومیت کا پہلا نقیب ہے۔

نہ شیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسیدست کار
کہ تختِ کیاں را کند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

فردوسی کی اس قومیت کا ایک نمایاں پہلو اس کی لسانی عصبیت ہے جس کا زندہ ثبوت شاہنامہ ہے۔ ''زبان'' کو آج قومیت کا عنصر ہی نہیں کہا جاتا بلکہ بعض مفکرین کے نزدیک یہ قومیت کی اساس ہے۔ قومیت کے عناصر کے ایک سرسری سے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکھنی ادب میں ''قومیت'' آج کے مروجہ مفہوم میں بھی موجود تھی۔ قومیت کے جغرافیائی' لسانی' جذباتی اور مذہبی عناصر کی کارفرمائی دکھنی ادب میں موجود ہے۔

مغرب کے مفکرین نے قومیت کی تاریخ اور عناصر کو جس طرح سمجھا اور پیش کیا ہے اس کے مطابق یورپ کے نشاۃ الثانیہ کے دور میں قومی اختلافات اُبھرنے لگے تھے' اور قرونِ وسطیٰ میں رومیوں کا جو نصب العینِ وحدت موجود تھا وہ بکھرنے لگا تھا۔ پندرھویں صدی سے یورپ کی مقامی بولیاں ادبی زبانیں بننے لگیں اور مختلف گروہوں کے مشترکہ رسم و رواج' مفادات و روایات نے یورپ کے لوگوں کو الگ الگ قوموں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوں قومیت مغرب میں ایک نیم شعوری احساس اور جذبہ کی حیثیت سے اٹھارہویں صدی کے آخر تک رہی۔ اسے ۱۷۷۲ء میں پولینڈ کی تقسیم کے موقع پر ایک سیاسی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا۔[۸]

کچھ مصنفوں نے اس وحدت پر زور دیا ہے جو نسل' زبان اور اداروں کی یکسانیت سے حاصل ہوئی۔ FICHTE نے زبان کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے' اس نے ۱۸۰۷-۸ء میں جرمن قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''لوگوں کی قومی شیرازہ بندی زبان سے ہوتی ہے''۔[۹] عہد حاضر کے مصنف تاریخ کے مطالعہ' نظریۂ ارتقاء اور سماجی نفسیات کے زیر اثر سیاسی نظام اور حب وطن کی بنیاد پر حاصل شدہ روحانی وحدت کے اس تدریجی ارتقا پر زیادہ زور دیتے ہیں جو مشترکہ تجربوں اور روایات کا نتیجہ ہوتا ہے۔[۱۰]

---

۸ History of Political thought, R.G. Gettell, 1951.

۹ حوالہ بالا' صفحہ ۴۲۶

۱۰ حوالۂ بالا' صفحہ ۴۲۷

قومیت کو ایک جدید سیاسی نظریہ قرار دینے کے ساتھ ساتھ مغرب کے سیاسی مفکر اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی جڑیں بہت دور تک تاریخ میں پیوست ہیں۔ قبیلہ، منظّم کاشتکاری، سیاسی اور تنظیمی مسائل سے لے کر مختلف ریاستوں کے قیام تک۔ اور ان ریاستوں میں ان کے الگ وجود کا احساس ان کے سپاہیوں نے پیدا نہیں کرایا بلکہ ادیبوں اور شاعروں نے۔ قومیت کے ارتقا میں اس کا سب سے بڑا ہتھیار اور وسیلہ زبان رہی، ادیبوں اور فنکاروں نے قومیت کے دیو کو ذہن کی بوتل سے جس طرح نکالا ہے اس کا اظہار باربرا وارڈ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "when in the eighteenth century, nationalism began to take form as a modern movement, its forerunners in many parts of Europe were not soliders and statesmen but scholars and poets who sought to find in ancient legends and half forgotten folksongs the 'Soul' of the nation.[۱۱]

دکن کی تاریخ اور دکھنی ادب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف دکن کے سپاہی مغلوں کے خلاف لڑتے رہے اور دوسری طرف دکن کے شاعروں نے نیم فراموش شدہ داستانوں میں نہیں بلکہ اپنے سپاہیوں کے کارناموں اور بادشاہوں کے سوانح میں ایک قوم کی ''روح'' کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دکن کا ذکر ایک مستقل اور علیحدہ ملک کی حیثیت سے بار بار کیا گیا۔ دکن کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ''مغلائی'' ہے یعنی مغل سلطنت۔ قومیت کی وفاداریوں کا دائرہ اور حلقہ بہت محدود ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال نصرتی کی شاعری ہے۔ اس نے علی نامہ میں اپنی شکستوں کو بھی فتح میں بدل دیا ہے۔ قومیت تاریخ کو یوں ہی مسخ کرتی ہے اور اپنی بنیادوں پر ایک ہی ریاست اور جغرافیائی وحدت کے رہنے والوں کو تقسیم کرتی ہے۔ دکن میں بھی ہمیں یہ تقسیم نظر آتی ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے مؤرخ فرشتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلطنت بہمنیہ کے ''مسلمان'' تک تین گروہوں میں تقسیم کیے گئے تھے: (۱) دکنی۔ وہ لوگ جو علاؤ الدین

۱۱۔ Five Edeas that changed the world, barbara ward, 1959.

خلجی کے عہد میں یا اس کے کچھ بعد جا کر دکن میں آباد ہوئے۔ (۲) غریب یعنی ترکستان' ایران اور افغانستان کے لوگ جن کی زبان فارسی تھی اور (۳) حبشی۔ یہ لوگ عربی کے علاوہ اپنی زبان بولتے تھے[۱۲] فرشتہ کی اس تقسیم کے ذکر کے بعد ہی قادری صاحب نے اس تقسیم کے لسانی پہلو کی وضاحت بھی ان الفاظ میں کر دی ہے کہ ''غریبوں کے مقابلہ میں دکنیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسی اعتبار سے عربی اور فارسی کے مقابلہ میں ان کی زبان کو بھی ملک میں بہت زیادہ رواج حاصل تھا۔[۱۳]

ان عناصر کے علاوہ دکنی قومیت کی تشکیل میں مذہب کو خاصا دخل حاصل ہے۔ سلاطین دکن زیادہ تر شیعہ تھے۔ ان کے مسلک کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی۔ غلو کا یہ عالم تھا کہ بارہ اماموں کی نسبت سے اگر ایک طرف بارہ پیاریوں کا ذکر ہوتا تھا اور محل میں بارہ برج بنائے جاتے تھے تو دوسری طرف سنیوں کو ''خارجی'' کہا جاتا اور ان کو ''راہ راست پر لانے'' کی کوشش سرکاری سطح پر کی جاتی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ضمن میں اس پہلو کو مثالوں کے ذریعہ پیش کیا جائے گا۔ قومیت اور دکنی ادب کے بارے میں ان چند معروضات کے بعد سیاسی اور تاریخی نقطۂ نظر سے دکھنی شاعری کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

عہد بہمنی (۱۳۵۰ء تا ۱۵۲۵ء) میں تین لسانی علاقے مہاراشٹر' تلنگانہ اور کرناٹک ایک وحدت بن گئے۔ اس سیاسی وحدت کے استحکام میں دکھنی اردو نے بھی بڑا حصہ لیا۔ یوں شمالی ہند اور دکن میں اُردو کی شکل وصورت میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ڈاکٹر زور نے اپنے ایک مضمون میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔[۱۴]

''جب ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت دولت آباد میں قائم ہوئی اور دکن اور شمالی ہند سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے جدا ہو گئے تو اُردو بھی دو حصوں

۱۲؎ حکیم سید شمس اللہ قادری' اُردوئے قدیم' ص ۶۲' کراچی' ۱۹۶۳ء

۱۳؎ حوالہ بالا' ص ۶۳

۱۴؎ ویسے اس مضمون میں انہوں نے بہمنی سلطنت کا سالِ قیام ۱۳۴۷ء لکھا ہے اور دکنی ادب کی تاریخ میں ۱۳۵۰ء۔

میں تقسیم ہو گئی''۔ [۱۵]

دکھنی زبان کے کئی مرکز قائم ہوئے۔ گلبرگہ، بیدر، گوگی، ویلور اور گولکنڈہ وغیرہ۔

حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ معراج العاشقین کو آج بھی صحت اور یقین کے ساتھ ان کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا، لیکن نثری ادب ہمارے موضوع میں شامل نہیں، بہرحال ان کی شاعری (ہدایت نامے، چکی نامے وغیرہ) زیادہ صحت کے ساتھ ان سے منسوب کی جا سکتی ہے۔ اس طرح دکھنی اردو میں بھی ہماری شاعری نے تصوف اور رشد و ہدایت کے سائے میں آنکھ کھولی۔

نظام شاہ بہمنی ۱۴۶۰ء میں تخت نشین ہوا۔ نظامی بیدری، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا مصنف اسی عہد کا شاعر ہے۔ مثنوی کی روایت بہمنی عہد سے شروع ہو گئی۔ اس کا ایک سبب تو دربار کی سرپرستی تھا اور دوسرا سبب معاشی خوش حالی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر دکن میں مسلمانوں کی پانچ ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے اردو ادب و شعر کی تاریخ میں بیجاپور اور گول کنڈہ کی ریاستیں بہت اہمیت رکھتی ہیں بیجاپور کی عادل شاہی ریاست ۱۴۹۰ء میں وجود میں آئی اور قطب شاہی عہد ۱۵۰۸ء سے شروع ہوا۔ اس لیے مناسب یہ ہو گا کہ ان کا الگ الگ مطالعہ کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض شاعر ان دونوں درباروں سے متعلق رہے۔ بیجا پور سے گولکنڈہ یا گولکنڈہ سے بیجا پور چلے جانا عام بات تھی۔ پھر دونوں خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔

عادل شاہی عہد (۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک)

یوسف عادل شاہ نے محمود گاوان کی شہادت کے بعد بہمنوں کے خلاف بغاوت کر کے علاقہ کرناٹک کے مرکزی شہر بیجا پور میں ایک آزاد سلطنت قائم کر دی۔ [۱۶]

---

[۱۵] ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ ادبی تحریریں، ص ۵۸، حیدر آباد دکن ۱۹۶۳ء

[۱۶] ڈاکٹر محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص ص ۲۸، کراچی، ۱۹۶۰ء۔

اس خاندان کے حکمرانوں میں ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء ۱۶۲۶ء) علم و فضل کا بڑا سرپرست تھا۔ نورالدین ظہوری، ملا رفیع الدین شیرازی، ابوالقاسم فرشتہ وغیرہ اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ "ظہوری نے بادشاہ کی ہندی کتاب نورس کا وہ اہم دیباچہ لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔ [۱۷]

شاہ برہان الدین جانم اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس عہد کی سب سے اہم شخصیت "عبدل" ہے۔ اس شاعر نے ۱۶۰۳ء میں مثنوی ابراہیم نامہ نظم کی۔ اس مثنوی میں بیجاپور کے عام حالات، ماہرینِ فنون کے تذکرے اور دربارِ شاہی کے مرقعے موجود ہیں۔ ابراہیم نامہ کا نمونہ جناب نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں خاصی تفصیل سے پیش کیا ہے۔

محمد عادل شاہ کا دور ۱۶۲۶ء سے ۱۶۵۶ء تک کا ہے۔ اس کی ماں گولکنڈہ کے سلطان محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی اور اس دور میں گولکنڈہ کے دربار کے کئی متعلقین بیجاپور آئے اور یہاں کی ادبی تاریخ میں مشہور ہوئے۔ قطب رازی، مرزا مقیمی، امین، مرزا دولت شاہ، ظہور بن ظہوری، حسن شوقی، رستمی، صنعتی اور ملک خوشنود اس عہد کے ممتاز شاعر ہیں۔ مرزا مقیمی نے مثنوی چندر بدن و ماہیار میں ایک ہندو شاہزادی اور مسلمان تاجر زادہ کا عشقیہ قصہ لکھا ہے جس کی تمدنی اہمیت ہے۔

حسن شوقی پر مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ شوقی کا شاعرانہ مرتبہ ایسا تھا کہ ابن نشاطی نے پھول بن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال ہزاراں بھیجتا رحمت منج اپرال

شوقی کی نظم میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ سے اس عہد کے ایک تمدنی گوشہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کی دوسری اہم نظم "فتح نامہ نظام شاہ" ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظام شاہیوں سے متعلق رہا اور پھر "یا تو نظام شاہی حکومت کی تباہی پر یا کسی اور وجہ سے اس کا تعلق وہاں سے قطع ہو گیا اور وہ عادل شاہی دربار میں آ گیا" [۱۸] فتح نامہ

---

[۱۷] حوالہ بالا ص ۳۲

[۱۸] مولوی عبدالحق، قدیم اردو، ص ۸۵، کراچی ۱۹۶۱ء

میں رام راج کے مارے جانے اور وجیانگر کی سلطنت کے خاتمے کا ذکر ہے۔ اگر یہ نظم الحاقی ہے تو بھی اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے کسی اور شاعر نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے، کیونکہ لسانی اعتبار سے یہ اسی عہد کی کاوش ہے۔ علاوہ ازیں اس نظم سے نظام شاہ، علی عادل شاہ اور قطب شاہ کے اتحاد کا پتہ بھی چلتا ہے۔ دکن کو اس عہد کے دکھنی شاعروں نے کم و بیش ہر موقع پر ایک الگ اور مستقل ''ملک'' کہا ہے۔ اور اسے دوسرے ملکوں پر ترجیح دی ہے۔

خراسان کے شاہان ہیں شمشیر بند   روہیلے، پٹھاناں و گزری کمند
عرب ہور عجم ملک لڑنے کو زور   وہ راہل جیتے راج ہیں دز دچور
سو افضل میانا ہے ملک دکن   ہوئے یاں کے شاہان جیتے خوش لکھن
(کذا)

علی عادل شاہ ثانی شاہی ۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۳ء) جدید تحقیقات کے مطابق اچھا شاعر تھا۔ اس کا اُردو کلیات سید مبارز الدین رفعت اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر چکے ہیں عادل شاہی سلطنت کے زوال کے آثار محمد عادل شاہ کے عہد ہی سے نظر آنے لگے تھے۔ ایک طرف مرہٹے تھے اور دوسری طرف مغل فوجوں کا محاصرہ۔ علی عادل شاہ نے کبھی مرہٹوں کو رفیق بنایا اور کبھی مرہٹوں سے میدان کارزار میں الجھا۔ انہیں معرکوں میں پنالہ کا معرکہ بہت مشہور ہے۔ ''شیوا جی نے راست مقابلہ نہ کیا۔ چپکے سے پنالہ کا قلعہ چھوڑ دیا۔ اسی موقع پر سلطان علی کے درباری شاعر ملک الشعراء نصرتی نے ''علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سون'' والا مشہور مصرع کہتا تھا۔[۱۹] صلابت کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ صلابت خاں شیوا جی سے مل گیا تھا۔

اس بادشاہ کا دور بڑا ہنگامہ خیز رہا۔ اورنگ زیب سے ''شاہی'' کو صلح کرنی پڑی اور اس صلح کے بدلے میں اسے بیجاپور کا کم و بیش تمام شمالی علاقہ عالمگیر کا دینا پڑا۔

---

۱۹ سید مبارز الدین رفعت، دیباچۂ کلیاتِ شاہی، ص ۱۲ علی گڑھ ۱۹۶۲ء (نیز مولوی عبدالحق ''نصرتی'' میں)۔

شاہی کے اُردو کلیات (جو داخلی شہادتوں کی بنا پر اس کا قرار دیا گیا ہے) میں اس کے محلوں کی تعریف میں جو قصیدے شامل ہیں ان کا مقابلہ محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے اسی موضوع پر قصائد سے کیا جا سکتا ہے۔ شاید ہم یہ تو نہ کہہ سکیں کہ ''شاہی کے قصائد ان سے بہتر ہیں'' [۲۰] لیکن ان قصائد کی فنی خوبیوں کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

شاہی مذہباً شیعہ تھا' لیکن ''دکنی قومیت'' کے جذبے کے تحت اس نے حضرت گیسو دراز سے بھی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ کلیات شاہی میں ''مثمن در مدح حضرت سید محمد حسینی خواجہ گیسو دراز'' موجود ہے حالانکہ عموماً شیعہ حضرات کو تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس مدح کا سبب قومیت کا وہی تصور اور نظریہ معلوم ہوتا ہے جس پر سطور بالا میں گفتگو کی جا چکی ہے۔

علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعراء نصرتی تھا۔ نصرتی کو اُردو کے عظیم شعرا کی صف میں شامل کرنا ہر لحاظ سے مناسب اور قرین حق ہے۔ نصرتی کی دو مثنویوں ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ہمارے موضوع کا تعلق ''علی نامہ'' سے ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنی کتاب نصرتی میں اس مثنوی پر صفحہ ۸۰ سے ۲۱۸ تک مفصل بحث کی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ''نصرتی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب' بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ رزمیہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان میں بے نظیر ہے۔ [۲۱] مولوی صاحب کی رائے بڑی حد تک درست ہے' لیکن جیسا کہ انہوں نے اپنی طویل بحث میں بعض مقامات پر کہا ہے کہ نصرتی عادل شاہی دربار سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنی شکست کو بھی فتح قرار دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات صحیح ہے کہ نصرتی مغلوں سے نفرت کے باوجود ان کی شجاعت کی تعریف بھی کرتا ہے اور اس کے یہاں رزمیہ مناظر شمالی ہند کے

---

۲۰ مبارز الدین رفعت' دیباچۂ کلیاتِ شاہی' ص ۴۶۔

۲۱ مولوی عبدالحق۔ نصرتی ص ۸۲' طبع اول

مرثیوں کی طرح ''یک طرفہ کارروائی'' نہیں ہیں۔ تفصیل سے دامن بچاتے ہوئے اس مثنوی سے چند اقتباسات پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

''محمد عادل شاہ کے مرنے اور علی عادل شاہ کی تخت نشینی پر مُلک کی کیا حالت تھی۔ نصرتی نے جو کچھ لکھا ہے' تاریخوں سے اس کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے''۔[۲۲]

ننھے ہور بڑے تھے سو سب بد نہاد　　　اچاہے وہ چار وطرف تھے فساد

مخالف تو اکثر منافق ہوئے　　　موافق بی کے ناموافق ہوئے

بڑی رج کی شہ' اپنے کمسن منے　　　نو بادشاہی' نوے دن منے

علی نامہ میں مغلوں کی بے وفائی کا ذکر ہے۔ مغل سپاہیوں کا نصرتی نے اس حقارت سے تذکرہ کیا ہے۔

یہ آتے سو اکثر ہیں وہ پوت عاق　　　جو نیچے ہیں ماوان لے پر طلاق

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے۔

مغل ہر ہنر میں بڑا کارساز　　　لڑائی کے فن پر توات حیلہ ساز

اور

کہ ہر مرد جیون کوہ البرز ہے　　　تبرکس کے ہت کس کے جم گرز ہے

علی نامہ میں باہمی معرکوں کی ہر تفصیل موجود ہے' مگر دکنی نقطۂ نظر سے۔ وہ جے سنگھ اور مغلوں کی فتح کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ دکنی اتحاد کا موضوع اسے عزیز ہے۔ جب سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اپنی فوجیں نیک نام خاں کی سرکردگی میں علی عادل شاہ کی امداد کے لیے بھیجیں تو مغلوں پر ان دونوں لشکروں کے حملہ کا بیان وہ جوش وخروش سے کرتا ہے۔

قلعہ بورندہ کے معرکہ میں نصرتی نے بیجا پوری لشکر کی بہادری کی بہت تعریف کی اور جب جے سنگھ نے اس قلعہ پر قبضہ کیا تو نصرتی نے اسے ''اندھے کے ہاتھ بٹیر

۲۲۔ حوالہ بالا ص ۱۰۶۔

لگنے'' سے تعبیر کیا۔

تو فرصت مغل پا کیا گٹر کون زیر   کہ اندے نے جوں چانپ پکڑیا بٹیر

نصرتی نے شیواجی کا ذکر بھی شدت اور تلخی سے کیا ہے۔ وہ اس کے نزدیک کفر میں فرنگی سے زیادہ شدید تھا۔

فرنگی سے تھا کفر میں ات اشد

اس مصرع کے تاریخی اور فکری پہلو پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اور آگے چل کر نصرتی نے شیواجی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا قتل تو حرم میں بھی جائز ہے۔

حرم میں بھی سنپڑے تو تھا کشتنی

لیکن اپنی دکنی قومیت کے جوش میں نصرتی نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ دکن پر اورنگزیب کی مسلسل فوج کشی کا اصل سبب مرہٹہ فتنہ کا استیصال تھا۔ دکن کی مسلمان ریاستیں شیواجی کے لیے جائے پناہ بن گئی تھیں۔

تہذیبی اعتبار سے اس دور کے شاعروں میں ہاشمی کا ذکر بھی بعض رجحانات کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوگا۔ بعض نقادوں نے ہاشمی کو اردو کا پہلا باقاعدہ ریختی گو شاعر قرار دیا ہے جس نے اپنا دیوان ریختی بھی مرتب کیا ہے۔ دوسری طرف پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے مولانا عبدالسلام ندوی اور پروفیسر مسعود حسن رضوی وغیرہ سے اتفاق کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ''ایسی شاعری کا شمار بھاشا میں ہوگا جس میں عورت کا خطاب مرد سے ہے۔ کیونکہ ریختی میں عورتوں کے جذبات' خیالات اور احساسات کے علاوہ ان کی زبان اور اصطلاحات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی عریانی کی جھلک بھی آ جاتی ہے۔'' [۲۳] اس مطالعہ کے ابتدائی حصہ میں افضل کے بارہ ماسہ کے سلسلہ میں اسی خیال کی تائید کی جا چکی ہے۔ بھاشا کے اثر کے علاوہ مجاز اور تمثیل کے پردوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے صوفیائے کرام نے بھی اپنی شاعری میں اس اسلوب سے کام لیا ہے۔ اس کی ایک مثال تو خود ''خاکی'' کی شاعری ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر

---

۲۳ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں' علمی نقوش ص ۵۴' کراچی ۱۹۵۷ء

صاحب موصوف نے مندرجہ بالا رائے کا اظہار کیا ہے۔ دیوان ہاشمی کے مقدمہ میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "صوفیاء نے عورتوں کو تعلیمات دین اور اسرارِ معرفت سمجھانے کے لیے چکی نامہ، چرخہ نامہ اور شادی نامہ عورتوں کی زبان میں لکھے۔[۲۴] اس ضمن میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کو سمجھانے کے علاوہ تانیث کے صیغہ میں جو عاشقانہ گداز اور خود سپردگی ہے وہ ایک عشقیہ فضا کی تخلیق میں فنی طور پر مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ہاشمی کی شاعری اگر ایک طرف بھاشا کی سنجیدہ عشقیہ شاعری کی روایت کو پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اس میں عورتوں کے جذبات، خیالات اور احساسات کے علاوہ ان کی زبان اور اصطلاحات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور "ساتھ ہی عریانی کی جھلک" بھی آ گئی ہے۔ اس عریانی کو جنسی معکوسیت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ہاشمی کی شاعری میں شمالی ہند کی ریختی کی خصوصیات اپنی ابتدائی شکل میں ملتی ہیں۔ عورتوں کی "زبان اور اصطلاحات" کے بارے میں ان کا دعویٰ یہ ہے۔

مرا کیا یار چنچل ہے رکتی ہے رتجھ کر جو تو
دیئے ہیں ہاشمی عزت ہماری "اوئی" کی بولی کون

(کذا)

ہاشمی کے دیوان سے اس عہد کی خواتین کے لباس، زیوروں اور آرائش کے سامان وغیرہ کی فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ اس طرح شمالی ہند کی ریختی کی طرح ہاشمی کے کلام میں نسوانی محاروں اور اشاروں کی فراوانی ہے، مثلاً پیٹر و مارنا، سرنہانا، روکھا پانی نہانا، میلی ہونا، چلچلی، فضیحی وغیرہ۔

رہی بات عریانی اور معکوس جنسی جذبات کی، سو اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے جن میں بیاہتا اور کنواری عورتوں نے اپنے جذبات و کیفیات کو بیان کیا ہے۔ دیوان ہاشمی میں ایسے اشعار کثرت سے موجود ہیں۔

ناداں ہوں میں چھوری، کرتے ہیں کیا یوزوری ذرا نہیں بھلوری کیسے تمہیں چھو خون (کذا)

(بیاہتا عورت اپنے آشنا سے)

---

[۲۴] ڈاکٹر حفیظ قتیل، دیوان ہاشمی (مقدمہ) ص ۲۰، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۱ء

ہر یک فن کر کے لائی ہوں تمھیں چپ اس کا بت پکڑو
دوہت پکڑے پہ چپ رہی تو بزان بیشک سینہ رگڑو
(کذا)

(کٹنی مرد سے)

ان جنسی معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سیاست کے بارے میں بھی ہاشمی کے اشعار میں واضح اشارے اور تبصرے ملتے ہیں۔ خاص بات یہ کہ وہ ذاتی باتوں کے اظہار کے لیے سیاسی واقعات کو تشبیہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، مثلاً

کالی دھڑی میں دھن تری بیٹھا ہے میرا جیو سویوں
بیٹھا ہے کر ناٹک میں جوں سکہ سو "عالمگیر" کا

قطب شاہی عہد (۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ تک)

شعر و سخن کے لحاظ سے اس خاندان کے پہلے چار بادشاہوں سلطان قلی، جمشید قلی، سبحان قلی، اور ابراہیم قلی کا زمانہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ یہ استحکام سلطنت میں مصروف رہے۔ ابراہیم کے دور کے جن شاعروں کے نام ادبیات دکن کی تاریخوں میں ملتے ہیں ان میں "فیروز" سب سے اہم معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن وجہی اور ابن نشاطی نے اس کی خدمت میں جس انداز سے خراج تحسین پیش کیا ہے، اس سے اس کے شاعرانہ رتبے کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اس مطالعہ کے موضوع کے مطابق اس خاندان کا سب سے اہم شاعر محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء ۱۶۱۱ء) ہے۔ جس کی شاعری اس کے عہد کا آئینہ خانہ ہے۔

اس نے کم وبیش پچاس ہزار بیت کہے جیسا کہ اس کے جانشین نے کلیات کے منظوم دیباچہ میں کہا ہے۔

مگر شاہ کہہ بیت پچاس ہزار

قلی قطب شاہ کے کلیات کے مطالعہ سے "ظل اللہ" (تخلص شاہ) کے موضوعات

کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''متعدد مثنویاں پھلوں اور میوؤں پر ہیں جن میں ایران اور خراسان ہی کے میوے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے پھلوں کا بیان کیا گیا ہے' یہاں تک کہ بڑکی بڑولی' بنولی' منجل' گینگل' سیندولے کو بھی نہیں چھوڑا...... بہت سی مثنویاں اور غزلیں ایسی ہیں جو شاعر نے اس وقت کے رسم و رواج اور تیوہاروں مثلاً شادی کی رسوم' اپنی سالگرہ' شب برأت' میلاد نبیؐ عید غدیر' سوکا' برسات' ہولی' بسنت' پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہیں۔ [۲۵]

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری اگر ایک طرف اس کے تعیّشات اور ذاتی معتقدات کی داستان ہے تو دوسری طرف اس عہد کی تمدنی اور کسی حد تک سیاسی تاریخ بھی ہے۔ قلی قطب شاہ سخت شیعہ تھا۔ عیش وعشرت میں بھی مذہب کے پہلو کو فراموش نہ کرتا۔ اپنی محبوباؤں پر جو نظم لکھی ہے اس کا عنوان ''بارہ پیاریاں'' ہے۔ محمد قلی بارہ اماموں کی رعایت سے ہر چیز میں بارہ کے عدد کا لحاظ رکھتا تھا۔ [۲۶] محل کوہ طور میں اس نے بارہ برج بنوائے۔

بارہ بروج پر ہے بارہ امام دشٹی تو اس پر جھلکتا' ایمان کا اجالا

یہی مذہبی اثرات تقریبات اور تمدنی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں ''مولود علی'' اور ''عید غدیر'' کو سرکاری تقریبات کی حیثیت حاصل تھی۔ محمد قلی سے پہلے قطب شاہیوں نے کبھی اپنے عقائد کی تبلیغ نہیں کی تھی لیکن اس حکمراں نے مذہبی مخالفتوں کو جنم دیا۔

ہمیں ہیں شیعہ کر کرتے خوارج دشمنی سب سوں
علی ابن ابی طالب انن کوں ماروہت ضربت

ڈاکٹر زور نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دکن میں خارجیوں کے وجود کا کبھی پتہ نہیں چلتا' اسی لیے خوارج سے مراد غالباً سُنی ہیں۔ [۲۷]

---

[۲۵] مولوی عبدالحق' قدیم اردو ص ۸۵

[۲۶] ڈاکٹر محی الدین قادری' سلطان محمد قلی قطب شاہ' ص ۹۔۴ حیدر آباد دکن ۱۹۴۸ء

[۲۷] حوالہ بالا' ص ۷۔۶

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور کی تقریبات سے اس عہد کے کلچر، اور تمدنی مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس نے ان ساری تقریبات پر نظمیں لکھ کر آنے والے ادوار کے مؤرخوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔ ''عید غدیر'' اور ''مولود علی شیعی اثرات کی آئینہ دار ہیں۔ ''عید'' ''عید میلاد'' اور ''شب برات'' کی تقریبات تمام مسلمان مل کر مناتے تھے۔ بادشاہ کی سالگرہ بھی سرکاری تقریب تھی۔ یہ شاہ پرستی کے عنصر کا ثبوت ہے۔ اس تمدن کا ایک اور اہم عنصر موسم ہے۔ ہولی، بسنت وغیرہ کے علاوہ بارش اور برسات پر اس نے اور اس کے دوسرے ہم عصر یا بعد کے شعراء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مرگ سال کو محمد قلی نے قومی تہوار بنا دیا تھا۔[۲۸] موسم کے تہواروں میں نوروز کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو ایرانی اثرات کی غمازی کرتا ہے، لیکن موسم سے متعلق تہواروں میں سب سے زیادہ اہمیت مرگ سال کو دی جاتی تھی۔ یوں تہواروں میں بھی دکنی عنصر سب سے قوی بن گیا۔ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں ''دکن میں جس روز بارش شروع ہوتی ہے اسے آج بھی مرگ کا دن کہتے ہیں اور مرگ لگنا یعنی بارش شروع ہونا ایک قومی تہوار ہے۔[۲۹] ڈاکٹر زور کی عبارت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے جداگانہ تمدن کا احساس دکن والوں کو صدیوں سے ہے اور ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب ''سلطان محمد قلی قطب شاہ'' میں اسی تمدن کو ''گولکنڈہ کا بین قومی تمدن'' کہا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی زندگی اور تعمیرات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کرتے ہوئے اس کی رزم آرائی سے متعلق چند اشارے پیش کیے جاتے ہیں۔

رام راج کا جانشین ونیکٹ پتی راج، علی خاں لُر کی بغاوت میں شریک ہو گیا تھا۔ اس سے وجیا نگر والوں کی ہمت بڑھ گئی۔ محمد قلی نے ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۵ء) میں قلعہ پنکنڈہ کا محاصرہ کر لیا اور قلعہ والوں کو تین دن کی مہلت دی جسے قلعہ والوں نے قلعہ کے انخلا کی

---

۲۸ نصیر الدین ہاشمی، دکنی کے چند تحقیقی مضامین، ص ۱۱۹، دہلی، ۱۹۶۳ء

۲۹ ڈاکٹر محی الدین زور۔ ادبی تحریریں ص ۶۸ (نیز سلطان محمد قلی قطب شاہ ۲۱۶)

جگہ فوجی تیاریوں اور قلعہ بندی کے لیے استعمال کیا۔ بارش کے شدائد کی وجہ سے محمد قلی قطب شاہ کو واپس لوٹنا پڑا۔ اس سے ونیکٹ پتی کی ہمت بڑھ گئی۔ کئی چھوٹے بڑے معرکے ہوئے۔ کبھی کبھی تو ہندو فوجیں سلطنت کی سرحد میں گھس آئیں۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر محمد قلی نے اپنے عساکر سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

محمدؐ دین قائم ہے، ہندو بھاران بھگا دو تم
سیاہی کفر کی بھانو، اجالا جگمگا دو تم
اجالے دین میں فوجاں جو آویں ڈاٹ کر غم کی
توحیدر کی کٹاریاں سوہیا ان کا چرا دو تم

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا سب سے مشہور شاعر اور ادیب وجہی ہے۔ ایک طرف تو اس کے نثری کارنامہ ''سب رس'' میں تمثیل سے قطع نظر، ناول کے ابتدائی خدوخال ملتے ہیں اور دوسری طرف اس کی مثنوی قطب مشتری (۱۶۰۹ء) میں بادشاہ کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی سے اس معاشرہ کی اخلاقی اقدار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں عشق کو ''گناہ ابن آدم'' نہیں بلکہ توفیق سمجھا جاتا تھا۔ دکن کی عظمت اور ایک علیحدہ ملک ہونے کا احساس گولکنڈہ کے پہلے ملک الشعراء وجہی کو شدت سے تھا۔

دکھن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ کون حرمت نگینہ ہی لگ
دھکن ملک بھو تیج خاصہ اہے تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۵ء) محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ اس کے منظوم دیباچہ، کلیات محمد قلی قطب شاہ کا حوالہ آ چکا ہے، مگر شاعر ہونے کے باوجود وہ شعرا کا قدردان نہ تھا۔ بہت سے شاعروں کا رشتہ دربار سے ٹوٹ گیا تھا۔ غواصی اس عہد کا مشہور شاعر ہے اور ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اس کی مشہور مثنوی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۲ء) نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ادب نوازی کی روایات کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ وجہی، غواصی اور دوسرے شاعر شاہی دربار کی

زینت بن گئے۔ وجہی نے دربار میں اپنی واپسی کا ذکر سب رس کے دیباچہ میں کیا ہے۔ غواصی نے طوطی نامہ میں عبداللہ کے عہد کو غرق شدہ فنکاروں کے دوبارہ ابھرنے کا دور قرار دیا ہے۔

ڈوبے تھے ہنر مند سو پھیر کر　　نکل آئے تجھ دور میں تیر کر

دیا جیو پھر راگ ہور رنگ کوں　　کیا دور سینہال پو کے زنگ کوں

جنیدی اور ابن نشاطی بھی اس عہد کے شاعر ہیں۔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ علم و فن کے دوسرے شعبوں کی سرپرستی بھی عبداللہ قطب شاہ نے کی۔ علامہ نظام الدین کی کتاب حدیقۃ السلاطین اسی زمانہ میں لکھی گئی۔

عبداللہ قطب شاہ خود بھی شاعر تھا اور اپنے نانا کی طرح متنوع اور مختلف پہلوؤں اور موضوعات کو اس نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ عبداللہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ اس کے عہد کے تمدن کی نہج اس کے نانا کے دور سے مختلف نہیں تھی۔ ایک طرف مجالس میلاد و مجالس عزا اور دوسری طرف بزم ہائے عیش و عشرت' بسنت' نوروز اور دوسری تقاریب بھی پہلے کی طرح منائی جاتیں۔ عبداللہ قطب شاہ ''عید غدیر'' بڑی شان سے مناتا تھا' کیونکہ شیعی عقیدہ کے مطابق عید غدیر کے دن علیؓ کے نام خدا نے خلافت بھیجی اور اسی لیے یہ عید شیعوں کے لیے عید کبیر ہے۔[۳۰]

اے موموناں خوشیاں کے چشمیاں کوں نیر آیا

یعنی جہاں میں سر تھے عید غدیر آیا

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے سلسلہ میں یہ بات کہنی مناسب ہو گی کہ عید غدیر' مولود علیؓ اور مجالس محرم کے ساتھ ساتھ وہ عید میلاد النبی ﷺ کا اہتمام بھی بڑے خلوص اور شان سے کرتا تھا۔

اس پس منظر میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی نعتیہ شاعری میں رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں

۳۰۔ نصیر الدین ہاشمی' دکھنی کے چند تحقیقی مضامین' ص ۱۱۵

میلادالنبی ﷺ کا ذکر بار بار کیوں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ ہر سال وہ اس جشن کے موقع پر خصوصی نظمیں اور نعتیں کہتا ہو۔ نمونے کے طور پر تین شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمدؐ کا
آفاق صفا پایا دن دین محمدؐ کا
یو عید ہمیں ساجےؔ نصرت کے بجیں باجے
ہے جگ کے نبی راجےؔ دن دین محمدؐ کا

نبی مصطفیٰؐ کا جو مولود آیا جہاں صاف ہو سر بسر جگمگایا

عبداللہ قطب شاہ کے آخر دور میں گولکنڈہ پر اورنگ زیب عالمگیر کے حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مرہٹہ فتنہ کو کچلنے کے لیے یہ قدم ناگزیر تھا۔ ۱۶۶۲ء میں عبداللہ قطب شاہ اور مغلوں کے درمیان صلح ہوئی۔ یہ صلح قطب شاہی اقتدار کے خاتمہ کا اعلان تھی۔ اس کے بعد عبداللہ نے اپنی مہر بنوائی ''ختم بالخیر والسعادۃ''[۱۳۱] گویا یہ مہر اس خاتمۂ اقتدار کی توثیق تھی۔

۱۶۷۲ء میں ابوالحسن تاناشاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے مزاج کی نزاکت یا انفرادیت کا اندازہ ''تاناشاہ'' کے ٹکڑے سے ہوسکتا ہے۔ اس عہد کے قابل ذکر شاعروں میں طبعی اور محبؔ شامل ہیں۔ محبؔ شاہ راجو کا مرید تھا اور اس طرح ابوالحسن تاناشاہ کا ''پیر بھائی'' تھا۔ تاناشاہ کا مسلک اپنے اسلاف سے مختلف تھا۔ محبؔ نے مثنوی ''معجزۂ فاطمہ'' (۱۶۷۷ء)

میں ابوالحسن تاناشاہ کی مدح میں اپنے پیر اور ان کے جد بزرگوار خواجہ گیسو دراز کی حمایت و نصرت روحانی کا ذکر کیا ہے۔

کہ اے نامور قطب شاہ بو الحسن عطا تجھ کیے پیر تخت دکن
تجھے پیر کا حق تے سایہ اہے تو ہر کام میں فتح پایا اہے
محمد حسینی دیئے تج کوں راج مبارک اچھو تجھ کو یو تخت و تاج

محبؔ نے صرف ''پیر'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور پھر اس سلسلہ کے نامور بانی

---

۱۳۱ ڈاکٹر محی الدین زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص ۸۷

(دکن میں) کا نام نظم کیا ہے۔ طبعی نے شاہ راجو کی صراحت کر دی ہے۔

شہ بو الحسن سچ توں شاہ دکن تجھے شاہ راجو مدد بو الحسن
دیا ہے خدا بادشاہی تجے سہاتا ہے ظلِ الٰہی تجھے

ابو الحسن تانا شاہ کے ساتھ قطب شاہی دور ختم ہوا اور یوں مغل دور کا آغاز ہوا۔ مغل دور کا تذکرہ کرتے ہوئے عہد حاضر کے دکھنی ادبی مؤرخوں کے لہجہ میں بالعموم ایسی تلخی آ جاتی ہے جو ہمارے ''تصور قومیت'' کے نظریہ کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے لکھا ہے۔

''گیارہویں صدی کے آخری دو چار سالوں...... میں دکن ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس نے اس سرزمین کی تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادیں ہلا دیں''۔ [۳۲]

ڈاکٹر زور کی رائے یہ بھی ہے کہ اس عہد کے شاعروں نے امام حسین کے مرثیوں کے پردے میں اپنے وطن کے مرثیے لکھے ہیں۔ یہ رائے بھی بڑی حد تک ایک ''قومی اور ذہنی عصبیت'' پر مبنی ہے۔ جیسا کہ مطالعہ کیا جا چکا ہے شیعیت کے زیر اثر دکن کی مسلم ریاستوں میں مجالس عزا برپا ہوتی تھیں اور مرثیہ مقبول عام صنف سخن کا درجہ رکھتا تھا۔ ویسے ڈاکٹر زور کے نقطۂ نظر میں صداقت کا ایک عنصر ضرور ہے۔ بعض مرثیوں کی عمومیت اور لہجے سے ان کی رائے کی تصدیق ہوتی ہے لیکن یہ عمومیت تمام مرثیوں میں نہیں ہے۔

آج غم ناک ہیں چمن کے گُل بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گُل
غمزدہ سینہ، داغ حیران ہیں نرگس و لالۂ یاسمن کے گُل

قطب شاہی حکومت کے خاتمہ نے دکنی قومیت میں بھی شگاف ڈال دیئے۔ بہت سے مذہبی شاعر قومیت کے اسیر نہیں تھے اور یہ شاعر ہمیں اورنگ زیب کے مدح خواں نظر آتے ہیں۔ ضعیفی نے اپنی مثنوی میں اورنگ زیب کی مدح لکھی ہے۔ مثنوی کا سال

---

۳۲ ڈاکٹر محی الدین قادری زور: دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۱۰۰

تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔

یہ دور جہاں دارا اورنگ زیب — کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب
شہنشاہ عادل اہے در امور — کہ بدعت ضلالت ہوا جس سے دور
کہ شاہاں بھی اول ہوئے ہیں تو کیا — نہ کوئی زہد و تقویٰ میں ایسا ویسا
بڑا دین اسلام کا کار ساز — الٰہی توں کر عمر اس کی دراز

شیخ داؤد ضعیفی کے ان اشعار کے متعلق قطعیت سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ یہ پہلی مدح ہے جو کسی حیدر آبادی (دکنی) شاعر نے اورنگ زیب کی لکھی۔[۴۳]

پہلی وجہ یہ ہے کہ ایسے کسی بھی انقلابی دور میں شعرا کا کلام ضائع ہو جاتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اس دور کے دوسرے دکنی شعرا کا کلام ہمیں عالمگیر کی مدح میں ملتا ہے۔ ۱۶۸۵ء میں قاضی محمود بحری بیجا پور کے دور آخر میں وہاں پہنچے۔ قاضی محمود بحری نے زوال کے آثار' شان و شوکت اور عیش و عشرت کے پردوں سے جھلکتے دیکھ لیے۔ مثنوی من لگن کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

ارے بھائی یہ بارہویں صدی ہے — نیکی کو دبا بدی بدی ہے
دھرتی پہ ادھرم ادھک ہوا ہے — امرت کی بجائے بکھ ہوا ہے
اک جیو پہ درد دین کا نین — اک دل پہ اثر یقین کا نہیں
نا جائے کو مائی کا بھروسا — نا بھائی کو بھائی کا بھروسا
نا شرم کی خو ہے یک نین میں — نادھرم کی بو ہے یک بدن میں

ان حالات میں جب زمین پر بے دینی پھیلی ہوئی ہو' کسی دل میں دین کی تڑپ اور درد نہ ہو' سینے سوز یقین سے خالی ہوں' اورنگزیب کی ذات ایسے احساس رکھنے والے شاعر کے لیے یقیناً مثالی حیثیت حاصل کر لیتی۔ بحری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

''من لگن میں ایک فصل شہنشاہ اورنگ زیب کی مدح میں بھی ہے۔ بحری نے اورنگزیب کی بہت تعریف کی ہے''۔[۴۴]

---

۴۳ ڈاکٹر محی الدین قادری زور' دکنی ادب کی تاریخ' ص ۱۱۰

۴۴ ڈاکٹر محمد حفیظ سید' دیباچہ کلیات بحری ص ۵۔۵۴' ۱۹۳۸ء

اک ملک نین جوان لیا نین　　اک نفل نیں جوان کیا نین
ایسا نہ ہوا کسی شہاں میں　　نا بلکہ بڑے مشائخاں میں
جس ناوں اہے ابو المغازی　　سلطان اورنگ زیب غازی
دیندار، دلیر اور دانا　　یک علم نا سب منے سیانا

اورنگ زیب کی مدح کے ساتھ ساتھ بحری کے یہاں حب وطن کے جلوے ہیں، ہاں تنگ نظر قومیت نہیں ہے۔ بحری اپنے اور دکن کے تعلق کو نل اور دمن کے تعلق سے تشبیہ دیتے ہیں۔

بحری کوں دکھن یوں ہے کہ جیوں نل کوں دمن ہے
پس نل کوں ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

بیجا پور اور گولکنڈہ کی فتح کے بعد دکنی ادب کا نیا دور شروع ہوا جسے مغل دور قرار دینا چاہیے۔ اس دور کے آغاز کو ایک ادبی مؤرخ نے ایسا انقلاب قرار دیا ہے جس نے "تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادیں ہلا دیں"۔ یہ حوالہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ تصویر ایک رخی ہے۔ "دکن میں اردو" کا مصنف زیادہ حقیقت پسند ہے۔ اس دور کے بارے میں اس نے لکھا ہے:

"پہلے قطب شاہی پائے تخت گولکنڈہ اور عادل شاہی دار الحکومت بیجا پور شاعری کے مرکز تھے تو اب مغلیہ دور میں اورنگ آباد نے اس کی جگہ لے لی۔ اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنت مغلیہ کا مستقر ہونے کے لحاظ سے دہلی کے امراء، رؤسا، علماء اور شعراء کا مرکز بن گیا بلکہ گولکنڈہ اور بیجا پور کے باکمالوں کا بھی ملجا ٹھہر گیا۔ شعر و شاعری کا چرچا بڑھا"[۳۵]

شمالی ہند میں اردو شاعری کا سلسلہ تو پہلے ہی شروع ہو چکا تھا جیسا کہ اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں عرض کیا گیا ہے لیکن اورنگ زیب کے عہد تک شمالی ہند میں اُردو شاعری کی رفتار کا دکن سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شمالی ہند اور بالخصوص (دہلی) اٹھارھویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی سے اردو شاعری کا مرکز بننے لگا۔

۳۵　نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، صفحہ ۳۴۸، لاہور ۱۹۵۲ء

اس باب کا اختتام میر جعفر زٹلی کے ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ پر کرنا مناسب ہو گا۔ میر جعفر زٹلی مختلف شہادتوں کی بنا پر عہد فرخ سیر تک زندہ رہے۔ ان کا نام ہی ان کے طرز کلام پر تبصرہ ہے' لیکن وہ ''زٹل گو'' ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے مبصر بھی ہیں۔ نوکری پر ان کی نظم یا ان کی شکایت روزگار آج بھی محض تاریخی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اس میں ادبی چاشنی بھی ہے۔ جعفر زٹلی نے شاید ہی کسی کو بخشا ہو۔ کوتوال سے شہزادے اور شہنشاہ تک سب ان کے تیغ قلم سے گھائل ہوئے' مگر مجموعی طور پر عالمگیر کی شخصیت کے سامنے انہوں نے بھی سر جھکایا۔ عالمگیر کے باب میں ایسے آدمی کا احساس ذمہ داری ''ہمارے ترکش کے آخری تیر'' کی عظمت کا ایک اور ثبوت ہے۔

اورنگ زیب کی دکنی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے میر جعفر زٹلی اپنے ظفر نامہ میں کہتے ہیں۔

زہے شاہ اورنگ دھانک بلی — کہ در ملک دکن پڑی کھل بلی
دریں پیر سالی وضعف بدن — مچائی دھما چوکڑی در دکن
بر آورد عسکر بصد دھوم دھام — کہ ہل چل پڑی بر سر روم و شام
کمر بستۂ ہشیار' میدان پر — شب و روز تیار گھمسان پر

میر جعفر زٹلی سے مرزا جانجاناں تک

۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اردو شاعری کے سیاسی اور تاریخی پہلوؤں کے جائزہ کے کے سلسلہ میں ادوار کی تقسیم ایک نازک مسئلہ ہے۔ ہم نے پہلے دور کو "میر جعفر زٹلی سے مرزا مظہر جانجاناں تک" کا عنوان دیا ہے۔ شمالی ہند کی اردو شاعری میں سیاسی رنگ کی نمود کے باب میں جعفر زٹلی کی اولیت (اس مطالعہ کے زمانہ کے حدود میں) کوئی نزاعی مسئلہ نہیں، لیکن اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ مرزا مظہر جانجاناں پر اس دور کو کیوں ختم کیا گیا ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ حضرت جانجاناں، سودا، میر اور درد وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ لیکن ایہام گوئی کے خلاف ادبی مہم میں انہیں دوسروں پر اولیت اور فوقیت حاصل ہے۔ قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ "می گویند اول کسے کہ طرزِ ایہام گوئی را ترک نمود...... مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر مردے است، فرشتہ صفت"[۱] مصحفی کے بیان سے بھی مرزا مظہر کی اولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"در دورِ ایہام گویاں اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست......

فی الحقیقت نقاشِ اول زبان ریختہ بایں وتیرہ باعتقادِ فقیر، مرزا است"[۲]

طبقۂ اول کے ممتاز شاعر خانِ آرزو نے ایک فقرہ میں مرزا مظہر کی اہمیت اور "انداز" کو سمیٹ کر بیان کر دیا ہے۔ مجمع النفائس میں لکھتے ہیں کہ "گاہ گاہے ریختہ بطریقۂ خاصہ می گفت"[۳] خانِ آرزو کا بیان اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اردو کی لسانی خودمختاری کا اعلان کرنے والوں میں وہ بھی شامل ہیں۔

مرزا مظہر نے ایہام گوئی سے اردو غزل کو نجات دلانے میں اپنی "محاورہ دانی"

۱۔ بحوالہ عبدالرزاق قریشی۔ مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام۔ صفحہ ۴۴، بمبئی ۱۹۶۱ء

۲۔ مصحفی۔ تذکرہ ہندی (مرتبہ عبدالحق) ص ۲۰۳، طبع اول ۱۹۳۳ء

۳۔ بحوالہ عبدالرزاق قریشی۔ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا اردو کلام۔ ص ۲۱۷

سے کام لیا۔ ایہام کو اساسی حیثیت حاصل تھی، اسی لیے اُسے ختم کرنے کے بعد کسی اور چیز کو ریختہ کی بنیاد بنانا لازم تھا۔ ایہام کے بارے میں ان کی رائے اور ادبی جہاد ان کے ذوق انتقاد اور "شعر فہمی" کا ثبوت ہے، اور ان کی شاعری فصاحت و محاورہ دانی کا اظہار۔ صاحب عمدۂ منتخبہ کے الفاظ میں:

علم و فضل و خوش تقریری و شعر فہمی او بیروں از تحریر ست۔ الحق کہ مثلش در فصاحت و محاورہ دانی بالفعل پیدا نیست" [۴]

مرزا مظہر کی اسی "اولیت" کے پیش نظر ہم نے اس باب اور دور کا نقطۂ اختتام ان کی ذات کو قرار دیا ہے۔

میر جعفر زٹلی کی کلیات کے بارے میں بہت سے محققین کی رائے یہ ہے کہ اس میں الحاقی کلام بھی شامل ہے۔ یہ رائے درست ہو سکتی ہے کیونکہ بعض نظمیں لسانی نقطۂ نظر سے مختلف اور بعد کی معلوم ہوتی ہیں، لیکن تاریخی واقعات سے متعلق ان کا کلام ان تمام نسخوں میں مشترک ہے جو ہمیں مل سکے۔ [۵]

جعفر زٹلی کا ظفر نامۂ اورنگ زیب گزشتہ باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جعفر نے اورنگ زیب کی وفات پر مرثیہ بھی کہا ہے۔ اس مرثیہ میں اثر اور سوز و گداز ہے اور یہ شعری تخلیق اُن کے عام اندازِ کلام سے مختلف ہے۔

اورنگ زیب مر گئے، نیکی جگت میں کر گئے
تخت اور چھپر کٹ کو دھر گئے، آخر فنا آخر فنا
مواخدا کی یاد میں، رکھا اورنگ آباد میں
خبریں گئیں بغداد میں، آخر فنا آخر فنا

---

[۴] میر محمد خاں بہادر سرور، عمدۂ منتخبہ صفحہ ۵۵۲، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء

[۵] مطبوعہ نسخوں میں قدیم تر نسخہ جو ہمیں مل سکا وہ مطبع محمدی دہلی کا ہے۔ یہ ۱۲۸۹ھ میں طبع ہوا۔ مخطوطۂ رام پور میں سالِ کتابت درج نہیں کیا گیا۔ اس کے کاتب غلام محی الدین ہیں۔ ان کے علاوہ دو تین اور مطبوعہ نسخے بھی نظر سے گزرے، ان سب میں اورنگ زیب سے متعلق اور بعد کے تاریخی واقعات کے بارے میں نظمیں مشترک ہیں (اگرچہ ہر نسخہ میں زبان کی کچھ نہ کچھ تبدیلی موجود ہے) اس بنا پر ہمارے خیال میں یہ کلام الحاقی نہیں ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے بعد تخت محمد اعظم بہادر شاہ اول کے حصہ میں آیا۔ میر جعفر نے ایک نظم ''درصفتِ جلوس اعظم شاہ بعد عالم گیر'' کہی ہے۔ عنوان سے یہ خیال ہوتا ہے کہ تخت نشینی کے موقع پر یہ نظم کہی گئی ہوگی' لیکن نظم پڑھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ یہ تخت نشینی کے خاصے عرصے بعد کی نظم ہے۔ ''خاصے عرصہ'' کا ٹکڑا ہم نے بہادر شاہ اول کے مختصر عہد حکمرانی کی نسبت سے استعمال کیا ہے' اور اس میں عبد الصمد صوبہ دار لاہور کا نام بھی عزت کے ساتھ لیا گیا ہے۔ جعفر کے ایسے کلام سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جہاں ہجو میں بے لگام ہیں' وہاں مدح میں حقیقت پسند ہیں اور تعریف کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھتے ہیں۔ اس نظم کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

گزشتہ عہدِ عالم گیر' اعظم شاہ آیا ہے
بہادر شاہ غازی نے پلک میں بل مٹایا ہے
گرو کو گھیر ماریں گے پکڑنے میں پچھاڑیں گے
کفر کی جڑا کھاڑ (و) حکم (ہی) رب کا یو آیا ہے
جو عبد الصمد غازی نے لیا ہے گھیر کافر کو
پکڑ بیگار کاری گر سکھوں کا سر منڈایا ہے

میر جعفر کے عہد میں اخلاقی اقدار' مغل سلطنت کی مرکزیت کی طرح بکھرنی شروع ہوگئی تھیں۔ ایک طرف لوگ باہمی تعلقات اور رشتوں کے آداب بھولنے لگے تھے تو دوسری طرف حاکموں کے ذہن میں عدل و انصاف کا کوئی تصور نہ رہا تھا۔ ظلم قانون بن گیا تھا اور ہنرمندوں کے در بدر رسوائی کے ساتھ پھرنے کا دور شروع ہوگیا تھا۔ جعفر زٹلی نے ''دراحوالِ دنیا و اہل دنیا'' کے عنوان سے انہیں مسائل کو پیش کیا ہے۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے — ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائی میں وفاداری — محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی' عمر سب جھوٹ میں کھوئی — اُتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

اسی عہد کا مرقع جعفر نے ایک اور نظم میں نہایت ابتذال کے ساتھ پیش کیا ہے جس کا مشہور مصرعہ یہ ہے۔

بادشاہی ہے بہادر شاہ کی

اس نظم کا لب ولہجہ اُس عہد کی اخلاقی موت کا نوحہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ میر جعفر زٹلی کو ان کی ''سِکّہ نویسی'' کے جرم میں فرخ سیر نے قتل کرا دیا تھا۔ ہمیں اس روایت کی کوئی حتمی شہادت نہیں مل سکی، مگر بیشتر مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے یہ روایت دُہرائی ہے۔ سکّہ یہ ہے

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر بادشاہِ دانہ کش فرخ سیّر

عالمگیر کے بعد ہنگامی حالات میں دکن کی شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بہت سے شاعروں کا کلام ضائع ہوا ہوگا۔ اب اُس عہد کے بعض شاعروں کا کلام دستیاب ہوا ہے۔ ایسے ہی ایک شاعر شاہ عبدالرحمٰن قادری ہیں ان کی ایک طویل مثنوی ''باغ حسینی'' ہے۔ ڈاکٹر زور نے ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں لکھا ہے کہ اس مثنوی میں سولہ ہزار سے زیادہ شعر تھے۔ شاہ عبدالرحمٰن بیجاپوری شاعری تھے۔ وہ بہادر شاہ اول کے مقربوں میں شامل ہو کر دہلی بھی گئے تھے۔ اُن کی مثنوی میں بیجاپور کا مرثیہ بھی ہے اور عالمگیر کی مذمت بھی

جو اُس وقت میں تھا بیجا پور شہر سو اُس شہر کی تھی جہاں میں خبر
جِتی خلق واں کی وضیع و شریف سخی، مہرباں، ہور بھو تج لطیف
جو آویں بزرگاں مرے شہر میں رکھیں کر وطن اپنا آرام سیں
خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا اُسی کے کرم سوں وہ منصور تھا
ہوئے بادشاہ جب سوں اورنگزیب کیے اُس کے لینے کے تئیں کئی فریب

(کذا)

دیئے بھیج فوجاں کو اول شتاب جو جا کر کریں ملک سارا خراب
پچھیں آپ آ ایک حیلے ستے لیے شہر ہور ملک سب غصب تھے

شمالی ہند میں مغلوں کی دفتری اور درباری زبان فارسی تھی' لیکن اُردو آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ اکابر شعراء بھی ''تفنن طبع'' کے طور پر ریختہ سے شغل فرما لیتے۔ عوامی سطح پر فارسی یہ لسانی جنگ ہار رہی تھی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دہلی میں دیوان ولی کے پہنچنے کے بعد ۱۱۳۳ھ (مطابق ۱۷۲۰ء) کے لگ بھگ اردو شاعری کا آغاز اور رواج ہوا' لیکن مسعود حسن رضوی نے فائز کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق فائز اپنا دیوان ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں مرتب کر چکے تھے۔

فائز کی اولیت کے سلسلہ میں جناب مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے:

فائز کا کلیات مرتب ہونے کے ایک سال بعد حاتم نے فارسی میں اور پانچ سال بعد اردو میں شعر کہنا شروع کیا' اس طرح حاتم اور ان کے ساتھ دیگر شعراء پر ان کا تقدم ثابت ہے۔[۶]

لیکن اسی صفحہ پر آگے چل کر مسعود صاحب فرماتے ہیں:

حاتم کے ہم عصروں میں غلام مصطفیٰ خاں یک رنگ بھی تھے' مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاتم سے بہت پہلے اردو میں شعر کہنے لگے تھے۔ فائز نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں یک رنگ کا ایک مصرع تضمین کر دیا ہے۔ وہ مقطع یہ ہے:

فائز کو بھایا مصرع یک رنگ اے سجن
گر تم ملو گے غیر سے دیکھو گے ہم نہیں[۷]

ایک ہی صفحہ کے یہ دونوں بیانات ہمارے نزدیک متضاد ہیں۔ ایک طرف تو یہ فیصلہ (دیوانِ فائز کی تدوین کی بنا پر) کہ حاتم کے ساتھ اردو شاعری شروع کرنے والے ''تمام شاعروں پر فائز کا تقدم ثابت ہے'' اور دوسری طرف یہ اعتراف کہ یک رنگ '' حاتم سے بہت پہلے اردو میں شعر کہنے لگے تھے'' ''بہت پہلے'' میں بڑی گنجائش ہے۔ زیادہ تفصیل میں گئے بغیر یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ خود مسعود صاحب کے

---

۶ مسعود حسن رضوی (مقدمہ) دیوانِ فائز' ص ۸' طبع اول ۱۹۴۶ء

۷ حوالۂ بالا

بیانات کی روشنی میں یک رنگ پر فائز کا تقدم ثابت نہیں ہوتا۔ یقینی طور پر یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ یک رنگ نے وہ غزل کب کہی جس کے مصرع کی تضمین فائز نے کی ہے' بہرصورت یہ غزل ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) سے پہلے کی ہے اور اندازہ یہی ہوتا ہے کہ یک رنگ اُس وقت شاعر کی حیثیت سے ایسی حیثیت کے مالک بن چکے تھے کہ فائز نے ان کے مصرع کی تضمین کی۔

بعض بیانات تذکروں میں ایسے بھی ملتے ہیں جن کی روشنی میں خان آرزو متقدمین کے طبقۂ اول میں بھی اولیت کے شرف کے مالک نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر تقی میر نکات الشعراء میں ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ہمہ استادانِ مضبوط فن ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگ وارانند"۔ ۸

شیخ علی حزیں جیسے استادِ فن اور فارسی کے مشہور شاعر سے ان کے معارضہ کا سبب بھی لسانی تھا۔ خان آرزو اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ شخصیت کا مکمل اظہار اپنی زبان ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ خانِ آرزو کی لغت نویسی بھی اس عہد کی شاعرانہ اور ادبی فضا کا ایک حصہ ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں ان کا ذکر اور اس ادبی نزاع کا حال ان الفاظ میں ملتا ہے۔

"شخصے عمدہ معاش و ذہین و بلند طبع' در علم و فضل یگانہ...... در عہد فردوس آرام گاہ با شیخ محمد علی حزیں کہ در آں عصر حاویٔ علوم و یکتائے زمانہ بود' معارض شدہ اعتراضات بر اشعارِ شیخ صاحب مرحوم نمود و رسالہ مسمّٰی بہ تنبیہ الغافلین ترتیب دادہ"۔ ۹

ان معروضات سے ہمارا مقصد اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری محض ولی کی کرامت کا کرشمہ نہیں ہے۔ اس کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا' ہاں' ولی کے اثرات نے تفننِ طبع کے مشغلہ کو سنجیدگی عطا کر دی اور شمالی ہند میں اردو شاعری کی

---

۸ میر تقی میر۔ نکات الشعراء

۹ سرور۔ عمدۂ منتخبہ۔ صفحہ ۷

ایک مسلسل روایت قائم ہوگئی۔ اردو شاعری نے جس تیزی کے ساتھ دہلی کی فضا کو مسخر کیا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کو ابھی نصف صدی ہی گزری تھی کہ دہلی میں اردو کے قابلِ ذکر شاعروں کی تعداد سینکڑہ سے آگے بڑھ چکی تھی۔ میر کے ''نکات الشعراء'' میں ۱۰۳ شاعروں کا ذکر ہے اور میر صاحب اپنے انتخاب میں خاصے سخت تھے۔ اس کے بنیادی سبب کی طرف گزشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے' یعنی فارسی عوامی سطح پر اپنی جنگ بڑی حد تک ہار چکی تھی اور شعر و ادب کے محاذ پر بھی پسپا ہو رہی تھی۔

یوں زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے دلّی میں ریختہ کی بنیاد رکھی' لیکن ولی دکنی کے اثرات نے دلّی کو اردو شعر و سخن کا باقاعدہ دبستان بنا دیا۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں ایک طرف ولی نے دلّی کو اردو شاعری کا گلدستہ پیش کیا وہاں دلّی نے ولی کی زبان کو ایک نیا رنگ اور آہنگ عطا کیا۔ ولی کے کلیات میں لسانی نقطۂ نظر سے واضح طور پر دو رنگ موجود ہیں۔ وہ غزلیں جن پر دکنی اثرات غالب ہیں اور وہ غزلیں جو زبان کے اعتبار سے دلّی کے اثرات کی غماز ہیں۔

قائم نے ''مخزنِ نکات'' میں ۱۱۱۲ھ (م ۱۷۰۰ء) میں ولی کے سفر دہلی کا ذکر کیا ہے۔ اس روایت کو بعد کے تذکرہ نویس دہراتے آئے ہیں۔ کوئی شہادت اس کے خلاف نہیں ملتی۔ اس بات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے ولی کی آمد سے ہی دہلی میں اردو شاعری کا چرچا عام ہوا ہو۔

ولی دکنی (گجراتی) کی غزل میں اعلیٰ شاعری کے عناصر موجود ہیں' لیکن ان کی دروں بینی' میر کی اس دروں بینی سے مختلف ہے جو خارجی واقعات و کوائف کو بھی داخلیت کے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ ولی اپنے جذبہ کی دنیا اور تصوف کی وادیوں میں گم ہیں۔ یہی گم گشتگی ان کا سفر ہے۔ اُن کی غزلوں میں حسن کا ہر رنگ اور جذبہ کی بہت سی سطحیں اور تہیں موجود ہیں' مگر وہ اپنے دور کے مخصوص حالات کی ترجمانی غزل کی علامتوں کے ذریعہ بھی کم ہی کرتے ہیں۔ بہر حال ولی کے ہاں ایسے اشعار بھی مل جاتے

ہیں جو تاریخی پس منظر رکھتے ہیں اور اپنے دور کے حالات کی پیداوار ہیں۔ اس ضمن میں ان اشعار کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو ہمیں شاعری کی تاریخ اور رجحانات کے بارے میں بعض غلط فہمیوں سے بچا لیتے ہیں۔ مثلاً عام طور پر ہمارے نقاد یہ کہتے آئے ہیں کہ محبوب کو نسائی پیکر لکھنؤ کے شاعروں نے دیا ہے' ورنہ اس سے پہلے اردو غزل کا محبوب امرد یا تھا یا ''بے جنس سی ایک شے۔'' ولی کے کلیات کا ہر صفحہ اس کی محبوبہ کی نشان دہی اسی طرح کرتا ہے جیسے نسیم کے سفر سے بوئے گل کا سراغ ملتا ہے۔ ولی کا شاعرانہ کمال یہ ہے کہ اس نے زیورات و ملبوسات کا سہارا کم سے کم لیا ہے' اور اسی طرح محبوب کے سراپا میں اعضائے جسمانی کی وضاحت و جراحی کرنے کی جگہ ایک مجموعی تاثر پیش کیا ہے۔

ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گل گشت چمن
اے چمن زارِ حیا! دل کے گلستان میں آ

❀❀❀

تجھ چال کی قیمت سوں دل نیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل! ٹک بھاؤ بتاتی جا

❀❀❀

موج دریا کو دیکھنے مت جا دیکھ اس زلفِ عنبریں کی ادا

اسی کے ساتھ ساتھ ولی کے ہاں ہم صنفی جنسی رجحانات بھی ہیں جنہیں اس مطالعہ کے آخری باب میں پیش کیا گیا ہے۔

ولی کی غزلوں میں واقعاتی پہلو بھی کہیں کہیں اُبھر آیا ہے۔ انگریزوں سے پہلے جن بدیسی طاقتوں نے برعظیم میں حصولِ قوت کے لیے قسمت آزمائی کی اُن میں پُرتگال بھی شامل ہے۔ پرتگالیوں کے ساتھ ان کی شراب بھی آئی اور اس طرح کہ تیز نشہ کا اشارہ بن گئی۔ اسی طرح ''فرنگ'' کا لفظ ہماری زبان میں مدتوں صرف انگریزوں کے لیے

استعمال ہوا ہے۔ ولی نے پُرتگالی شراب کے ساتھ ساتھ ''کفارِ فرنگ'' کا ذکر کر کے اُن کے بارے میں اپنے جذباتی ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔

ولی تجھ شعر کو سنتے ہوئے ہیں مست اہلِ دل
اثر ہے شعر میں تیرے شرابِ پُرتگالی کا

❀❀❀

کفارِ فرنگ کو دیا ہے تجھ زلف نے درس کا فری کا

ولی دکنی کا ایک شعر ہے۔

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد سب ہندوستاں
حسن کی دہلی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی مرحوم کی تحقیق کے مطابق جب ولی نے ۱۱۱۲ھ میں دہلی کا سفر کیا تھا تو اُس وقت دلّی کا صوبہ دار محمد یار خاں تھا' اور یوں یہ شعر ولّی کے سفرِ دہلی کی ایک شہادت بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مراۃ عالمگیری کے حوالہ سے محمد یار خاں کی صوبہ داری کا زمانہ ۱۱۰۸ھ سے ۱۱۱۴ھ تک لکھا ہے۔[۱۰]

ولی کے دور میں تخت و تاج کے بارے میں تصورات بدل گئے تھے۔ بادشاہت کا ادارہ اپنی وقعت کھو رہا تھا۔ اس حقیقت نے تخت اور تاج کے ذہنی تلازموں کو بدل دیا۔

تخت جس بے خانماں کا دشتِ ویرانی ہوا سر اُپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا

اسی طرح اہلِ ہُنر کو ان کے ہُنر کا صلہ دینے والے نہیں رہے تھے۔ ولّی اپنی تمام بے نیازی کے باوجود اس صورت حال کے احساس سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنے دور میں اہلِ ہُنر کی بے قدری نے انہیں ماضی کے واقعات اور تاریخ کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس میں قدرے تسکین کا پہلو بھی تھا۔

جگ میں نیں اہلِ ہُنر' اپنے ہُنر سوں بہرہ یاب
کوہ کن کوں فیض کب پہنچا ہے جوئے شیر سوں

۱۰۔ نور الحسن ہاشمی' مقدمہ کلیاتِ ولی' انجمن ترقیٔ اردو پاکستان طبع سوم' ۱۹۵۴ء

ولی کے غزلوں میں مقامی رنگ کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ اس مقامی رنگ میں تہوار، نہان، مقامات اور مختلف قوموں کا ذکر بھی شامل ہے۔ ولی، اُن کے پیش رو شاعروں اور ہم عصروں کی شاعری اس تہمت کی تردید کرتی ہے کہ اردو شاعری نے اپنے گرد و پیش کے مناظر سے آنکھیں بند کر لیں اور ایران کی جلوہ سامانی اور بہار آفرینی کا خیالی نقش پیش کرتی رہی۔

گنگاروان کیا ہوں اپس کے نین سی   آ اے صنم! شتاب، ہے روزِ نہان آج

دسے سوکھے سو تجھ انکھیاں کی یودھج
کہ جیوں برچھی پکڑ نکلا ہے رجپوت[۱۱]

ولی دکنی نے اگرچہ اپنے محبوب کے ذکر میں فارسی شاعروں کے تخلصوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کی شاعری پر بھی فارسی کا اثر بہت گہرا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اردو کی انفرادیت کے نقیب بھی ہیں۔ انہوں نے جہاں کہیں فارسی کے شاعروں سے اپنا مقابلہ کیا ہے اور شاعرانہ تعلی سے کام لیا ہے، وہاں اپنی تعریف کے پہلو کے ساتھ ساتھ لہجہ سے ریختہ کی عظمت بھی ٹپکتی ہے۔

ہم پاس آئے بات نظیری کی مت کہو
رکھتے نہیں نظیر اپس کی سخن میں ہم

غزلوں کے علاوہ ''کلیاتِ ولی'' میں فردیات، رباعیات، چار در چار، مخمس، مستزاد، ترجیع بند، قصائد، مثنویات اور قطعات موجود ہیں۔ ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو شاعروں نے کبھی اپنے آپ کو ''تنگنائے غزل'' تک محدود نہیں رکھا۔ ولی سے پہلے کی دکنی شاعری بھی اسی حقیقت کی شہادت ہے۔

مثنوی ''در تعریف شہر سورت'' اگرچہ مختصر ہے، لیکن اُس سے کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹنے اور پیش کرنے کے باب میں ولی کی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار

---

۱۱ یہ شعر قدرے تبدیلی کے ساتھ آخری باب میں بھی درج کیا گیا ہے۔ اس سے ولی کے کلام کے مختلف نسخوں کے اختلافات کا ادنیٰ سا اندازہ ہو سکے گا۔

ہوتا ہے۔ اس مثنوی میں سورت کا جغرافیہ اور وہاں کے حسن و جمال کا تذکرہ بھی ہے۔ لوگوں کی شرافت کا نقشہ' تجارت کی گرم بازاری کا مرقع اور مختلف قوموں اور فرقوں کا جائزہ' سبھی کچھ ہے۔ حسینوں کے ذکر سے خارجیت میں نہایت خوشگوار داخلیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ ولی نے انگریزوں کا ذکر اگرچہ ایک ہی شعر میں کیا ہے لیکن یہ شعر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

اہے سورت حقیقت کی نشانی کہ ہیں معمور واں اہل معانی
اتی آتش پرستاں کی ہے بستی سکھے نمرود واں آتش پرستی
فرنگی اس میں آتے ہیں کُلہ پوش عدو واں جن کی گنتی میں ہے بے ہوش

ولؔی نے اپنے وطن گجرات کے بارے میں بھی ایک قطعہ کہا ہے۔ ولی کی زندگی پردیس میں گزری۔ یہی اس دورِ انتشار کا چلن تھا۔ لیکن یادِ وطن انہیں تڑپاتی رہی۔ دوستوں کے باب میں وہ خوش نصیب تھے مگر بچپن اور جوانی کے دوست زندگی کے ہر موڑ پر یاد آتے ہیں۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل بیتاب ہے سینہ ئیں آتش بہار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل

ولؔی' اردو غزل کے اس دور کے معمارِ اول ہیں۔ حاتم اور میر اُن کے مرتبہ کا اعتراف کرتے ہیں' لیکن شاید ان کے عہد نے ان کے فن کی حقیقی قدر نہیں کی۔ جب معاشرہ کا مزاج معتدل نہ ہو تو اربابِ سخن' شعر و سخن کی ناقدری کا گلہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بازار میں جہاں کے نہیں کوئی اے ولی
تیرے سخن کا آج خریدار' الغیاث

مرزا عبدالقادر بیدل' قزلباش خاں امید اور نواب امیر خاں انجام سے بھی اردو کے چند اشعار منسوب ہیں۔

بیدؔل کا نام ہماری شاعری کی تاریخ میں غالب کی وجہ سے زندۂ جاوید ہوگیا

ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ دو شعر بیدلؔ کے کہے جاتے ہیں:

مت پوچھ دل کی باتیں' یہ دل کہاں ہے ہم ہیں[۱۲]
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے؟ ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہیں' ہم ہیں

ان اشعار کو ہم نے اردو کے تاریخی لسانی ارتقاء کے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ ان کی زبان اس درجہ صاف ہے کہ اس عہد کی عمومی زبان سے مطابقت نہیں رکھتی۔ دوسری طرف میر اور قائم کے تذکروں میں یہ شعر بیدل سے منسوب ہیں۔ اُردو کے قدیم تذکروں میں ان اشعار کی موجودگی کے پیشِ نظر انہیں نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

مزید برآں زبان کی تازگی کا سراغ طویل ردیف اور فارسی ترکیب "تخمِ بے نشاں" میں لگایا جا سکتا ہے۔

قزلباش خاں اُمید' ایران سے عالمگیر کے عہد میں آئے تھے۔ فارسی مادری زبان تھی اور اس میں دادِ سخن دیتے تھے۔ قدیم تذکروں میں ان کے چند اردو شعر ملتے ہیں' لیکن ان سے ہمارے اس خیال کو اور تقویت پہنچتی ہے کہ شمالی ہند میں اردو زبان ادب کے میدان میں تیزی کے ساتھ فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ انتہا یہ کہ ایک ایرانی شاعر بھی اپنے آپ کو اسیرِ ریختہ ہونے سے نہ بچا سکا۔

نواب امیر خاں انجام بھی ایرانی النسل تھے اور صفوی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد شاہ کے مصاحب اور دربار کے معزز امیر تھے اور دوسروں کے لیے محسود۔ نادری حملہ کے بعد الٰہ آباد کے صوبہ دار بنائے گئے۔ یہ بات انہیں اتنی ناگوار گزری کہ جب

۱۲۔ بعض تذکروں میں "ہم میں" کی ردیف ملتی ہے۔

محمد شاہ نے واپس بلوایا تو یہ مطلع ایک درخواست میں لکھ کر بھیج دیا۔

اب یہی احسان ہے ہرگز نہ ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں گے کیا لے کے منہ صیاد ہم [۱۳]

اگر اس شعر کی تخلیق (یا استعمال) کا یہ پس منظر درست ہے تو اس سے اردو غزل کے اشاروں اور علامتوں کے معانی کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ ''چمن'' سے دہلی مراد ہے اور ''صیاد'' کس درجہ وضاحت کے ساتھ محمد شاہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

بیدلؔ، امید اور انجام اردو کے باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ سراج الدین آرزو فارسی گوئی میں اپنے مرتبہ کے باوجود ہمارے نزدیک ریختہ کے اہم شاعر ہیں۔ اس بات پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

خانِ آرزو فرخ سیر کے ملازم تھے اور اس سلسلہ میں کچھ عرصہ گوالیار میں بھی رہے۔ اُن کا سالِ وفات ۱۱۶۹ھ (م ۱۷۵۶ء) ہے۔ انتقال لکھنؤ میں ہوا، مگر دہلی میں دفن کیے گئے۔ ان کے عہد میں زندگی اتنی بے وقعت ہو چکی تھی کہ وہ محبوب پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں، کیونکہ اسے بھی تو ''جان'' کہتے ہیں۔

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

قاتل کے اشارے میں ''صیاد'' کی طرح جو سیاسی رنگ ہے، وہ آرزو کے اس شعر میں نظر آتا ہے۔

داغ چھوٹا نہیں، یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دُکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے

نجم الدین آبرو (عرف شاہ مبارک) سراج الدین آرزو کے عزیز اور شاگرد تھے۔ حضرت محمد غوث گوالیاری کی اولاد سے تھے۔ ایہام گوئی کے استاد تھے اور اسی کے ساتھ امرد پرستی کے رجحان کے نقیب بھی۔ کتاب خانۂ رام پور میں ان کا دیوان موجود

۱۳؎ گردیزی اور قاسم نے دوسرا مصرع یوں نقل کیا ہے

پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے اے صیاد ہم

ہے۔ اس دیوان میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو شاہی دور کی زندگی کا مرقع ہیں۔ ایہام گوئی، لفظ پرستی اور محمد مکھن کی رفاقت بھی انہیں غمِ جہاں سے بے نیاز نہ کرسکی۔

اب زمانہ بری طرح بگڑا کیا بنے روزگار کی صورت
اس زمانے کی دوستی کے تئیں کچھ نہیں اعتبار کی صورت

محمد شاہی دور کا تاریخی جائزہ پیش کیا جاچکا ہے۔ اُس کی روشنی میں اس شعر کے خدوخال پوری طرح ابھر سکتے ہیں۔

زنانے بھی لگے مردی پکڑنے کسب سیکھا چماری نے نری کا

دہلی میں شاہ آبرو کے لیے دل لگانے کے کتنے ہی وسیلے اور ذریعے تھے مگر محمد مکھن اور صاحب رائے کی سنگت بھی انہیں تنہائی کے احساس سے نجات نہ دلاسکی۔

دِلّی میں درد دل کا کوئی پوچھتا نہیں مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

فائز کے دیوان اور اس کے سالِ ترتیب کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ انہوں نے اپنے دیوان پر ۱۱۴۲ھ (م ۳۰-۱۷۲۹ء) میں نظرِ ثانی کی۔ دیوان کی کئی غزلیں ولؔی کی زمینوں میں ہیں۔ اس کے علاوہ آرزو، آبرو اور حاتم کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سبب اس عہد کا مذاقِ سخن ہوسکتا ہے۔

فائز کے رسالۂ مناظرات پر ان کا نام ''نواب صدرالدین محمد خاں'' درج کیا گیا ہے۔[۱۴] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں نواب اور خان کے خطابات بھی ملے تھے۔ فائز کے ایک شعر سے اُن کی جاگیر کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جو ان کے حوصلے کی نسبت مختصر تھی لیکن انہوں نے ''قناعت کی یاد'' سے اپنے آپ کو تسلی دے لی تھی۔

اگر بہت نہ ملی ہم کو غم نہیں حاصل ہمارے مُلکِ قناعت کا کم نہیں

فائز کے مختصر سے دیوان میں کئی چھوٹی چھوٹی نظمیں مثنوی کے فارم میں موجود ہیں۔ ان کے ہاں بھی اگرچہ امرد پرستی کی جھلک نظر آتی ہے، لیکن محض اس حد تک کہ اسے روایت کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ فائز رنگین طبع آدمی تھے، مگر اُن کی شاعری کی

---

[۱۴] مسعود حسن رضوی، مقدمۂ دیوانِ فائز، ص ۴۵

شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ذوقِ نشاط نظارہ حُسنِ نسائی تک محدود تھا۔ ''جوگن'' ''کاچن'' ''تنبولن'' اور درگاہِ قطب کی ''بھنگڑن'' وغیرہ کی تعریف میں انہوں نے اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کرداروں کے علاوہ ان کے کلام میں ہولی، پنگھٹ، بہتے کا میلہ اور تکنبود کے نہان کے مناظر بھی ہیں، جن میں ان کے دیکھنے کا زاویہ نہیں بدلتا۔ ان نظموں میں حُسن کے عمومی مناظر ہی نہیں بلکہ سماجی اور تاریخی پس منظر ہر جگہ موجود ہے۔ بھنگڑن پر ان کی نظم سے شراب خانوں اور بھنگڑ خانوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ ''بہتے کا میلہ'' کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں ((بیشتر پیشہ ور) سے اختلاط کے مواقع اس عہد کی دہلی میں وافر تھے۔ فائز کی نظموں میں موضوعات کے علاوہ اندازِ بیان میں بھی مقامی رنگ نمایاں ہے۔ اسی مقامی رنگ نے کئی نئی اور لطیف تشبیہوں کو جنم دیا ہے۔

جوگن کو انہوں نے اس طرح دیکھا اور دکھایا ہے۔

نہیں چُھپا تن بھبھوت میں سارا　　راکھ میں حسن کا ہے انگارا

جُوڑا بالوں کا باندھ کر جوگن　　بیٹھی تھی کنڈلی مار اک ناگن

جُوڑا نہیں گیند ہے کنہیا کی　　یا سہس ناگنی ہے دریا کی

''بہتے کا میلہ'' بیانیہ شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے جس میں شاعر نے ہر منظر پر نظر ڈالی ہے، لیکن اُس کی توجہ کا اصل مرکز حسین نسوانی پیکر ہیں۔

آج بہتے کا یار میلا ہے　　خلق کا اس کنار ریلا ہے

میوہ اور شیرینی ہے سب اقسام　　اُردو بازار بل گیا ہے تمام

جاتے اس جا امیرؔ فیل سوار　　خوب رویوں سے واں لگا دربار

اور جانب میں کنچنی بازار　　اُن سے روشن ہوئی و شب تار

ایک جانب میں بھانڈ کا ہے شور　　دیکھنا اُن کا اہلِ دل کو ضرور

سب چکورے بھنگیڑے خانے پر　　جیسے کوّے ہیں آشیانے پر

بہل ورتھ میں بھری ہیں سب عورات　　آشنا ساتھ اپنے کرتیں بات

سیر کرتی ہیں اس طرح ہر سو سب نظر میں ہے چشم اور ابرو
کلکلاتی ہیں آب میں ہر دم طاق پر دھر رکھی ہے سب نے شرم
کارِ بد میں سبھی ہیں آلودہ فستق میٹھا ہے، جیسے فالودہ

حاتم اس عہد کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے اتنی طویل عمر پائی کہ شاعری کے ذوق کو بدلتے ہوئے دیکھا اور اس تبدیلی کا ساتھ دیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر اُن کی اولیت کے باجود ان کا ذکر ان کے بعض دوسرے معاصرین کے ذکر کے بعد مناسب رہے گا۔ یہ وہ معاصرین ہین جن کو شاہِ حاتم نے اپنے رفیقوں میں شمار کیا ہے اور ''دیوان زادہ'' کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے۔ مصحفی کی روایت بھی اس باب میں موجود ہے اور وہ بھی شاہِ حاتم کی زبانی۔

روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در
سن دویم فردوس آرام گاہ دیوانِ ولی
درشاہجہاں آباد آمدہ، و اشعارش
برزبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ بادوسہ
کس کہ مُراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد
بنائے شعر ہندی راہ بہ ایہام گوئی نہادہ
دادِ معنی یابی و تلاش مضمونِ تازہ می دادیم [۱۵]

شاکر ناجی نے اپنے دور کے امیروں اور فوج کا خاکہ ایک شہر آشوب میں اڑایا ہے بعض لوگ اسے نواب امیر خاں انجام کی شخصیت تک محدود کرتے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں یہ عمومی نقشہ ہے جس سے ہندوستانی فوج کی بزدلی اور نادر شاہی حملہ کے موقع پر اس کی پست ہمتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دور میں ''شہر آشوب'' کی صنف کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، کیونکہ عہدِ محمد شاہی بہت عبرتناک دور تھا۔ اس زمانے کے مصنفوں پر اپنے عہد کی مصیبتوں اور ہلاکت خیزیوں کا اثر اس درجہ نظر آتا ہے کہ

۱۵ مصحفی، تذکرۂ ہندی، صفحہ ۸۰

"کتابوں کے عنوان اور نام بھی اس کا اظہار کرتے ہیں"۔ [۱۶]

صاحب "مجموعۂ نغز" نے شاکر ناجی کے شہر آشوب کے دو بند نقل کیے ہیں۔

لڑے ہوئے تو برس بیس اُن کو بیتے تھے
دوا کے زور سے دائی دوا کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیں، بازو اُپر طلا کی نال
قضا سے بچ گیا، مرنا نہیں تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اُپر نشانہ تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں، نہ کھانا تھا
ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دوکاں، نہ غلہ و بقال

شرف الدین مضمون اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ عنفوانِ شباب میں دہلی آ گئے، یہ بھی خانِ آرزو کے شاگرد تھے۔ مضمون نے غزل کے اشاروں میں اپنے عہد پر تبصرے کیے ہیں۔ وہ فارسی غزل کے اشاروں کو اردو میں نئی معنویت عطا کرنے والوں میں شامل ہیں۔

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جورِ باغباں

مصطفیٰ خاں یک رنگ بھی اسی عہد کے شاعر ہیں۔ شاہ آبرو اور ناجی کے اس ہم عصر کے کلام میں بھی اس عہد کے عمومی حالات کا عبرتناک نقشہ نظر آتا ہے۔ زندگی کی بہار سامانی ختم ہو گئی تھی اور بہار سے تعلق خزاں کے آثار کی بنا پر قائم تھا۔

یاد آتی ہے تازگئی بہار دیکھ کر خشک خار کی صورت

---

[۱۶] ڈاکٹر سید عبداللہ، مباحث، صفحہ ۶۔۲۱۵، مجلسِ ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۵ء

شیخ ظہور الدین حاتم طبقۂ متقدمین میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جس نے اپنی ہر غزل پر سنِ تصنیف درج کیا ہے۔ اس سے اُن کی غزلوں کی علامتوں اور مضامین کے سیاسی اور تاریخی پہلو اُجاگر ہو جاتے ہیں۔ سن کے علاوہ انھوں نے ہر غزل کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ کس شاعر کی زمین میں لکھی گئی ہے۔ اس سے شعراء کی مقبولیت کا زمانہ معلوم ہو جاتا ہے۔ شاہ حاتم نے چھیاسی سال کی طویل عمر پائی اور وہ دور نہایت تیز ادبی تبدیلیوں کا دور تھا۔ حاتم نے اِیہام گوئی کو اپنا فن بنایا تھا مگر جب مرزا مظہر جانجاناں، میرؔ اور خود حاتم کے شاگرد سودا نے ایہام گوئی کو ترک کیا تو شاہ حاتم نے اپنے آپ کو نئے ادبی ذوق اور تقاضوں کے سانچے میں ڈھال کر اپنے کلام کا انتخاب کیا۔ شاہِ حاتم کی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ سودا، تاباں اور رنگین وغیرہ جیسے شاعروں کے استاد ہیں۔

شاہِ حاتم کی زندگی بھی اس عہد کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ مصحفی نے ''عقدِ ثریا'' میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے انسانی نفسیات پر مصحفی کی گہری نظر کی شہادت ملتی ہے۔ شاہ حاتم جوانی میں سپاہی پیشہ تھے۔ اس دور میں چندے ''رمز'' تخلص کیا۔ دِلّی کے ''امیر زادہ ہائے والاتبار'' اور روسائے ذوالاقتدار'' ان کے قدرداں تھے۔ مسند پر اپنے برابر جگہ دیتے تھے۔ جوانی کا یہ حصہ عیش و طرب میں گزرا۔ پھر انہیں داروغۂ مطبخ کی خدمت انجام دینی پڑی، جو انہیں پسند نہ تھی۔ دِلّی کے حالات بھی بدل گئے اور ''حالاچوں کسے نہ ماند بسبب مصلحتِ وقت، ہوائے زمانہ را مختلف دیدہ متوکلی و خانہ نشینی اختیار کردہ''۔

مصحفی کے اس تجزیہ سے شاہِ حاتم کی ذہنی کیفیات اور ان کے دور کی ناہمواریاں ہم پر روشن ہو جاتی ہیں۔ صاحبِ مجموعۂ نغز نے اُن کی درویشی کو ''سعادتِ ازلی اور مشیت کی رہنمائی'' کا نتیجہ بتایا ہے، لیکن ہمارے نزدیک مصحفی کی رائے بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن ان کے شہر آشوبوں میں جو مردانہ آہنگ اور زمانہ کے خلاف جس جذبۂ ستیز کا اظہار ہوا ہے، اُس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاتم کی خانہ نشینی اور درویشی

خواہ کسی سبب سے شروع ہوئی ہو مگر اس نے ان کے ذہن اور شخصیت کو بدل دیا تھا۔

شاہِ حاتم کی شاعری کے جائزہ میں مشکل یہ آ پڑتی ہے (اور یہ بات ان کی عظمت کا سبب بھی ہے) کہ ان کا کلام محمد شاہ کے عہد سے شاہ عالم ثانی کے دور تک کے حالات کے شاعرانہ تبصرہ پر محیط ہے۔ مثلاً محمد شاہ کے دور پر اپنی ایک غزل میں انہوں نے یوں تبصرہ کیا ہے ؎

اس زمانے میں نہ ہو کیونکر ہمارا دل اُداس
دیکھ کر احوالِ عالم اڑتے جاتے ہیں حواس

یہ غزل ۱۱۵۸ھ (م ۱۷۴۵ء) کی ہے۔ محمد شاہ کا دور ۱۷۴۸ء تک ہے۔

یوں اس کے عہد کے آخری زمانہ کی کیفیت اور حالت اس شعر میں سمٹ آئی ہے۔

شاہ حاتم کے طویل عہد میں امراء عیش و عشرت میں اس طرح گم تھے کہ مذہب سے کوئی گہرا علاقہ نہیں رہ گیا تھا۔ مذہبی تقریبات، نیم مذہبی اور نیم معاشرتی تہواروں میں بدل گئی تھیں۔ امیروں کے اس رویہ کو شاہِ حاتم نے یوں پیش کیا ہے۔

عجب احوال دیکھا اس زمانے کے امیروں کا
نہ اُن کو ڈر خدا کا اور نہ اُن کو خوف پیروں کا

شاہِ حاتم کے مشہور "مخمس شہر آشوب" کا تفصیلی بیان بہت ضروری ہے۔ عبد الباری آسی مرحوم نے "دو نایاب بیاضیں" میں غالباً پہلی بار یہ لکھا تھا کہ شاہ حاتم نے دہر آشوب یا شہر آشوب کے طرز پر دو نظمیں بارہ صدی کے موضوع پر لکھی تھیں۔ ڈاکٹر محی الدین زور قادری مرحوم بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ اس کی وجہ بھی انہوں نے خود ہی بتا دی ہے، یعنی جو مخطوطہ انہیں ملا اُس میں بارہ بارہ بند تھے۔ شاہِ حاتم کی نظموں کا ذکر کرنے کے بعد وہ شہر آشوب کے متعلق لکھتے ہیں:

ان نظموں کے علاوہ دو نظمیں ایسی بھی ہیں جو "دیوان زادہ" میں موجود نہیں ہیں۔ انجمن ترقی اردو سے حاتم کا جو قدیم قلمی دیوان مولوی عبد

الحق صاحب نے اپنی عنایت سے مطالعہ کے لیے مرتب کو دیا اُس کے آخر میں دو ترکیب بند موجود ہیں' جن میں سے ہر ایک علیحدہ مستقل عنوان پر لکھا گیا ہے۔ یہ عنوان مخطوطہ میں موجود نہیں ہیں' لیکن ان نظموں کے موضوع کے پیش نظر راقم الحروف نے خود قرار دے لیے ہیں۔ پہلی نظم ''بارہویں صدی'' پر لکھی گئی ہے۔ اس موضوع کی مناسبت سے بارہ بند ہیں اور ہر بند میں پانچ مصرعے''۔ [۱۷]

ڈاکٹر زور مرحوم نے دیوان زادہ کے دو مخطوطات کو دیکھا۔ مخطوطۂ انجمن ترقی اردو' اور مخطوطۂ لندن۔ رام پور کا مخطوطہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا (اور نہ مولانا عبدالباری آسی کی نظر سے)۔ مخطوطۂ رام پور میں یہ نظمیں ''مخمس شہر آشوب'' کے نام سے موجود ہیں اور اس مخمس میں ۲۵ بند ہیں۔ یوں یہ دو نظمیں نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی نظم ہے اور ایسی نظم جسے خود شاہ حاتم نے ایک عنوان دیا تھا جو مخطوطۂ رام پور میں موجود ہے۔ [۱۸]

''یہ مخمس شہر آشوب'' مخطوطۂ رام پور میں صفحہ ۳۳۹ سے صفحہ ۳۴۶ تک درج

۱۷۔ محی الدین زور قادری' سرگزشتِ حاتم' ص ۹۷' ادارۂ ادبیاتِ اردو' حیدر آباد دکن' ۱۹۴۴ء

۱۸۔ رام پور کے مخطوطۂ کا سالِ کتابت ۱۱۸۸ھ (م ۱۷۷۴ء) ہے اور حاتم کا سالِ وفات ۱۱۹۷ھ ہے۔ مخطوطۂ رام پور کے حواشی پر کئی غزلوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ افسوس کہ ایسی بیشتر غزلیں جلد بندی میں کٹائی کی نذر ہو گئیں۔ اس مخطوطہ سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ شاہ حاتم نے جب بھی دیوان زادہ کی نقل کرائی اُس کے دیباچہ پر نظر ثانی کی۔ ''سرگزشت حاتم'' میں ''دیباچہ دیوان زادہ'' کو شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کی عبارت کئی مقامات پر مخطوطہ رام پور سے مختلف ہے' اور اس عبارت سے قریب تر ہے جو آزاد نے ''آب حیات'' میں نقل کی ہے۔
شاہ حاتم نے صرف دیباچۂ دیوان زادہ کی عبارت پر ہی نظر ثانی نہیں کی' بلکہ اُن کے اس ''مخمس شہر آشوب'' کے کئی مصرعے دونوں مخطوطوں میں مختلف ہیں۔ یہ تبدیلیاں لسانی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ''قدرت کرتار'' کی جگہ ''قدرتِ حق'' نے لے لی۔ اسی طرح ہندی کے عناصر کم ہو گئے ہیں اور زبان زیادہ ہموار ہو گئی

ہے۔ اسے سودا کے قصیدۂ شہر آشوب کا ''پیش رو'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ حاتم نے اپنے عہد کے ہر اہم مسئلہ' ناہمواری اور الجھن کو اس میں پیش کر دیا ہے۔ یہ شہر آشوب اس عہد کی ایسی تاریخ ہے جس میں شاعرانہ رنگ و آہنگ حقائق پر غالب نہیں ہوا ہے' اسی لیے کسی مزید تنقید اور تبصرہ کے بغیر اس کے منتخب بند پیش کیے جاتے ہیں۔

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں — امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں — تواضع کھانے کی جا ہو کہیں تو پانی نہیں
گویا جہان سے جاتا رہا سخاوت و پیار
یہاں کے قاضئ و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور
یہاں کے دیکھ لو سب اہلِ کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے اور کی اُور
یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور — یہاں نہیں ہے مدارا بغیر دار و مدار

امیر زادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ — تھے آفتاب پر اب آ گئے زوال کے بیچ
پھریں ہیں چرخی سے ہر دن تلاش مال کے بیچ — وہیں گھمنڈ امارات ہے پھر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو' پر اب تو ہے دشوار
رزالے آج نشے بیچ زر کے ماتے ہیں — پہن لباس زری سب کو سج دکھاتے ہیں
مسی پہ پان کو کھا' سرخرو کہاتے ہیں — کبھو ستار' کبھو ڈھولکی بجاتے ہیں
غرور و غفلت و جوبن کی مدھ میں ہیں سرشار
حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے — جو چور تھے سو ہوئے شاہ' شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے' سو ان دنوں میں زور ہوئے — جنھوں کو زور تھا' سب اب مثال مور ہوئے
جہل کا گھر ہے جہاں میں تو خانۂ خمار
کرے ہے چرخ اگر تجھ اُپر جفا حاتم — تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم — تو ''انقلاب زمانے'' سے غم نہ کھا حاتم
کہ تجھ کو روزی بہت اور روزگار ہزار

اس شہر آشوب کے اختتامی حصہ میں جو حوصلہ اور خدا پر توکل کا اظہار ہے وہ شہر آشوب کی عام روایت سے مختلف چیز ہے۔ اس میں زمانے کے خلاف ستیز کا جذبہ بھی ہے۔

اس مخمس کے بعد دیوان زادہ کے مخطوطۂ رام پور میں ایک دوسرا مخمس شہر آشوب بھی ہے۔ اس کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

بعض جو ہیں بخیل زمانے میں نابکار　　رکھ پیش پلاؤ مربا و ہم اچار
دکھلادیں شان سفری کی ہم کو اگر ہزار　　سیریم ماز نعمتِ الوانِ روزگاریم
برخوانِ ایں گر سنہ نگاہاں مگس نہ ایم

اس بند سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نابکار و بخیل اُمراء کے سامنے حاتم نے ذہنی طور پر اپنا سر نہیں جھکایا اور چند بنیادی اقدارِ حیات انہیں عزیز تھیں۔

اسی دور کے ایک شاعر ''بےنوا'' بھی ہیں۔ مختلف تذکروں میں محمد شاہی دور کے شاعروں کے سلسلہ میں اُن کا مختصر سا ذکر مل جاتا ہے۔ تاریخی جائزہ میں ہم سُبھ کرن جوہری اور جوتا فروشوں کے ہنگامے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان اس برعظیم میں کبھی ایک قوم کی طرح نہیں رہے۔ بےنوا نے اپنے شہر آشوب کا بنیادی موضوع اسی واقعہ کو بنایا ہے اور انہیں اس بات کا شدّت سے احساس اور کرب ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں ایک مردِ مسلمان کو ہندو جوہری نے مار دیا۔ یہ واقعہ عوامی ہنگامہ میں بدل گیا تھا اور اُس کا خاتمہ سُبھ کرن جوہری کی حویلی کے انہدام پر ہوا۔ بےنوا کے شہر آشوب کے دو بند پیش کیے جاتے ہیں۔

یہ کیا ستم ہے اے فلکِ ہرزہ نابکار　　مریخ بھر کے تیز کیا خنجروں کی دھار
جوتا فروش مردِ مسلمان، دین دار　　مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سنگِ جفا سے چور کیا لعلِ آب دار

کتنوں کو مار جیسے قضا نے گرا دیا　　کتنوں کا جی بچا کے بہت ہڑبڑا دیا

کاغذ پے بے نوا نے یہ سُن کر چڑھا دیا لکھا ہے "مار جوتیوں طُرہ گرا دیا"
تا حشر ہر زباں پہ رہے گا یہ یادگار [۱۹]

حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ادبی مقام اور مرتبہ کا ذکر اس باب کے آغاز میں کیا جا چکا ہے۔ ہم عصر شہادتوں کی بنا پر انہیں ایہام گوئی کے خلاف ادبی جہاد میں جو اولیت حاصل ہے' اسی کے پیش نظر ہم نے اُن کی ذات گرامی کو اس عہد کا نقطۂ اختتام قرار دیا ہے۔

مرزا مظہر ۱۱۱۰ھ اور ۱۱۱۳ھ (م ۱۶۹۸ء اور ۱۷۰۲ء) کے درمیان پیدا ہوئے' اس لحاظ سے وہ کم و بیش شاہ حاتم کے ہم عصر ہیں۔ دونوں کے انتقال کے زمانے میں بھی زیادہ فرق نہیں۔ مرزا صاحب نے محرم ۱۱۹۵ھ (م ۱۷۸۱ء) میں شہادت پائی اور شاہِ حاتم کا انتقال ۱۱۹۷ھ (م ۱۷۸۳ء) میں ہوا۔ عام خیال یہ ہے کہ مرزا صاحب کی شہادت ایک سیاسی واقعہ تھی اور اس میں نجف خاں کا ہاتھ تھا۔ یہ بات حقیقت سے قریب معلوم ہوتی ہے۔ نجف خاں میں مذہبی تعصب اس درجہ تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین دہلوی کو دہلی سے نکلنے کا حکم اُسی نے دیا تھا۔ مرزا مظہر جان

---

[۱۹] اس شہر آشوب کے متن میں بہت سے اختلافات ملتے ہیں۔ چند پیش کیے جاتے ہیں۔

"مریخ بھر کے تیز کیا ہے خنجر کی دھار"
"جوتی فروش مردِ مسلمان دیندار"
(نکات الشعراء)

مقالاتِ شیرانی جلد دوم (مطبوعہ مجلسِ ترقی ادب' لاہور) میں دوسرا بند بہت مختلف صورت میں پیش کیا گیا ہے:

کیتوں کو جیوسیں مارٔ قضا نے گیرا دیا
تاریخ بے نوا نیں رقم پر چڑھا دیا
بلوائے عام ملک ظفر خاں اُٹھا دیا
لکھتا ہے مار جوتیاں "طرۂ اوڑا دیا"
تا حشر ہر زبان پر رہے گا یہ یادگار

ظفر خاں سے مراد نواب روشن الدولہ (طرۂ باز) ظفر خاں مُراد ہیں جنہوں نے جوہری کو پناہ دی تھی۔

جاناں اگرچہ صوفی تھے لیکن ہم اُن کے بارے میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ ان کا تصوف مہجوری و بے کسی سے عبارت نہ تھا۔ سیاسی واقعات سے وہ جس درجہ اثر قبول کرتے تھے اس کا اندازہ اُن کے مکتوبات سے ہو سکتا ہے۔ ان خطوط میں سکھوں کی شورش کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے۔ حضرت مظہر جان جاناں کو سکھوں کی شورش اور لُوٹ مار سے جو تشویش لاحق تھی اُس کا ایک سبب یہ تھا کہ اُس شورش کا ایک ہدف ''سرہند'' تھا' جسے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ابدی خواب گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

سکھوں کی شورش کے علاوہ مکتوبات مظہری (کلماتِ طیبات) میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کا ذکر بھی ہے' اور روہیل کھنڈ کے سیاسی مسائل پر گہرے تبصرے بھی ہیں۔ روہیل کھنڈ کے حالات سے دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ آپ کے مریدوں میں روہیلوں کی کثرت تھی اور دہلی کے حالات سے تنگ آ کر حضرت جان جاناں نے روہیل کھنڈ میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ روہیلوں پر آپ کے اثرات کی وجہ سے ہی نجف خاں خائف رہتا تھا۔ مرزا جانجاں عام سیاسی واقعات اور محلاتی سازشوں سے جس درجہ باخبر رہتے تھے' اُس کا اندازہ آپ کے ایک خط کے اس اقتباس سے ہو سکے گا۔

(از) احوالِ شہر تا اخبارِ محل از فقیر پنہاں نمی ماند۔ آنچہ واقعیست بفقیر می رسد''[۲۰]

مرزا مظہر جانجاں اپنے عہد کے سیاسی واقعات سے اس درجہ قریب رہے کہ ''ایہام گوئی'' کے دور میں بھی سیاسی رنگ اُن کی شاعری میں موجود ہے۔

اب کوئی ساعت میں آ صیاد کرتا ہے ملول
ایک دم کو بُلبلو! کیوں بیٹھتی ہو پھول پھول

اس شعر میں ایک ایسی پیشین گوئی ہے جس کا تعلق اُن کی بزرگی سے ہو یا نہ ہو' واقعات کے تجزیہ کی اہلیت سے ضرور ہے۔ انھوں نے اپنے ''آئینہ گفتار'' میں آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر پیش کی ہے۔

سودا نے ایہام کو ''دورنگی'' کہا ہے۔ مرزا مظہر کے سیاسی خیالات اور تاثرات

۲۰۔ کلماتِ طیبات' بحوالہ عبدالرزاق قریشی (مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا اردو کلام) ص ۵۷

اتنے واضح تھے کہ شاید انہیں کے اظہار کے لیے وہ ایہام گوئی ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اردو میں ان کا کلام بہت مختصر ہے، لیکن اس "کلام مختصر" کا سیاسی پہلو پڑھنے والے کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، اُن کی زندگی کے معلوم واقعات بعض اشعار کا پس منظر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

اتنی فرصت دے کہ رُخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

ممکن ہے یہ شعر اس دور میں کہا گیا ہو جب مرزا صاحب دہلی سے ہجرت کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ یہ باغ دہلی ہے اور صیاد نجف خاں۔

مرزا مظہر نے مغلیہ سلطنت کی حقیقی صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے واشگاف انداز میں اپنے زمانے کو عہد غلامی قرار دیا ہے۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے [۲۱]
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی
یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی

ہم گرفتار کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

○○○

مرزا صاحب کے چند اردو اشعار کے "ذخیرہ" میں دو ایک شعر ایسے بھی ہیں جو اس عہد کے واقعات سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کے خدوخال کو اشاروں کی نقاب نے بھی نہیں چھپایا۔ مثلاً

---

۲۱ بعض نسخوں میں یہ مصرع یوں ہے:

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے

چلی تپتی دکن دحتِ ظفر خاں
مگر قسمت میں آب نربدا تھا

ظفر خاں کی بیٹی ناصر جنگ سے منسوب ہو کر دکن گئی تھی۔ مرزا مظہر نے یہ شعر کیوں کہا؟ یہ ایک شعر ہے یا کسی ہجو کا حصہ؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اگر دِلّی کے اثرات نے شمالی ہند میں اردو شاعری کو ایک مسلسل روایت بنایا، تو مظہر جانجاناں نے ایہام گوئی کو ختم کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ وہ دور جو دورِ میر و درد و سودا کہا جاتا ہے۔ اُردو غزل کا پہلا عہدِ زریں، لیکن سیاسی اعتبار سے ایک نہایت بحرانی اور ہنگامی دور۔

سودا، میر، درد اور اُن کے شاگردوں کا عہد

تاریخ ادب کے دور قطعی طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے، اس لیے کہ ایک کے ڈانڈے دوسرے ملے ہوتے ہیں۔[۱]

میر اور درد کے عہد کا جائزہ لیتے ہوئے اس خیال کی صداقت کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ادبی تاریخ لکھنے والے کے لیے ادوار کی تقسیم کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اُسے کبھی کبھی اس باب میں ''آمرانہ رویہ'' اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے یہ بات ضروری ہے کہ اس ''آمریت'' کی بنیاد کوئی ادبی اور تاریخی حقیقت یا ضرورت ہو۔ گزشتہ باب میں ہم نے سودا، میر اور درد کے ہم عصر مرزا مظہر جانجاناں کو متقدمین کے طبقۂ اول میں شامل کیا ہے اور اس کے اسباب سے بحث بھی کی ہے۔ اس باب میں بھی یہی مشکل ہمارے سامنے ہے۔ مثال کے طور پر سعادت یار خاں رنگین، شاہ حاتم کے شاگرد تھے اور دِلّی کی مجلسوں میں ان کے معرکوں اور ادبی دلچسپیوں کا حال ''مجالس رنگین'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن ہم نے ان کو اس کے بعد کے باب میں شامل کیا ہے۔ اس کی وجہ انشا، مصحفی اور جرأت کے ساتھ ان کے تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اُن کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ اسی طرح میر حسن، انشا، مصحفی وغیرہ کی شاعری کا آغاز دہلی میں ہو چکا تھا، لیکن اُن کو بھی اسی بنا پر دوسرے دور میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس میر جعفر علی حسرت کو ہمارے تذکرہ نویسوں نے عام طور پر لکھنوی شاعروں میں شامل کیا ہے، کیونکہ لکھنؤ میں مدتوں ان کا قیام رہا، لیکن اُن کے شہر آشوب کی بنا پر ہم نے انہیں اس باب میں شامل کیا ہے۔ مرزا عظیم، خواجہ امان بقا اور ایسے ہی دوسرے شاعروں کو جو لکھنؤ یا دوسرے مقامات میں آباد ہو گئے تھے یا بعد کے دور تک زندہ رہے (مرزا عظیم اور انشاء کا معرکہ) اسی باب میں شامل کر لیا گیا ہے، اس کی وجہ آسانی کے

---

[۱] نور الحسن ہاشمی، دلّی کا دبستانِ شاعری، ص ۹۰، طبع اول، ۱۹۴۹ء۔

ساتھ ساتھ اُن کا سلسلۂ تلمذ بھی ہے اور اس باب کا عنوان اس کا جواز ہے۔

اس باب کے شاعروں کا زمانہ تاریخی اعتبار سے بہت طویل ہے۔ کئی شاعر محمد شاہ کے دور میں پیدا ہوئے اور شاہ عالم ثانی بلکہ اکبر شاہ ثانی کے عہد تک زندہ رہے۔ محمد شاہ اور شاہ عالم کا زمانۂ حکومت خاصا طویل ہے، لیکن درمیان کے دو بادشاہوں کا عہد مختصر ہے۔ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی نے ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۰ء تک حکومت کی، اسی لیے بعض شاعروں نے پانچ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ اس مدت میں برعظیم کے دوسرے حصوں میں بھی اہم واقعات رونما ہوئے، مثلاً سلطان ٹیپو کی شہادت، اور دہلی کے شاعروں نے صرف لکھنؤ کا رخ نہیں کیا، بلکہ دور دراز کے مقامات تک پہنچے۔ اُن کی ہجرت سے ان مقامات میں بھی اردو شاعری کا چرچا عام ہوا۔ بنگالہ اور بہار نے کئی اچھے شاعر پیدا کیے، یہ شاعر دہلی اور لکھنؤ آئے، یا اپنے مراکز ہی میں رہ کر انہوں نے اساتذہ دہلی سے فیض حاصل کیا۔ ایسے واقعات سے متعلق شاعری اور ایسے شاعروں کو بھی اس باب میں جگہ دی گئی ہے تاکہ اس عہد کے سیاسی اور تاریخی پس منظر اور حالات کو مقدور بھر اردو شاعری کے آئینہ میں پیش کیا جا سکے۔ اس عہد کے شاعروں میں سے اہم تر اور زیادہ مشہور شاعروں کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور ان شاعروں کا ذکر بعد میں جن کے کلام میں ہمارے موضوع سے متعلق شعر کم ملتے ہیں۔ تاریخی ترتیب پر کہیں کہیں ''ادبی ترتیب'' کو فوقیت دی گئی ہے، اس باب کی وسعت کے پیش نظر ہم نے معروف مثالوں کو تفصیل سے دُہرانے سے گریز کیا ہے، خاص طور پر میرؔ و سودا کے سلسلہ میں، جن کی شاعری اس عہد کا آئینہ خانہ ہے۔

سودا کی شاعری کا آغاز میرؔ و درد سے پہلے ہوا۔ وہ شاید ایک ایسے ہی ناہموار دور کی راست اور بلا واسطہ ترجمانی کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ سودا، میرؔ اور درد کے ہاں ایک ہی سے واقعات و حالات، فنی اور ذہنی طور پر مختلف انداز میں شعر کے سانچے میں ڈھلے۔ سودا کے طمطراق اور شکوہِ شاعری کے پسِ پردہ اُن کے عہد کا خرابہ آباد ہے۔ سوؔدا نے زندگی کرنے کے لیے عالم گیر ثانی، بسنت خاں خواجہ سرا، احمد خاں بنگش، شجاع

الدولہ، آصف الدولہ، عماد الملک اور رچرڈ جانسن وغیرہ کے قصائد لکھے۔ اتنے ممدوحوں کا ہونا ہی اُن کے عہد کے انتشار کی دلیل کے طور پر کافی ہے۔ عہد محمد شاہی میں ایک خواجہ سرا کا مرزا رفیع کا ممدوح بن جانا کیا کم المناک بات ہے۔ رچرڈ جانسن ریزیڈنٹ لکھنؤ کی مدح سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد سے ہی کمپنی کے اثرات اودھ کی سیاسی زندگی میں بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ ریزیڈنٹ بے تاج کا بادشاہ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ سوداؔ کے صرف ایک شعر سے ہو سکتا ہے۔

تیری وہ ذات، گو تو نہیں ہے شئہ فرنگ
کرسی میں ترے پایۂ اورنگ کا ہے ڈھنگ

جب دہلی میں سوداؔ کے قدم نہ ٹک سکے تو وہ عماد الملک کے ساتھ احمد خاں بنگش کے ہاں فرخ آباد گئے۔ شیخ چاند کا قیاس ہے کہ شجاع الدولہ کا دعوت نامہ انہیں فرخ آباد ہی میں ملا ہو گا۔[۲] اور یوں وہ ۱۱۸۳ھ (م ۱۷۶۹ء) اور ۱۱۸۵ھ (م ۱۷۷۲ء) کے درمیان اودھ پہنچے۔

دہلی سے فرخ آباد اور اودھ تک کا فاصلہ سوداؔ کے لیے محض میلوں کا فاصلہ نہ تھا بلکہ تمدنی اور ذہنی جلاوطنی کا معاملہ تھا۔ سودا نے اپنے مدحیہ قصائد کے روپ میں اپنی ذہنی کیفیات کو چھپانے کی کوشش کی ہے لیکن غریب الوطنی کا احساس ان کی غزلوں میں بار بار بڑی شدت سے اُبھرتا آتا ہے۔

تم کو معلوم ہے یارو چمنِ قدرت میں
عمر گزری کہ ہے گردش سے سروکار مجھے

❀❀❀

بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دُور
یارب! نہ کیجیو تو کسی کو وطن سے دُور

❀❀❀

۲۔ شیخ چاند، سودا، صفحہ ۶۴، اشاعتِ ثانی ۱۹۶۳ء

فراموش ان دنوں ہم شہریوں کے دل سے سودا ہے
خبر اس کی جہاں آباد کے یاروں سے مت پوچھو

سوداؔ ۱۱۶۷ھ (م ۱۷۵۳ء) سے ۱۱۹۵ھ (م ۱۷۸۱ء) تک یوں ہی مارے مارے پھرے۔ دہلی کے ہر شاعر کے لیے جہان آباد سے الگ ہونا قیامت کا مرحلہ رہا ہے۔ سوداؔ کے پیش کردہ شعروں میں کم وبیش ۲۸ سال کی گردش اور غریب الوطنی کا احساس' آنکھوں کی نمی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ غربت کا یہ دور اُن کے عہد کے اجتماعی حالات کا بالواسطہ اظہار ہے۔ ویسے سودا کا مزاج اور ان کا اندازِ نظر غزل کو بھی اپنے عہد کے حالات کے راست اظہار کا وسیلہ بنا دیتا ہے۔ اس کا اندازہ اُن اشعار سے ہوسکتا ہے جن میں سودا نے بادشاہ کو آئینِ داوری و دستورِ شاہی کا سبق دیا ہے۔ ان اشعار سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تخت نشینان دہلی مقامِ عدل پر بیٹھ کر ہر مسئلہ کو میزان عدل میں تولنے کی جگہ افراد کے مراتب کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور آدمی کی بہتری سے انہیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ سودا شاید بادشاہ کو اپنے بہت سے ہم عصروں کی طرح ''ظل اللہ'' نہیں سمجھتے تھے' اور انہوں نے نیابتِ داوری کا ذکر اپنے عہد کے ایک عام تصور کی طرح کیا ہے۔

کسی گدا نے سنا ہے یہ ایک شہ سے کہا ''کروں میں عرض اگر اس کو نہ سرسری جانے
امورِ ملکی میں اول ہے شہ کو یہ لازم گدا نوازی و درویش پروری جانے
مقام عدل پہ جس دم سریر آرا ہو ہر ایک خورد و کلاں میں برابری جانے
وہی ہو رائے مبارک میں اس کے گوشہ نشیں کہ جس میں عامۂ خلقت کی بہتری جانے''

مسلسل غزلوں کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کا تسلسل جذباتی ہوتا ہے' لیکن سودا کی اس ''غزل قطعہ بند'' میں منطقی تسلسل ملتا ہے۔

اس کا مطلع یہ ہے ؎

غرض یہ وہ غزل قطعہ بند ہے سودا
کہ اس کی قدر کوئی کیا جز انوری جانے

سودا کے قصیدوں، مثنویوں، قطعوں اور رباعیوں میں ان کے عہد کے نہایت تفصیلی مناظر نظر آتے ہیں۔ ان شعری تصویروں میں ان کے عہد کے حالات کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصیت کی نمود بھی ہے۔ سودا کے ''قصیدۂ تضحیک روزگار'' ''قصیدہ شہر آشوب'' اور ''ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال'' کو ان کے ایسے کلام میں بہت نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ سودا کی شاعری کے اس حصہ کے بارے میں شیخ چاند مرحوم نے درست لکھا ہے، اس میں انہوں نے ''سلطنت مغلیہ کی ابتری، انتظامی خرابی اور امراء کی سازشوں اور بادشاہِ وقت کی نااہلی کی پردہ دری نہایت جرأت سے کی ہے۔[۳]

سودا نے ''قصیدہ در ہجو اسپ'' کو ''تضحیک روزگار'' کا نام دیا ہے۔ اس عنوان سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کسی ایک گھوڑے کی ہجو نہیں ہے، بلکہ مغلوں کی عسکری طاقت کی موت کا نوحہ ہے۔ اس عہد میں گھوڑا ایک اشارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مؤرخوں اور نقادوں نے اس قصیدہ کو مختلف واقعات سے متعلق قرار دیا ہے، مثلاً یہ عماد الملک اور مرہٹوں کے خلاف نواب امیر خاں کی شکست سے متعلق ہے۔ ہمارے خیال میں سودا کے اس قصیدہ کو کسی ایک واقعہ سے متعلق کرنا درست نہیں۔ اس عہد میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے مغلوں کی فوجی طاقت کے زوال کی تصدیق کر دی۔

سودا کا ''قصیدۂ شہر آشوب'' شہر آشوب کے فنی معیار پر پورا اترتا ہے، اس میں تاجروں، سرکاری ملازموں، شاعروں، مولویوں، کاتبوں اور دوسرے پیشہ وروں کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ یہ قصیدہ اُس دور کی ''سیر بین'' بن گیا ہے، ہر عبرتناک نقش اس میں موجود ہے۔

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی	تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
سوداگری کیجے تو ہے اُس میں یہ مشقت	دکھن میں بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے
شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال	دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مُلّائی اگر کیجے تو مُلّا کی ہے یہ قدر	ہوں دو روپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے

[۳] شیخ چاند، سودا، صفحہ ۲۵۴

جس روز سے کاتب کا لکھا حال میں تب سے ہر صفحۂ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے

شہر آشوب کی فضا میں سودا کی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری اپنی تمام تر تلخی کے ساتھ اُبھرتی ہے۔ قصیدۂ شہر آشوب کے علاوہ اُن کا مخمس شہر آشوب بھی اُس عہد کی ایک تاریخی دستاویز ہے، جس سے ہمیں مغل بادشاہ کی لاچاری، سلطنتِ مغلیہ کے دائرہ اثر کے کم ہونے اور ملک کی عام شورش کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

سپاہی رکھتے تھے نوکر، امیر دولت مند سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے مُلک کو مدت سے سرکشوں نے پسند جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوج داریٔ کول

تضحیکِ روزگار، مغلوں کی عسکری کمزوری کا مرقع ہے اور ان شہر آشوبوں میں صنعت و حرفت کی تباہی کے ذکر کے ساتھ ساتھ عوام کے مسائل کا جائزہ ہے، لیکن شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کی ہجو، مُلکی انتظامیہ کی حالتِ ابتر کی دستاویز ہے۔ یہ محض ایک فرد کی ہجو نہیں، بلکہ شیدی فولاد خاں انتظامی ابتری کی علامت بن گیا ہے۔ چوروں کو چوری اور نقب زنی کے سلسلہ میں ''تحفظات'' حاصل تھے، رشوت عام تھی اور امن و امان کے نگہبانوں کو چوری کے مال سے اُن کا حصہ پابندی کے ساتھ ملتا رہتا تھا، بلکہ اُس زمانے میں تنخواہ بھی اس پابندی سے نہیں ملتی تھی۔

اب جہاں دیکھو واں جھمکا ہے چور ہے، ٹھگ ہے اور اُچکا ہے
کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال شیدی فولاد اب جو ہے کُتوال[۴]
چور کب اُس کا زور مانے ہے کالا بال اپنا اُس کو جانے ہے
اُن سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
سُن لو چورو! یہ مختصر قصہ صبح کو بھیج دیجیو حصہ

سودا کی مثنویاں اس عہد کی معاشرتی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی پیش کرتی

۴؎ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے کتب خانہ میں کلیاتِ سودا کا جو مخطوطہ ہے اس میں ''شیدی فولاد'' کی جگہ ''شیدی کافور'' ہے۔

ہیں۔ مثلاً آصف الدولہ کے شکار پر انہوں نے مثنوی لکھی ہے' مگر یہ مثنوی قصیدہ طور ہے۔ اسی طرح لکڑی باز کے شوقین لڑکے کے حال میں ایک مثنوی ہے جو اکھاڑے کے استاد کی جنسی معکوسیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ مثنوی اس عہد کے اس رجحان کو واقعاتی انداز میں پیش کرتی ہے۔ سودا سے پہلے شمالی ہند میں فائز' حاتم اور آبرو وغیرہ مثنوی نگاری کا آغاز کر چکے تھے' لیکن اُن کی مثنویاں خاصی مختصر تھیں۔ دہلی میں مثنوی کی روایت کو آگے بڑھانے میں سوؔدا کو اولیت حاصل ہے' اگرچہ اُن کی مثنویوں میں میرؔ کی مثنویوں کی سی گہرائی نہیں ہے۔

سوؔدا کی شاعری سے اُن کے عہد کی ادبی فضا کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ بھی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ سودا نے اُن نوخیز اور گمراہ شاعروں پر سخت تنقید کی ہے جو اساتذۂ فن کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

داغ ہوں ان سے اب زمانے میں بزم شعراء کے ہیں جو صدر نشیں
یعنی سوؔدا و میرؔ و قائم و درد لے ہدایت سے کلیم و حزیں

سودا نے حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی اردو شاعری پر جو سخت تبصرے کیے ہیں وہ ان کی اس شاعری سے متعلق نہیں معلوم ہوتے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ممکن ہے کہ ایہام گوئی کے چنگل سے آزادی کی جدوجہد میں مرزا مظہر کے ہاں بھی فارسیت کا ویسا ہی دور آیا ہو جیسا غالب کی شاعری میں ملتا ہے۔ اگر سودا نے مرزا صاحب کی موجود و معلوم اُردو شاعری کے بارے میں یہ اشعار کہے ہیں تو انہیں تعصب کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں کُتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا' نہ گھاٹ کا

سودا کے مذہبی تعصب سے اُن کی شاعری کی موجودگی میں انکار نہیں کیا جا سکتا' مرزا مظہر کی ہجو بھی حضرت شاہ ولی اللہ اور کشمیری قوم کی ہجو کے سلسلہ کی ایک کڑی ہو سکتی ہے۔

غزل کو رشید احمد صدیقی نے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اگر اس خیال کو ہم آگے بڑھائیں تو میر تقی میر اردو غزل کی آبرو ہیں۔ میر نے تمام عمر ناکامیوں سے یوں کام لیا کہ ناکامی کو ایک سلیقہ مل گیا اور غم تہذیب جذبات بن گیا۔ میر کی دردمندی میں اُن کے مزاج، شخصی حالات اور محبت کے ساتھ ساتھ زمانے کے حالات و واقعات کا عنصر بھی شامل ہے۔ میر صاحب کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے ''دل'' اور دِلّی'' دونوں کے کوائف کو اپنی شاعری میں یوں یک جا کر دیا کہ ان کی غزل غم دوراں اور غمِ جاناں کا سنگم بن گئی ہے۔

دل و دِلّی دونوں اگر ہیں خراب
پہ کچھ لطف اس اجڑے گھر میں بھی ہیں

یوں دل اور دِلی دونوں مل کر ایک نگر کی تعمیر کرتے ہیں۔ [میر صاحب کی ان علامتوں اور تصورِ حیات و اقدارِ زیست پر ہم نے اس مقالہ کے آخری باب میں اُردو شاعری کے لسانی، فنی اور فکری تجزیہ کے سلسلہ میں گفتگو کی ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک میر صاحب ہماری شاعری کے ایک با اختیار نمائندے ہیں]

میر صاحب کے بارے میں محمد حسین آزاد نے آب حیات میں باغ اور بند دریچہ کا ایک مزیدار واقعہ لکھا ہے۔ اس واقعہ کی لطافت سے محظوظ ہونے کی جگہ اسے حقیقت سمجھ لیا گیا اور یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ میر صاحب کو زندگی اور اس کے مظاہر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم نے آخری باب میں اس پہلو کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ میر صاحب کی شاعری اور خودنوشت سوانح کا ہر حصہ اُن کی شدتِ احساس، مسائلِ حیات سے وابستگی اور کائنات سے اُن کے تعلق کی شہادت دیتا ہے۔ بڑا شاعر حیات و کائنات اور انسان کے باہمی رشتہ کے تعین میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اُس کا ذاتی غم، آفاقی غم بن جاتا ہے اور وہ حدیثِ دل میں حیات کی داستاں کو سمو دیتا ہے۔ میر صاحب اس نقطۂ نظر کے نمائندے ہی نہیں بلکہ اس خیال کی تجسیم ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور زندگی کے مسائل کو پیش کرنے کے باب میں غزل گو

شاعر کے رویہ کی مثال بھی ہیں۔ میر صاحب نے اگر مثنویاں' شہر آشوب اور قصیدے نہ بھی لکھے ہوتے تو بھی اُن کی غزل میں دلّی کا نوحہ ہمیں اپنے تہذیبی ماضی کو نہ بھولنے دیتا۔ میر صاحب کے ہاں عمومیت کے پردے میں مخصوص واقعات پر تبصرے اسی طرح موجود ہیں جس طرح اُن کی زبان اور لہجہ عوام پسند ہے' مگر انہیں گفتگو خواص سے ہے۔ نادر شاہ کے حملہ کے ساتھ ساتھ دلّی کے دامن کے ستاروں کو مرہٹے اور جاٹ بھی نوچ رہے تھے۔ شہر' خرابے کی طرح پھیل کر میدان ہو گیا تھا۔ احمد شاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری گئی تھیں۔ یہ کوائف اور واقعات' میر صاحب کی ذات سے گزر کر اور چھن کر یوں لبِ گویا بنے ہیں۔

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے
پھیلا تھا اس طرح سے کا ہے کو یاں خرابا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہوں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

ان اشعار سے دِلّی کے ساتھ میر صاحب کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی ''بے دماغی'' اور ''بد دماغی'' کے باوصف وہ اپنے عہد کے واقعات سے کس درجہ متاثر ہوئے۔ اُن کی اس صفت نے بھی اردو غزل کو اپنی انفرادیت کے حصول میں مدد دی۔ میر صاحب نے اپنی آپ بیتی ''ذکر میر'' میں اگر ایک طرف عشق کے بارے میں اپنے والد کی نصیحت اور اپنے دوسرے ذاتی اور روحانی تجربات کو پیش کیا ہے تو دوسری طرف اِن تاریخی واقعات کے سلسلہ میں اپنے مشاہدات اور ردِ عمل کو ہمارے لیے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے دور کو نئے قالب میں ڈھال رہے تھے۔

دلی کی تباہی اور ویرانی کا جو نقشہ اوپر کے اشعار میں نظر آتا ہے' اس کی نثری

تفصیل دہلی پر احمد شاہ ''دُرانی'' کے حملہ کے سلسلہ میں میرؔ نے یوں پیش کی ہے:

''چوں لختے از شب گزشت غارت گراں دست تطاول دراز نمودہ شہر را آتش دادہ خانہا سوختند و بردند۔ صبح کہ صبح قیامت بود' تمام فوجِ شاہی و روہیلہ ھا تاختند' بہ قتل و غارت پرداختند و سر بریدند...... تاسہ شبانہ روز دستِ ستم برنداشتند...... اعیان ہمہ گدا شدند' وضیع و شریف عریاں' کدخدایاں بے خان و ماں ...... حالِ عزیزاں بہ ابتری کشید...... ناموسِ عالمے برباد رفت' شہرِنو بخاک برابر شد''[۵]

ذکر میر میں ذاتی کیفیات کے علاوہ اسی قسم کے کتنے ہی اور اہم تاریخی بیانات موجود ہیں۔ سندھیا کی قوت' رعایت خاں اور صفدر جنگ کا ذکر' آصف الدولہ سے ملاقات' جنگ پانی پت' سورج مل کی بغاوت' سکھ فوج کی بدعہدی' حافظ رحمت خاں کی شہادت اور لکھنو میں گورنر کا استقبال وغیرہ۔ لیکن ان سارے واقعات میں میر صاحب کے فن پر دہلی سے متعلق واقعات زیادہ اثر انداز ہوئے۔ بار بار دہلی پر حملوں اور کشت و خون کے مناظر نے ''نگر'' ''چراغ'' ''لہو'' ''ویرانی'' اور ''خرابہ'' جیسے الفاظ کو ان کی غزل میں استعاروں اور علامتوں کی حیثیت عطا کر دی۔

دل کی ویرانی کا تو مذکور کیا　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک　　اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر صاحب کے ہاں دلی کبھی حُسن کا اشارہ اور علامت تھی۔ حُسن کی یہی علامت خاک میں مل گئی۔ عزیزوں کے ناموس کی چادر پارہ پارہ ہو گئی۔ میر صاحب کی شاعری کے صفحات پر دلی کے حسن کے جو مُرقعے ہیں اُن کے پیش نظر تباہی کی یہ تصویریں اور زیادہ المناک وغم انگیز بن جاتی ہیں۔

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں　　دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

۵　میر تقی میرؔ ذکر میر (مرتبہ مولوی عبدالحق) صفحہ ۶۔۷۵ طبع اول ۱۹۲۸ء

دلی تھی طلسمات کی ہر جاگہ میر اِن آنکھوں سے ہم نے آہ کیا کیا دیکھا

دلی کی ہر گلی کے ہفت اقلیم ہونے کی نسبت سے ہی میر صاحب اس گہرائی تک پہنچ سکتے تھے۔

زیرِ فلک بھلا تو روئے ہے آپ کو میر؟ کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

ان اشعار کی موجودگی میں میر صاحب کی شاعری کو خالص ''داخلی شاعری'' اور اُن کے غم کو ''شخصی'' قرار دینا بڑے دل گُردے کی بات ہے۔ اجتماعی غم کے پیشِ نظر میر صاحب تو اپنے حالِ دل پر رونے کو بھی کمینگی کی قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔

دہلی کی یہ تباہی کیا کم تھی کہ میر صاحب کو دہلی چھوڑنی پڑی۔ یہ واقعہ گوشت سے ناخن کا جدا ہونا اور باغ سے بوئے گل کا سفر تھا۔ ذکر میر کے آخر میں میر صاحب نے اپنی زندگی پر یوں تبصرہ کیا ہے کہ ''اس مدتِ مختصر میں یہ قطرۂ خون کہ جسے دل کہتے ہیں طرح طرح کے ستم جھیل کر تمام خون ہو گیا ہے۔'' ان تمام ستموں میں دہلی سے الگ ہونا سب سے بڑا ستم تھا۔ دلی کی یاد سے اُن کی ''چشم خوں بستہ'' سے اچانک لہو ٹپکنے لگتا۔

سودا کے احساسِ غریب الوطنی پر گفتگو ہو چکی ہے' لیکن سودا لکھنؤ میں میر کی نسبت زیادہ مطمئن تھے۔ میر صاحب تو ہر زمین پر پہنچ کر یادِ دہلی سے اپنے لیے ایک آسمان پیدا کر لیتے تھے۔ سودا کے غم کی گہرائی کو ہم نے اُن کے تذکرہ میں کم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی مگر ان کے غم میں اپنی تنہائی کا احساس میر کی طرح جان لیوا نہیں ہے۔ میر صاحب نے اپنے آپ کو اور اپنے ریختہ کو لکھنؤ میں اجنبی جانا' اسی لیے وہ بڑے پیار سے اپنے آپ کو چمکارتے ہیں' ڈانٹتے ہیں' بُرا بھلا کہتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔ وہ ان تضادات پر یوں غالب آ گئے ہیں کہ انہیں اپنی ذات کی وحدت کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مر جاتا' سراسیمہ نہ آتا یاں

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے و لے سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

متاعِ ہُنر پھیر کر لے چلو بہت لکھنؤ میں رہے، گھر چلو

میر صاحب نے جن واقعات کے شاعرانہ ردِ عمل کو غزل کے پیکر میں خونِ دل میں الفاظ کو ڈبو کر پیش کیا ہے، اُن کا اظہار خارجی اور واقعاتی طور پر اُن کی مثنویوں، قصیدوں اور مخمس وغیرہ میں ہوا ہے۔ آصف الدولہ کی کدخدائی کے بیان میں مثنوی، ہولی کے بیان میں مثنوی اور شکارنامے، بیانیہ شاعری کے میدان میں میر صاحب کے جوہرِ طبع کے ثبوت ہیں۔ سوداؔ کے شکار ناموں کو ہم نے قصیدہ طور کہا ہے۔ میر صاحب کے شکارناموں میں حقیقت کا رنگ ہے۔

لشکر کے ہجو میں دو مخمس اُن کی کلیات میں موجود ہیں۔ ایک مخمس کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال کنجرے جھینکیں ہیں، روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال ایک تلوار بیچے ہے، ایک ڈھال
بادشاہ و وزیر، سب قلاش

اس بند میں اُس وقت کی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے جب ابدالی ۱۷۵۷ء میں دہلی کی طرف بڑھا تو مغل فوج کے سپاہی جنھیں مدتوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی اُس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ بادشاہ کی قلاشی میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

میر صاحب کی مثنویوں سے اُن کے سوانح بھی ہمارے سامنے آتے ہیں، مثلاً اپنے مکان کے بارے میں اُن کی مثنویاں۔ مثنویٔ ننگ نامہ اُن کے سفر کا تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی واقعات کو بھی اُجاگر کرتی ہے۔ میر کو اپنے عہد کی ہر سیاسی اور مہم جو طاقت کا اندازہ تھا۔ سکھ، مرہٹے اور جاٹ۔ اس مثنوی میں سکھوں کا ذکر ملتا ہے۔

بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا

سودا کی طرح میر صاحب نے بھی اپنے عہد کی ادبی فضا کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ مثنویٔ اژدرنامہ کا موضوع یہی ہے۔ دوسرے معاشرتی پہلوؤں کو بھی

انہوں نے اپنا موضوع بنایا۔ "مُرغ بازی" لکھنؤ کی "بازیوں" میں سے ایک تھی۔ میر صاحب کی "مثنوی در بیانِ مُرغ بازی" سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ بازیاں اُن کے لیے نئی چیز تھیں، یا کم سے کم دِلّی کی معاشرتی زندگی میں ان کو یوں دخل نہ حاصل تھا۔

دِلی سے ہم جو لکھنؤ آئے گرم پر خاش مُرغ یاں پائے

میر صاحب کا کلیات دروں بینی اور فنِ شعر کے اعتبار سے "کم از گلشن کشمیر" نہ سہی، لیکن اس میں تاریخ کے خرابے بھی آباد ہیں، اور میر صاحب ان خرابوں کے تماشائی نہیں بلکہ ان خرابوں کے کانٹوں پر برہنہ پا چلنے والوں میں شریک ہیں۔ اُنہوں نے نامرادی سے شکست کھانے کی جگہ اُسے اندازِ زیست بنا دیا۔

نا مرادی کی رسم میر سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

خواجہ میر درد کی زندگی کا انداز اُن کی شاعری بن گیا۔ اُن کی زندگی اور شاعری ایک ہی صداقت کے دو پہلو ہیں جو ایک دوسرے کے بغیر نا تمام رہتے ہیں۔ حوصلہ مندی اور سکون کے عناصر ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں نظر آتے ہیں۔ سودا، میر، میر حسن، میر سوز سے لے کر انشا اور مصحفی تک کتنے ہی شاعر دہلی سے لکھنؤ پہنچ گئے، لیکن خواجہ میر درد اپنی زندگی اور شاعری کا چراغ لیے ہوئے زمانے کی ہواؤں کے سامنے سرِ راہِ تاریخ وحوادث بیٹھے رہے اور یوں کہ یہ ہوائیں اس چراغ کو نہ بجھا سکیں۔ سکون سے ہماری مراد بے حسی یا بے تعلقی سے نہیں ہے۔ یہ سکون شعورِ زیست اور اُن کے تصورِ حیات کا عطا کردہ ہے۔ درد نے اپنی زندگی میں زمانے کے ہر گرم و سرد کو سمو کر مزاج دہر میں اعتدال پیدا کرنا چاہا۔ وہ اپنی کوشش میں تو کامیاب نہ ہو سکے، لیکن مزاجِ دہر بھی اُن سے جمعیت خاطر نہ چھین سکا۔ یہ چوٹ برابر کی تھی۔

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دہر میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا

خواجہ میر درد اپنے عہد کی زندگی کی حشر سامانی سے بے خبر اور بیگانہ نہیں تھے۔ اُن پر بھی ایسے وقت آئے کہ وہ یوں فریاد کر اُٹھے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

لیکن اُن کی اس فریاد میں بھی لے ہے۔ انہوں نے جگر داری اور بلند حوصلگی سے نالہ کو پابندِ نے کیا ہے۔ یہ اُن کی شاعری کا کمال ہے اور شاعری کو یہ کمال اُن کی ذات نے عطا کیا ہے۔ اُن کی ذات کی یہ صفت تصوف کا تحفہ ہے۔ وہ رسمی طور پر سجادہ نشیں نہیں تھے' بلکہ عملی طور پر صبر و رضا اور توکل کی منزلوں سے گزرے۔ میر اور اردو کے بعض دوسرے شعرا کے ہاں صوفیانہ افکار اور اشعار کا معیار اور تعداد درد سے کم تر نہیں' لیکن درد کے ہاں عمل اور فکر کی ہم آہنگی ''چیزے دیگر'' بن گئی ہے اور یوں کہ میر درد اُردو کے صوفی شعراء کے سرگروہ قرار دیئے گئے۔

خواجہ میر درد کے تصوف میں زندگی کرنے کا حوصلہ ہے۔ وہ فرصتِ زندگی کے مختصر ہونے کا احساس کرنے کے ساتھ ساتھ اس فرصت سے کام لینے کے قائل ہیں۔ اسی طرح ان کا قلبِ مطمئن ناگوار کو گوارا بناتا ہے' اور اندازِ نظر واقعات کی نوعیت کو بدل دیتا ہے۔

فرصتِ زندگی بہت کم ہے مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

دل مرا باغِ دلکشا ہے مجھے دیدہ جام جہاں نما ہے مجھے

مرزا مظہر' سودا اور میر کے ساتھ ساتھ خواجہ میر درد نے بھی ایہام کو ختم کرنے کی مہم میں حصہ لیا۔ اُن کے بعض شعروں میں یہ صنعت ہے' مگر نہایت خوش گوار انداز میں۔ ذیل کا مشہور شعر مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے

بستے ہیں تیرے ''سائے'' میں سب شیخ و برہمن
آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ایہام کے خلاف اپنی کوششوں کی وجہ بھی درد نے ایسی بیان کی ہے جس کا تعلق

تصوف سے ہے۔ ایہام حرفِ دوئی ہے اور حقیقت سے واصل ہونے کے لیے اسے مٹانا لازم ہے۔

از بسکہ ہم نے حرف دوئی کا اُٹھا دیا
اے درد اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

میر عبد الحئی تاباں اردو کی تاریخ کے اولین ''مقتولینِ شراب'' میں سے ہیں۔ کثرتِ شراب نوشی اُن کی موت کا سبب بنی اور اُن کی موت دوستوں کے سینے کا داغ بن گئی۔

داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر — ہو نجات اُس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

تاباں، شاہ حاتم اور محمد علی حشمت کے شاگرد تھے۔[٦]

تاباں کا دور ایسا ہنگامی دور تھا کہ اس کے نقوش ان کے ذہن اور شاعری پر مرتسم ہو گئے۔ تاباں کی غزل میں میر کی طرح سیاسی اور اجتماعی پہلو بہت نمایاں ہے۔ وہ تو بہت سے مقامات پر غزل کی اشاریت کے قائل بھی نہیں معلوم ہوتے۔ میر نے جو

---

[٦] شاہ حاتم نے اپنی استادی اور اُن کی شاگردی کا ذکر اپنی غزلوں میں کیا ہے

فیضِ صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں
طفلِ مکتب تھا، سو عالم بیچ تاباں ہو گیا

حاتم کی یہ غزل ۱۱۵۳ھ (مطابق ۱-۱۷۴۰ء) کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ تاباں ۱۱۵۳ھ تک طفلِ مکتب نہیں رہے تھے، بلکہ اچھی خاصی شہرت کے مالک ہو گئے تھے۔ (غلام مصطفیٰ خاں، علمی نقوش، صفحہ ۲-۱۷۱)

(ویسے علمی نقوش میں اس غزل کا سالِ تصنیف کتابت کی غلطی سے ۱۱۳۵ھ درج ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ''میر حسن اور اُن کا زمانہ'' میں غزل کا سال ۱۱۵۵ھ درج کیا ہے)

شاہ حاتم سے تاباں کا رشتہ ۱۱۵۷ھ (م ۱۷۴۴ء) تک قائم رہا۔ حشمت سے اُن کے تلمذ کا سبب ذوقِ شراب اور نواب امیر خاں سے قربت و توسل معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی یہ رائے تاباں کے حالات اور دوسرے قرائن کی بنا پر درست معلوم ہوتی ہے کہ حشمت سے یہ تعلق ۱۱۵۶ھ کے قریب شروع ہوا ہوگا۔ (علمی نقوش ص ۱۹۱) ...... تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ (م ۱۷۴۸ء اور ۱۷۵۲ء) کے درمیان ہوا۔

باتیں عمومیت کے ساتھ کہی ہیں تاباں انہیں اپنے عہد کے واقعاتی پسِ منظر کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ تاباں کو نادری حملہ اور دہلی کی تباہی سے سخت تکلیف پہنچی تھی۔ اسی طرح وہ امرائے دربار سے بھی ناخوش ہیں کیونکہ وہ لوگ حالات کے غلام بن کر مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے۔ تاباں امیروں کے اس گروہ کو بادشاہ کی کم ہمتی کا سبب سمجھتے ہیں۔ ان کے اس تجزیہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخصی نظامِ حکومت کی خامیوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس نظام کی سب سے بڑی خرابی حکمران اور عوام کے درمیان رابطہ کی کمی ہے۔ اسی کمی کی وجہ سے خلا پیدا ہوتا ہے اور غیر ملکی طاقتوں کو آزادی سلب کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ''بلبل'' اور ''باغباں'' میں ربط کا فقدان ''صیاد'' کے لیے دعوت ہے۔ تاباں نے انہیں اشاروں کی مدد سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ حالات کے تاریک ہونے کے باوجود تاباں کے لہجہ کی رجائیت انفرادی شان رکھتی ہے۔ اس لہجہ میں آزادی کے خوابوں اور تمناؤں کا عکس ہے۔ تاباں نے شراب میں پناہ ڈھونڈی، مگر وہ اپنے دور کے حقائق کو نہیں بھلا سکے۔ ان کی غزل میں ''آشوب حقیقت'' ہے اور ان کی شاعری ہمیں اپنے عہد کے ''مقتول شراب'' مجاز کا یہ شعر یاد دلاتی ہے۔

مئے گلفام بھی ہے، سازِ عشرت بھی ہے، ساقی بھی
مگر مشکل ہے آشوب حقیقت سے گزر جانا

جو کچھ اوپر کی سطور میں کہا گیا اس کی شہادت کے طور پر تاباں کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دلِ تاباں — نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تخت طاؤس

دیکھ کر ان کے تئیں شاہ بھی مردی پکڑے — ہو شجاعت کا اگر جزو امیروں کے بیچ

طرح اسکندر کے تاباں شاہِ ہفت اقلیم ہو — جرأت کرے یہ خسرو ہندوستاں

مجال کیا ہے کہ صیاد باغ میں آوے　　جو عندلیب کے تئیں ہووے باغباں سے ربط

گزشتہ صفحات میں ہم غزل کے اشاروں میں سیاسی اور تاریخی واقعات کی پیشکش اور اس کے اسالیب کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ یہ انداز اُردُو غزل میں ابتدا ہی سے ملتا ہے۔ لیکن میر کے بعد ہمارے خیال میں تاباں اور مصحفی نے ''اسیری'' ''بلبل'' ''طائر'' ''قفس'' اور ''گلزار'' وغیرہ کی علامتوں کو جس سیاسی شعور کے ساتھ استعمال کیا ہے اس میں کم ہی شاعر اُن کے شریک قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان اشاروں کی وجہ سے جو کرب' کسک اور تڑپ کی فضا ان شاعروں کی غزل میں پیدا ہوگئی ہے اس میں غلاموں کی روح کو جکڑنے والے طوق و سلاسل کی ماتمی آواز بھی شامل ہے۔ مصحفی کی اس خصوصیت کو بیشتر نقاد تسلیم کرتے ہیں لیکن تاباں کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے۔

قفس میں بند ہیں یہ عندلیبیں سخت بے بس ہیں
نہ گلشن دیکھ سکتی ہیں' نہ اب وے آشیاں اپنا

بلبلو! کیا کرو گے اب چھٹ کے　　گلستاں' تو اجڑ گیا کب کا

کیا بُری ساعت تھی جو صیاد آیا باغ میں　　ایک دم میں آشیاں بلبل کا ویراں ہو گیا
خار و خس بھی جائے گل گویا نہ اُگتا تھا کبھی　　ہو گیا ایسا خزاں سے یک بیک ویراں یہ باغ

آخری شعر میں تاباں کے عہد کی دلی کا ذکر ''باغ'' کے استعارہ میں کتنا واضح ہے۔ یہ ویرانی اور انقلاب زمانہ کی لائی ہوئی تبدیلیاں کبھی کبھی شاعر کو غزل کی زبان اور اس کی لطافت کو ترک کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ہائے　　اب میسر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

غزلوں کے علاوہ تاباں کے کلام میں نواب امیر خاں اور شرف الدین مضمون وغیرہ کی وفات کی تاریخیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ عمدۃ الملک امیر خاں ۱۱۵۹ھ (م

۱۷۴۷ء) میں مارے گئے تھے۔ان کی تاریخ تاباں نے یہ نکالی ہے ؎

تاریخ وفات میں خرد نے "مارا ہے امیر خاں" خبر دی
۱۱۹۵ھ

انعام اللہ خاں یقین موج دریا کی طرح اُبھرے اور پھر یہ موج وقت کے دریا کے سینے میں سوگئی۔ ؎

ان کے احوالِ پریشان کی داستان ۱۱۶۹ھ (م ۱۷۵۶ء) میں ان کے قتل کی صورت میں ختم ہوگئی۔ یقین کی شاعری میں بھی غلامی کا شدید احساس ہے۔ رومانی شاعروں کے یہاں یہ احساس کوئی انوکھی چیز نہیں۔اس احساس کے سوا یقین کے یہاں حقیقت پسندی بھی ہے۔ان کے نزدیک ان کے ہم وطنوں کی بے عملی اور ذہنی رویہ غلامی کا سبب ہے، ورنہ قوت عمل اور "ٹک پھڑکنے" سے غلامی کے قفس کو توڑا جا سکتا ہے۔

آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس
ورنہ ٹک پھڑکیں تو ہو جاویں تہ و بالا قفس

اسیرانِ قفس کی نا امیدی پر نظر کیجو بہار آوے تو اے صیاد! مت ہم کو خبر کیجو

OOO

باغبان بے رحم اور در بند، دیواریں بلند بلبلِ بے بال و پر گلشن میں جاوے کس طرح

؎ فرحت اللہ بیگ نے "دیوانِ یقین" کے دیباچہ میں ان کا سال ولادت ۱۱۴۰ھ (م ۲۷-۱۷۲۸ء) لکھا ہے۔ دیوان زادہ حاتم میں یقین کی ایک غزل پر حاتم کی ایک غزل کا سال ۱۱۵۲ھ درج ہے۔ بظاہر سنہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ دوسری طرف کئی تذکرہ نگاروں نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں انہیں شعر کہہ کر دے دیتے تھے۔اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ بارہ برس کے لڑکے کے کلام میں ایسی غزل کیسے آ گئی جس پر حاتم جیسے استاد نے غزل کہی ہو۔ ویسے ادبیات عالم کی تاریخ میں ایسے شعلۂ مستعجل ملتے ہیں جنھوں نے اپنی نوجوانی ہی میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو الفاظ کی دنیا میں یوں پیش کیا ہو کہ بقائے دوام کے دربار میں جگہ مل گئی ہو۔اس لحاظ سے انعام اللہ خاں یقین کیٹس اور شیلے کی برادری کے ایک فرد ہیں۔

اشرف علی فغاں، احمد شاہ بادشاہ (۱۷۴۸ء۔۱۷۵۴ء) کے رضاعی بھائی اور علی قلی ندیم کے شاگرد تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے بعد دلی سے نکلے۔ مرشد آباد، فیض آباد اور پھر عظیم آباد میں قیام کیا۔ ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲۔۷۳ء) میں انتقال کیا۔ فغاں کی شاعری میں ایک طرف تو دلی کے حالات ہیں اور دوسری طرف ان کی ہجرت کی کیفیات ہیں۔ جس شخص کو بادشاہ نے ظریف الملک کوکا خان بہادر کا خطاب دیا ہو، اس کی شاعری میں ظرافت کے پھول نہ ہونے کے برابر ہیں۔

صفدر جنگ کے لشکر کی حالت فغاں نے جس انداز سے پیش کی ہے، اس سے سودا اور میر کے ایسے ہی ہم موضوع شعری بیانات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ لشکر میں فاقوں کا بھی اعتبار نہیں رہا۔ اگر سپاہی کا نفر بھوکا ہے تو سردار کے کہار فاقے سے ہیں۔ یہ کیفیت صرف لشکر کی نہیں ہے بلکہ سارا ملک فاقہ زدہ اور قحط کا مارا ہے۔

اعلیٰ سے تا بہ ادنیٰ جتنے ہیں گرسنہ ہیں — لشکر میں ہو گئے ہیں بے اعتبار فاقے
کوئی اگر سپاہی سردار سے کہے ہے — لینا خبر شتابی مرتے ہیں یار فاقے
کل سے نفر نے میرے گھوڑا نہیں ملا ہے — مقدور کب بشر کا کاٹے ہزار فاقے
سُن کر اسے یہ کہنا "یکساں ہے حال سب کا — تیرا نفر ہے بھوکا، میرے کہار فاقے"
شاہ و گدا کی حالت یکساں ہے میرے صاحب — تنخواہ دار بھوکے، روزینہ دار فاقے
بندے سبھی خدا کے، کہتے پھرے ہیں "الجوع" — القصہ کیا کہوں میں سارا دیار فاقے

فغاں کی غزلوں میں بھی ان کے دوسرے ہم عصروں کی طرح احوالِ زمانہ دل کی زبان میں کہا گیا ہے۔ وہ بادشاہ دہلی کے رضاعی بھائی تھے اور بادشاہ کی اصل طاقت سے باخبر تھے۔ اس کا اظہار ان کے اس شعر میں بڑی لطافت سے ہوا ہے۔

رکھتا نہیں ہوں ہاتھ میں کچھ غیر مُشت پر — اتنی بساط پر میں خریدارِ باغ ہوں

فغاں کے یہاں بھی دلی اور اس دور کا حال باغ، قفس، بال و پر اور متعلقہ علامتوں ہی کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ ان علامتوں کی تکرار اس بات کا ثبوت ہے کہ اسالیب بیان کی شیرازہ بندی اور علامتوں کے معانی کے تعین میں خارجی حالات اور

سیاسی و تاریخی واقعات کا کتنا دخل ہوتا ہے۔ پھر یہ علامتیں ادبی روایت بن کر ایک عہد سے دوسرے عہد تک منتقل ہوتی ہیں۔

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

اس قدر طاقت نہیں جو بال و پر بھی وا کروں کس گرفتاری میں آیا ہوں الٰہی! کیا کروں

صیاد! راہ باغ فراموش ہو گئی کنجِ قفس سے مت مجھے آزاد کیجیو

میری طرف سے خاطرِ صیاد جمع ہے کیا اڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہیں؟

○○○

تیسرا شعر غلامی کی نفسیات کا گہرا مطالعہ ہے۔ بال و پر اور قوت عمل سے محروم ہو کر قومیں غلامی کو عافیت اور سکون کا سبب سمجھنے لگتی ہیں، کیونکہ غلامی ذمہ داریاں نہیں رکھتی اور آزادی کا بھاری ذمہ داریوں کے ساتھ بہناپا ہے۔ غلامی کی یہ تمنا جو راہ باغ (رسم و راہ آزادی) فراموش کرنے کا نتیجہ ہے، ہمیں اقبال کا یہ شعر یاد دلاتی ہے۔

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

ایسے اشعار ایک عہد سے دوسرے عہد تک خیالات کے سفر کی مثال بھی کہے جا سکتے ہیں۔

قائم چاند پوری، بجنور کے ضلع میں پیدا ہوئے۔ وہیں انہوں نے چمنِ دہلی کی بہار کا ذکر سُنا اور ملازمت کی تلاش میں تخت گاہ دہلی آئے اور شاہی توپ خانے کے داروغہ ہو گئے۔ لیکن یہاں آ کر انہیں بہار کے مناظر کی جگہ موسم خزاں کی دید نصیب

ہوئی۔

برنگِ غنچۂ بہار اس چمن کی سنتے تھے　　　پہ جونہی آنکھ کھلی موسمِ خزاں دیکھا

دہلی میں ان کا غنچۂ خاطر نہ کھل سکا۔ یہاں مدتوں رہے۔ شاہ ہدایت، خواجہ میر درد اور سودا سے فیض حاصل کیا، مگر دہلی میں انہیں اپنا کوئی ''ہم آواز'' نہ ملا اور یوں ان کے جی میں ہوائے سیر باغ کا خیال بھی نہ رہا۔

ہم اسیروں کو نہ کر تکلیفِ گُل گشت اے نسیم
کون سی باقی ہے اب دل میں ہوائے سیر باغ

قائم اس باغ میں بلبل تو بہت ہیں لیکن　　　دل کھلے نالہ سے جس کے وہ ہم آواز کہاں؟

قائم نے بھی حاتم، سودا، میر، فغاں، مصحفی اور جعفر علی حسرت وغیرہ کی طرح دلی کو روزگار کی صورت بگڑتے دیکھا۔ شاہ عالم کے دربار سے متعلق رہے تھے اور اس لیے اصل حقیقت سے باخبر تھے۔ ویسے تو عوام کی شاہ پرستی ۱۸۵۷ء تک باقی رہی، لیکن جو اربابِ نظر تھے وہ ''بادشاہ کے خدائی حقوق'' کے نظریہ کے کھوکھلے پن کو جان چکے تھے۔ قائم کے شہر آشوب میں اسی نظریہ کے ابطال میں دو بند بڑی قوت کے ساتھ کہے گئے ہیں۔

کیسا یہ شہ کہ ظلم پہ اس کی نگاہ ہے　　　ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے
لُچّا ایک آپ، ساتھ لٹیری سپاہ ہے　　　ناموسِ خلق سایہ میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے، نہ ظل اللہ ہے

دادا جو تیرا لال کنور کا تھا مبتلا　　　کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خانداں میں حمق کا جاری ہے سلسلہ　　　دوں دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا!
آخر گدھا پن ان کا تیرا عذر خواہ ہے

اس شہر آشوب کے ایک بند میں عوام کی حالت قائم نے بڑی دلسوزی کے ساتھ پیش کی ہے، جس میں فاقوں سے ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ساتھ ان کا ذکر بھی ہے

جن کے چہروں پر بھوک نے اپنی بھیانک تحریر جُھریوں کی صورت میں لکھ دی تھی۔

مُردوں کے ہر طرف ہیں پڑے سینکڑوں اٹم — سکتے ہے کوئی راہ میں، نکلے کسی کا دم
اک ہاتھ سر کے نیچے رکھے، ایک بر شکم — مانند چوب پاؤں میں خشکی سے پیچ و خم
چہرے کا ڈول فاقے کے اوپر گواہ ہے

مرزا جعفر علی حسرت کو بیشتر تذکرہ نگاروں نے شعرائے لکھنؤ میں شامل کیا ہے۔ وہ انشا، مصحفی، میر حسن، جرأت اور رنگین وغیرہ کی طرح دہلی اور لکھنؤ دونوں مجلسوں کے نمائندے ہیں اور دبستان لکھنؤ کے پیش رووں میں شامل کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان کے "مخمس در احوال جہاں آباد" کی بنا پر ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے انہیں دہلوی شاعروں کے اس دور میں شامل کر رہے ہیں۔

حسرت، جرأت جیسے شاعر کے استاد تھے۔ جرأت نے ان کے انتقال پر یہ رباعی کہی تھی۔

تا جامِ جہاں نما ایاغِ حسرت — جوں مشعلِ ماہ تھا چراغِ حسرت
سو بادِ فنا سے گُل کیا تو نے فلک — اب کچھ نہ رہا سوائے داغِ حسرت [۸]

حسرت کا نام اردو کے ادبی معرکہ آراؤں میں شامل ہے۔ پہلے تو وہ سودا سے الجھے اور جب "مصحفی ۱۱۹۸ھ (م ۱۷۸۳ء) میں لکھنؤ آئے ان سے بھی حسرت کا معرکہ ہوا۔ چنانچہ مصحفی نے غزل کہی ہے جس کا ایک شعر ہے۔

بعضوں نے تب تو شعر پہ "حسرت" کے یہ کہا
کیا دال موٹھ بیچنے والے کی شاعری [۹]

---

۸ کتاب خانہ رام پور میں جعفر علی حسرت کا قلمی دیوان موجود ہے۔ یہ مجموعہ ۱۱۱۲ھ (م ۱۷۷۸ء) میں مرتب ہوا یعنی حسرت کی موت سے چودہ سال پہلے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے "دلی کا دبستان شاعری" میں سال وفات ۱۲۱۰ھ (م ۱۷۹۶ء) لکھا ہے۔ لیکن جرأت کے قطعہ تاریخ وفات اور دوسری شہادتوں کی بنا پر ۱۲۰۶ھ (م ۔۱۷۹۱ء) درست معلوم ہوتا ہے۔ دیوان کی ترتیب کی تاریخ حسرت نے خود لکھی ہے۔ (کل طے یہ ہوا تمام بابِ صنعت ۱۱۹۲ھ)

۹ ڈاکٹر وحید قریشی، میر حسن اور اُن کا زمانہ، صفحہ ۱۶

اس دیوان میں "مخمس دراحوال جہاں آباد" شامل ہے۔ یہ ایک طویل مخمس ہے اور اس کے چالیس بند ہیں۔ اس مخمس کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

نہیں ہے مرثیہ سے کم جہاں آباد کا حال — اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونئے کی مثال
وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال — اگرچہ چرخِ ستم گر' یہ اس پہ لایا زوال
پر آپ روے ہے رکھ منہ پہ ابر سے رومال

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں — کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالتِ بستاں
نہ سیلِ حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں — گزر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہو گیا یہ کشت سبز سب پامال

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت اور تاج — وہ اپنی قوت کو اطفال کے ہوا محتاج
دُہائی ہے جسے دیتا تھا سارا ہند خراج — غنیم آن کے لئے اس سے اس کے شہر سے باج
وہ شکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال

نجیب تو ہوئے فاقوں سے اب سبھی رنجور — رہی نہ چہرے پہ رونق نہ اُن کی چشم میں نور
جو اہلِ خرقہ ہیں ان کا تو کیجیے کیا مذکور — جنہوں کا کسب تھا مُلّائی' ان کا یہ دستور
کہ جا کے چوک میں دیکھیں ہیں ایک دمڑی پہ فال

گراں نہیں ہے کوئی جنس ہے گراں سُو اناج — اسی پہ آ رہا محصول بادشاہی خراج
سپاہی رہتے ہیں بنیوں کے رات دن محتاج — نہیں ہے سلطنت اب بنیوں کے ہے گھر میں راج
کہ مالدار ہوئے سارے بنیے اور بقال

جہاں آباد نہ ہوتا کسی طرح سے تباہ — جو حسرت ایسے عمل کرتے نہ ہم نامہ سیاہ
پرائے مال پہ ناموس پر رکھے جو نگاہ — تو ان پہ کیونکہ نہ بھیجے غضب بھلا اللہ
ہمارے آگے یہ آئے ہمارے ہی اعمال

یہ مخمس "شہر آشوب" کے فنی تقاضوں کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ کچھ پیشہ وروں کا حال تو درج بالا بندوں میں آ گیا ہے۔ حسرت نے اس مخمس میں سپاہیوں' علم نجوم کے

ماہروں، مصوروں، خطاطوں، سوداگروں، طبیبوں، مرثیہ خوانوں اور گاڑی بانوں کے مصائب کو بیان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کمان گر، تیرگر، چوبدار، سنگ تراش، نان پز، شیشہ گر، نٹ باز، بھان متی اور آتش باز سب ہی اپنے زخموں کے ساتھ اس طویل شعری دستاویز میں موجود ہیں۔ پانچویں بند سے یہ حقیقت ایک بار پھر واضح ہو جاتی ہے کہ ہندو بنیوں نے معاشرہ کے مصائب سے فائدہ اٹھایا اور وہ مسلمان بادشاہ کے عہد میں اپنے آپ کو اس سماج کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ دو قوموں کی یہ کشمکش اردو شاعری میں شروع ہی سے نظر آتی ہے۔ ویسے سیاسی طور پر یہ آویزش پہلی بار اکبر کے عہد میں اُبھری تھی اور تاریخی طور پر تو اس کا آغاز مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ہوا۔

حسرت کی غزلوں میں بھی ملک کے حالِ بد کا ذکر اور خاص طور پر دہلی کی تباہی کے نقوش موجود ہیں۔ بعض اشعار اپنی داخلی شہادت کی بنا پر ان کے دہلی کے دور سے متعلق قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

رہنے دے مے کو ساقی، ہم تو چلے یہاں سے　　　قسمت میں جس کے ہوگا سو جام پی رہے گا

حسرت کی غزلوں سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو اس دور کے سیاسی انتشار اور معاشرتی ابتری کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی اقدار کی غمازی کرتے ہیں۔

یوں خزاں آئی چمن پر ہائے بلبل کیا ہوا؟　　　لالۂ و سنبل کہاں، سوسن کہاں، گل کیا ہوا؟

خوشامد کرتے ہیں، حسرت فقیر اب اہل دنیا کی　　　ظروف نقرئی اور مسند زرین کی خاطر

بال و پر جھڑ گئے میرے قفسِ تنگ کے بیچ　　　ہے اسیروں کے پر و بال کو بیداد قفس

رکھے اس زمانے میں حق آبرو　　　کہ حسرت نظر آوے ہے دور اور

عالم گیر کے بعد اور شاہ عالم ثانی سے پہلے کے مغل بادشاہوں سے اُردو کے شعر منسوب ہیں۔ لیکن مغل بادشاہوں میں اردو کے پہلے باقاعدہ شاعر شاہ عالم ثانی آفتاب ہیں۔ شاہ عالم کا مجموعۂ کلام ''نادرات شاہی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ شاہ عالم کے حکم سے ۱۷۹۷ء (م ۱۲۱۲ھ) میں مرتب کیا گیا تھا۔

شاہ عالم اُردو کے علاوہ فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے اور شاعروں کے قدر دان تھے۔ آنکھیں کھونے کے بعد شاعروں کی محفل میں اپنا دل بہلاتے۔

''اس وقت دہلی کے اندر میر اور سودا سے لوگ نہ تھے مگر...... حکیم ثناء اللہ فراق شاگرد میر درد' حکیم قدرت اللہ قاسم شاگرد میر درد' شاہ ہدایت' میاں شکیبا شاگرد میر مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا' میر قمر الدین منت والد میر ممنون شیخ ولی اللہ محبؔ وغیرہ حضرات کا دور دورہ تھا...... یہ سب اپنے کلام سے بادشاہ کا دل بہلاتے اور شاہی کلام کی دل کھول کر داد دیتے''۔ [۱۰]

شاہ عالم کے دور پر تاریخی جائزے کے سلسلہ میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ان کے نابینا کیے جانے کے پس منظر کو ہم نے تاریخی جائزے میں پیش نہیں کیا تھا کیونکہ اس کا ذکر شاہ عالم کے حالات کے تحت زیادہ مناسب ہے۔ غلام قادر نواب نجیب الدولہ کا پوتا اور ضابطہ خاں کا بیٹا تھا۔ شاہ عالم نے غوث گڑھ کو فتح کر کے ضابطہ خاں کے بیوی بچوں کو اپنا قیدی بنایا تھا۔ انہیں میں آٹھ نو سال کا ایک خوبصورت لڑکا بھی شامل تھا جسے بادشاہ زنانے کپڑے پہنوا کر اپنی تفریح کے لیے نچوایا کرتے تھے اور اسے خصی کرا دیا گیا تھا۔ یہی لڑکا غلام قادر تھا جو موقع پاتے ہی بھاگ نکلا اور باپ کے پاس پہنچ گیا۔ اگست ۱۷۸۸ء میں جب غلام قادر نے شاہ عالم کو اندھا کرایا تو دراصل تاریخ نے اپنے آپ کو نئے انداز میں دہرایا۔ کبھی اس کے باپ کی بیویوں اور کنیزوں کو مجمع عام میں نچوایا گیا تھا اور اس نے مغل شہزادیوں سے اس بے عزتی کا بدلہ لیا۔

---

[۱۰] امتیاز علی خاں عرشی' دیباچۂ نادرات شاہی (بحوالہ آب حیات) ص ۳۹' رام پور ۱۹۴۴ء

اپنے اندھے پن کا احساس شاہ عالم کی شخصیت کا حصہ بن گیا۔ آنکھوں کا مضمون ان کی غزلوں میں بار بار نظم کیا گیا ہے اور مختلف پہلوؤں کے ساتھ۔ یہ آنکھیں جو بے نور کر دی گئیں انہیں آنکھوں نے اسے مختلف گناہوں اور ''اقدام'' پر اکسایا تھا جن میں غلام قادر کے رقص کا منظر بھی شامل تھا۔

لاچار ہوں میں اپنی آنکھوں کے ہاتھ' یارو　　کرتی ہیں دشمنی نت یہ میرے ساتھ یارو!

داماں و آستیں کو اے آفتاب میرے　　خوناب میں ڈبایا' ان آنکھوں کا بُرا ہو

کرتی ہیں میرے دل پر جو کچھ جفا' سو آنکھیں　　تقصیر نہیں کسو کی' جو ہیں بلا' سو آنکھیں

اے آفتاب کر نہیں سکتا ہوں کچھ بیاں　　مجھ سے سلوک واہ ان انکھیوں نے کیا کیا

نادرات شاہی میں اردو غزلوں کے علاوہ ہوری' کبت' سیٹھنے' مبارک باد جشنِ نو روز اور ترانے وغیرہ شامل ہیں۔ اس متنوع کلام سے اس عہد کے ذوق' شاہی محل کی تقریبات اور شاہ عالم کے عقائد و عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی کئی غزلیں غوث اعظمؒ کی مہندی سے متعلق ہیں۔ حضرت علیؓ کی منقبت ان کا محبوب مضمون ہے۔ شاہ عالم ثانی نے اپنے ملک کے انتظام کو سنبھالنے کی جگہ عیش و عشرت کو اپنا لیا اور انتظام و فتح کو دعاؤں کے سپرد کر کے یہ بھول گئے کہ ''در دعا امکان و عمل شرط است''۔

یہ عرض آفتاب کی ہے تجھ سے یا کریم!　　تختِ شہی پہ میرے تئیں رکھیو جاوداں

کرتا ہے ہر مہم کو تو' عالی جناب فتح　　یا مرتضیٰ علیؓ! تو مجھے دے شتاب فتح

اسی طرح ''پیرانِ پیر'' سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہو دخل مملکت میں سب شش جہت کی میرا　　دولت مری نہایت' حد سے زیاد کیجیے

ہو سلطنت کو میری رونق اے پیر میرے　　اور عہد سے مرے اب رفع فساد کیجیے

ہولی' بسنت' نوروز کے ساتھ ساتھ پیرانِ پیر کی مہندی اور عرس میں عقیدت کے

ساتھ ساتھ اپنی ہوا و ہوس کی تسکین بھی مدنظر تھی۔ طبلے پر تھاپ پڑتی اور رقاصہ کے پیروں کے گھنگھرو ''چھن چھن'' کا نغمہ الاپتے۔ اسی طرح روشنی کا بھی اہتمام کیا جاتا اور نابینا ہونے سے پہلے شاہ عالم ''بارش نور'' میں مطرب کی صدا سنتے اور گل عذاروں کا رقص دیکھتے۔

مطرب صدائے خوش سے بہ یک سو غزل سرا — اور یک طرف کو رقص میں ہر گل عذار ہے
عرسِ شریف حضرتِ پیرانِ پیر ہے — آراستہ یہ بزم کرامت نثار ہے

OOO

جدھر نگاہ جاوے' ہے اس طرف چراغاں — پہنچے نظر جہاں تک یکسر ہے روشنائی
ہے گویا بارش نور' از بسکہ چھوٹتی ہے — مہتاب' جاہی' جوہی اور پھلجھڑی' ہوائی

گزشتہ صفحات میں دہلی کے ان شاعروں کی سیاسی اور تاریخی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم تر تھے۔ یہ اردو غزل کا عہد زریں ہے اور اس میں اچھے شاعروں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان میں سے بعض شاعروں کے نام اس جائزہ میں بھی آئے ہیں' لیکن چونکہ انہوں نے سیاسی و تاریخی مسائل پر زیادہ توجہ نہیں دی' اسی لیے ان کا تفصیلی ذکر نہیں کیا گیا۔ خواجہ میر اثر' میر سوز' کلیم' شاہ ہدایت' بیان' میر قدرت اللہ' ضیا' بیدار' بقا' عظیم' خواجہ امانی وغیرہ اس عہد کے ایسے شاعر ہیں جن کے بغیر اس شاعرانہ دور کی مکمل تفہیم ممکن نہیں۔ خواجہ میر اثر اور سوز اپنی ذاتی کیفیات کے شاعر ہیں۔ ان کا یہ ذہنی رویہ بھی موضوع بن سکتا ہے' لیکن ان بزرگوں کے یہاں سیاسی پس منظر زیادہ اہم نہیں۔ دوسرے جن شاعروں کا ذکر ابھی کیا گیا ہے وہ بھی سیاسی اور تاریخی مسائل کے ترجمان ہیں۔ ان کے کلام کے اس پہلو کا ایک طائرانہ جائزہ یقیناً اس دور کی شاعری کی تصویر کی تکمیل میں مدد دے گا۔ ان کی شاعری کے سیاسی اور تاریخی پہلو کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

خواجہ امانی دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۸۷ھ (م ۱۷۷۳ء) میں مرشد آباد جاتے ہوئے انتقال کیا اور یوں ان کا یہ شعر ایک سچی پیش گوئی ثابت ہوا۔

عندلیبو! بساؤ اب صحرا باغ سے موسمِ بہار گیا

دو شعر اور پیش کیے جاتے ہیں۔ "گلوں" کے ساتھ "تجمل" کا تلازمہ نیا اور اہم ہے اور اس سے اس علامت کی تہ داری کچھ اور اُبھر آئی ہے۔

زمانہ جائے عبرت ہے، چمن کا حال چل دیکھو
تجمل جن گلوں کا کل تھا سو وے آج جھڑتے ہیں
مساوی جانیو خوش طالعی و بدنصیبی کو
امانی! منعم و مفلوک سب کے دن گزرتے ہیں

خواجہ احسن اللہ بیان کا آبائی وطن اکبر آباد تھا۔ "عمدۂ منتخبہ" میں کہا گیا ہے "اصلش از کشمیر و مولد شاہ جہاں آباد"[۱] چمنستان و گلزار کے مطابق آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور وہیں ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء یا ۱۷۹۹ء) میں وفات پائی۔

مرزا مظہر کی تربیت اور استادی ہمارے خیال میں محض فن تک محدود نہ تھی۔ ان کے ان شاگردوں کے دل میں ہمیں انہیں کی طرح آزادی کا جذبہ پر فشاں نظر آتا ہے۔

قفس میں، میں رہائی کے لیے کیا کیا نہیں کرتا پھڑکتا ہوں، تڑپتا ہوں، کوئی پروا نہیں کرتا

جب وہ دہلی کے قفس میں کوئی رخنہ نہ پیدا کر سکے تو حیدر آباد کا رُخ کیا۔ دور دراز منزل، سفر خطرناک...... سفر کے ارادے کے ساتھ یہ اندیشے ذہن میں اُبھرے لیکن خدا کی آشنائی کا خیال ان پر غالب آیا۔

حال غربت میں دیکھیے کیا ہو رہ خطرناک اور منزل دور
جز خدا آشنا نہیں کوئی کشتی ٹوٹی ہے ساحل دُور

میر محمد باقر حزیں دہلی کے باشندے تھے اور مرزا مظہر کے شاگرد۔ دہلی سے ہجرت کرنے والے شاعروں میں یہ بھی شامل ہیں۔ دہلی سے یہ عظیم آباد چلے گئے

---

[۱] میر محمد خاں بہادر سرور، عمدۂ منتخبہ، صفحہ ۱۴۴

تھے۔ حزیں کو بھی اپنے استاد اور ''استاد بھائیوں'' کی طرح غلامی کا شدید احساس ہے مگر یہ احساس ان کے یہاں حوصلہ کی شکست بن گیا ہے۔

جس دن سے میں سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار — اس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں

شاہ قدرت اللہ[۱۲] دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد چلے گئے تھے۔ چندے لکھنؤ میں بھی ٹھہرے۔ ان کے نزدیک برعظیم کا ہر حصہ ایک قفس تھا اور ان قفسوں کے قیدی ایک دوسرے سے ہم کلام بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

ذرا قفس سے قفس تو ملا کے رکھ صیاد — کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد

کیا عجب' مرشد آباد کے لیے دہلی سے قدم اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہو۔

حسرت اے صبحِ وطن! ہم سے چمن چھوٹے ہے — مژدہ اے شامِ غریبی! کہ وطن چھوٹے ہے

میر محمدی بیدار' میر و سودا کے ہم عصر تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے دہلی چھوڑ کر آگرہ چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ مختلف شہادتوں کی بنا پر انہیں خواجہ میر درد کا شاگرد قرار دیا جا سکتا ہے۔[۱۳] بیدار کی عشقیہ شاعری میں بڑی جان ہے۔ جہاں تک سیاسی رنگ کا تعلق ہے ان کے دیوان میں زیادہ اشعار نہیں' لیکن جو شعر اس انداز کے ہیں ان میں ایک طرف تو میر کی طرح دہلی کا ماتم ہے اور دوسری طرف اپنے ہم عصروں کی طرح انہیں بھی اپنے چمن پر صیاد کی وجہ سے قفس کا گمان گزرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ''فرنگی'' کی تصویر ان کی غزل میں ابھرنے لگتی ہے۔ وہ قیدِ فرنگ کو قیدِ حیات اور گرفتاریٔ زلف سے کم نہیں سمجھتے۔ فرنگستان کا بھی تذکرہ ہے۔ اس دور سے ہی سمرقند و بخارا کے ساتھ ساتھ فرنگستان کا ذکر آنے لگا تھا۔ یہ انداز غالباً شاہ حاتم سے شروع ہوا۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۲۔ انہیں تذکرہ نویسوں نے عام طور پر شمس الدین فقیر کا شاگرد لکھا ہے لیکن صاحب شعر الہند نے مرزا مظہر اور جعفر علی حسرت کا شاگرد کہا ہے' ہمیں اس کی کوئی قوی شہادت نہ مل سکی۔

۱۳۔ جلیل قدوائی' مقدمہ' دیوانِ بیدار' صفحہ ۲' الہ آباد۔ ۱۹۳۷ء

یہ قصر یہ ایوان جو دیکھو ہو شکستہ   یک وقت میں تھا خانۂ معمور کسی کا

ہم اسیروں کو نہیں ہے ذوقِ گلِ گشتِ چمن   ہے ہمیں چاکِ قفس ہی رخنۂ دیوار باغ

نہ چھٹا اس کی زلف میں جو پھنسا   سچ ہے قید فرنگ کے مانند

نے فقط تجھ حسن کی ہے ہند کے خوباں میں دھوم
ہے تری زلف چلیپا کی فرنگستان میں دھوم

میر عبدالرسول نثارؔ میر و مرزا کے ہم عصر تھے۔ میر صاحب سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ وطن اکبر آباد تھا۔ میر صاحب سے انہوں نے عشقیہ جذبات کو ''عصری'' استعاروں کے ذریعہ پیش کرنے کا فن سیکھا تھا۔ اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکے گا۔

ہر سمت صد تمنا تڑپے ہیں خاک وخوں میں   ہے صحنِ خانہ میرا میدانِ جنگ تجھ بن

منشی بندر ابن راقمؔ دہلی کے کائستہ تھے[۱۴] باغباں سے ان کے تخاطب میں کس درجہ دردمندی ہے۔ حالات کی پراگندگی کا یہ عالم تھا کہ آپس میں بیٹھ کر اپنے حالات پر گفتگو کرنے کا وقت بھی یاروں کے پاس نہیں تھا۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے انشا کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ

غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

راقم کے جس قطعہ بند کی طرف اشارہ کیا گیا وہ حسب ذیل ہے:

اے باغباں! نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض   مجھ کو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب   آپس میں درد دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

---

[۱۴] قدرت اللہ شوق کے بیان کے مطابق پہلے میر سے اصلاح لیتے تھے پھر سودا کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ صاحب ''عمدۂ منتخبہ'' نے مرزا سودا کا شاگرد لکھا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے مرزا مظہر کو ان کا استاد کہا ہے۔ شوق کا بیان درست ہے۔ میر صاحب نے بھی انہیں نکات الشعرا میں اپنا شاگرد لکھا ہے۔

حکیم ثناء اللہ فراق، میر درد کے شاگرد تھے۔ دلی پر مرہٹے، روہیلے، جاٹ جب چاہتے حملہ کرتے، لوٹ مار کرتے اور چلے جاتے۔ اس پر نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں کا اضافہ کیجیے۔ ان حالات میں مستقبل جس قدر غیر یقینی معلوم ہوتا ہوگا اسے فراق نے کس قدر جامعیت اور شاعرانہ حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

چمن کی سیر کو آ جاتے ہیں کبھی گل چیں دماغ کس کو ہے یاں آشیاں بنانے کا[۱۵]

میر محمد حسین کلیم، میر تقی میر کے رشتہ دار تھے۔ اچھے عالم تھے۔ "فصوص الحکم" کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ عروض و قافیہ میں ایک رسالہ اردو میں لکھا"[۱۶]

فصوص الحکم کے ترجمہ سے بھی تصوف سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہو جاتا ہے، لیکن وہ اپنے عہد کے اچھے مبصر تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ درویشی کو بھی لوگوں نے تجارت بنا لیا تھا۔ جب کچھ نہ بن سکے تو درویش بن گئے۔ ان کی ایک رباعی کا بنیادی خیال یہی ہے۔

دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم اس واسطے عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری، محنت و کسب جب کچھ نہ بنا کہا کہ "درویش ہیں ہم"

دو شاعروں کا ذکر ہم نے آخر میں کرنا مناسب سمجھا۔ وہ ہیں بقاء اللہ بقا اور مرزا عظیم بیگ عظیم۔ ان دونوں کی شاعری کا سیاسی پہلو تو زیادہ اہم نہیں لیکن ان کی ادبی معرکہ آرائیاں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔

محمد بقا اللہ بقا اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ دلی میں گزار کر لکھنؤ گئے۔ میر اور سودا دونوں بزرگوں سے بار بار الجھے اور ان دونوں کی ہجو میں اشعار کہے۔ اس اعتبار سے وہ انشا کے پیش رو ہیں۔ یہ مشہور شعر انہیں کا ہے اور میر تقی میر سے خطاب ہے۔

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر اور بستی نہیں یہ دِلّی ہے

۱۵۔ بعض تذکروں اور انتخابات میں "کبھی" کی جگہ "سبھی" ہے۔

۱۶۔ کیفی چڑیا کوٹی، جواہر سخن (پہلی جلد)، صفحہ ۲۲۰، الٰہ آباد ۱۹۳۴ء

میر اور سودا دونوں کو ایک ساتھ ہجو کی رسی سے یوں باندھا ہے!

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملا　　فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب ہجوؤں کی ریسماں سے　　دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا تھا پورا

سیاسی انداز کا ایک شعر بھی پیش کیا جاتا ہے۔

میں تو آیا تھا بقا باغ میں سُن جوشِ بہار　　پر یہ ہنگام خزاں تھا' مجھے معلوم نہ تھا

مرزا عظیم بیگ ''مردِ سپاہی وضع'' تھے۔ شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ درد و سودا سے بھی فیض اٹھایا۔ میر انشا کے عہد تک زندہ رہے بلکہ آج تو وہ انشا سے اپنے مشہور ادبی معارضہ کی وجہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آغاز انشا کی طرف سے ہوا تھا۔ انشا نے مرزا مینڈھو صاحب بہادر خلف نواب شجاع الدولہ کے مشاعرہ میں عظیم پر اعتراضات کر دیئے تھے اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو میں کیا کچھ پہلو تلاش نہ کیے۔

مخمس ہجو انشا کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے:

وہ فاضل زمانہ ہو' تم جامع علوم　　تحصیل صرف ونحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی' حکمت و ہیئت' جفر' نجوم　　منطق' بیان' معانی کہیں سب زمیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دھقاں کا ہل چلے

میر' سودا اور درد کے ہم عصر شاعروں اور ان کے شاگردوں کی شاعری کے اس مطالعہ میں کئی شاعروں کی ہجرت کی داستان ہمارے سامنے آئی۔ ان لوگوں کے ساتھ اردو شاعری کا ذوق اور چرچا برعظیم کے مختلف حصوں تک پہنچ گیا۔ ان شاعروں کے علاوہ اردو کا یہ سفر اٹھارہویں صدی عیسوی میں سپاہیوں اور تاجروں کے ساتھ بھی جاری تھا۔ مختلف صوبوں میں ایسے شاعر موجود تھے جنھوں نے اہم تاریخی واقعات کو نظم کیا۔ چند مثالوں سے اس عہد میں اردو شاعری کی وسعت کا اندازہ ہو سکے گا۔

نامدار خاں پنجاب کا شاعر ہے۔ چڑت سنگھ' رنجیت سنگھ کا دادا تھا۔ اس نے ایمن آباد کے مغل فوجدار کو قتل کر کے شہر کو لوٹا۔ پھر ۱۷۵۷ء میں گجرانوالہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ حاکم لاہور نے اس کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے اس پر حملہ کیا مگر چڑت سنگھ نے

اسے شکست دے دی۔ ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ ابدالی کی فتح اور مرہٹوں کی شکست کی بنیاد پر سکھوں نے اپنی طاقت کی تعمیر کی۔ ۱۷۷۴ء میں جموں کی تخت نشینی کی جنگ میں برج راج دیو کی مدد کے لیے وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوا۔ بسنتی ندی کے قریب لڑائی میں وہ اپنے کسی ساتھی کی بندوق پھٹنے سے ہلاک ہو گیا۔

نامدار خاں دت نے اس کا مرثیہ لکھا[۱۷] مرثیہ مخمس میں کہا گیا ہے۔

احوال چڑت سنگھ کا لکھتا ہوں فی المثل   پہنچا جب اس کا حکم قضا میں دم اجل
آیا ولایت اپنی سے لے کر ہجوم دل   فرصت نہ دی قضا نے چلا چل میں ایک پل
آیا اجل کا شیر ہرن کے شکار پر

اڑ کر لگی تفنگ کی چھپر دماغ میں   جوں تند بادپون کا جھنکا چراغ میں
تھا منتظر نہنگِ اجل کا سراغ میں   عالم کے دل موں داغ لگا اور داغ میں
افسوس ایسے مرد کا مرنا دیار پر

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی ۱۷۴۹ء (م ۱۱۶۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ سیرو سیاحت کے شوقین تھے۔ وہ پُر آشوب زمانہ بھی ان کا راستہ نہ روک سکا"۔

۱۲۲۱ھ (م ۷۔۱۸۰۶ء) تک مختلف مقامات کی سیرو سیاحت کرتے رہے۔ میر گھسیٹا عشق، فدوی اور شور کے بعد میر صاحب کے شاگرد ہوئے اور اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے رہے۔[۱۸] ان کا شہر آشوب عظیم آباد یا بہار کے حالات تک محدود نہیں بلکہ اس میں برعظیم کی عام کیفیت کو پیش کیا گیا ہے کیونکہ راسخ نے اپنے طویل زمانہ سیاحت میں ہر جگہ ارباب ہُنر کو پریشان اور معاشرہ کو ناہموار پایا۔

معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے   فقط مفلسی برسرِ کار ہے
گدائی کا کاسہ لیے دربدر   ہیں آوارہ اربابِ فضل و ہنر
مشائخ جو ذی عزو تعظیم ہیں   دل ان کے بھی صدمہ کش بیم ہیں

۱۷۔ حافظ محمود خاں شیرانی، پنجاب میں اردو، صفحہ ۲۴۵ تا ۲۴۸، طبع سوم لاہور

۱۸۔ کیفی چڑیاکوٹی، جواہر سخن جلد دوم، صفحہ ۶۷ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد۔

گئے سارے وردو وظائف کو بھول | کیا ایسا فکرِ شکم نے ملول
لکھوں خوش نویسوں کا میں حال کیا | نوشتے پہ اپنے ہیں گریاں سدا
زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے | دُرِ مدعا' یاں تو نایاب ہے
تجارت کا مایہ کسو میں کہاں | کہ باقی نہیں کچھ بجز نقدِ جاں
طبابت میں بھی اب نہیں کچھ حصول | اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول
سپاہی کی مٹی بھی اب ہے خراب | کہ تیغا ہوا نوکری کا تو باب
نہ ترکش ہے' نہ تیر ہے نے کماں | خدنگِ الم کے نشاں ہر زماں

مثنوی کا لباس شہر آشوب کے جسم پر کیسا سجا ہے۔ راسخ کی یہ مثنوئ شہر آشوب میر کی مثنویوں کی طرح داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہے۔ فکر شکم میں ملول ہو کر وظیفہ و اوراد کو بھول جانے کا ذکر ہمیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے اقتصادی خوش حالی کو اخلاقیات کی بنیاد قرار دیا تھا۔

رعایت لفظی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ صرف ہوئی ہے مثلاً زراعت کا بے آب ہونا اور تجارت کے سلسلہ میں ''نقد جان'' کا ذکر۔

جوہری' راسخ کے ہم عصر اور ہم وطن ہیں۔ وہ ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے دور کے حالات کے بیان میں ملّی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا ہے۔ یہی نقطۂ نظر مصحفی کے یہاں بھی ہے۔ جوہری نے اپنے قصیدہ میں زمانے کے عام مصائب کا دکھڑا رونے کے ساتھ مسلمانوں کی ابتری اور اخلاقی اقدار کی شکست کا ماتم بھی کیا ہے۔ اس قصیدہ کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

کہاں ہے دین کی شوکت' گئی کیدھر مسلمانی | کیا ہے کفر نے اس دور موں از بسکہ طغیانی
حمیت دین کی نہیں رہی مسلمانوں کو عالم موں (کذا) | زہے غیرت' زہے عار و زہے ننگِ مسلمانی
جہاں سے اٹھ گئی ہے اے عزیز و خیر و برکت سب | گئی مہر و محبت اور بڑھی ہے حرص حیوانی

سلطان ٹیپو کی شہادت اٹھارہویں صدی کے اختتام کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت نے انگریزوں کے استعمار کے قلب میں چُبھا ہوا سب سے

سخت کانٹا نکال دیا۔ ٹیپو کے عہد میں میسور میں اُردو عوامی زندگی کے ساتھ ساتھ دفتری کاروبار میں بھی دخیل ہونے لگی تھی' اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میسور میں اردو شاعری کا ذوق بھی مروج ہو چلا تھا۔ ''نوحہ ٹیپو سلطان'' ایک نامعلوم شاعر کی تخلیق ہے۔ اس نوحہ میں بھی اسلامی جذبہ موجود ہے اور سلطان ٹیپو کی جنگ کو جہاد قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس نے دین احمد (ﷺ) کے لیے اپنی جان فدا کی' اس نوحہ کے تین بند پیش کیے جاتے ہیں۔

تاریخ تھا اُنیسویں ذیقعد' روز ہفت تھا   تقویم کے احوال کو آ کر منجم نے کہا
''تقدیر کی تحریر پر راضی ہوں بولا بادشاہ   ''از برائے دینِ احمدؐ جان خود سازم فدا
ذلت اسلام نا ہووے ''یا الٰہی در جہاں''

دوپہر کا وقت تھا غوغا کیے کافر تمام   چھوٹے سلخ توپوں کے اس دم نا رہا کوئی سقف و بام
میر صادق لعنتی کا جس طرف تھا اہتمام   کر دیا ہلہ فرنگی اس طرف سیتی تمام
تاب نا لا کر بھاگ نکلا لعنتی ولد زناں

جب ہوئی شہ کو خبر' ہلہ کیے کافر تمام   چڑھ کو گھوڑے کے اُپر' لے دست میں سیف امام
چھت سرک کر سیف کو کیتا بہوت سے قتل عام   لا عدو کفار کو مارا بہ حسن انتظام
میر فوج کافران کے بہوت سے کاٹا سراں

اس عہد کی شاعری کا جو جائزہ پیش کیا گیا اس میں شاعرانہ محاسن کے ساتھ ساتھ تاریخی صداقت کا التزام بھی ملتا ہے۔ تاریخی واقعات سے متعلق شاعری سے قطع نظر عام اردو شاعری پر ان واقعات نے جو اثرات مرتب کیے ان کا اندازہ بھی اس جائزے سے ہو سکتا ہے۔

مہاجر شعرائے دہلی

دبستان لکھنؤ کا آغاز اور نظیر اکبر آبادی

گزشتہ باب میں دہلی کے کئی شاعروں کی ہجرت کا ذکر آچکا ہے اور اس ہجرت کے اسباب بھی واضح ہیں۔ تاریخی جائزے کے علاوہ دوسرے ابواب میں بھی دلی کی بپتا کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔ ۱۷۳۶ء سے ۱۷۷۲ء تک کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ دہلی کی مسلسل تباہی کے مواقع کو پیش کر دیتا ہے۔ نادر شاہی حملہ (۱۷۳۹ء) سورج مل جاٹ کی یلغار (۱۷۵۳ء) عماد الملک کا جور وستم' احمد شاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھرنا اور مسلسل لاقانونی صورت حال (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۷ء) کے جلو میں ابدالی کے حملہ سے دہلی پر مرہٹوں کے قبضہ تک...... یہ دور ایک پانچ ایکٹ کے خونین ڈرامہ کی طرح ہے۔ ایسے حالات میں دہلی کے اہل کمال وطن سے نکلے اور مرشد آباد' عظیم آباد اور دکن تک پہنچے۔ لکھنؤ تو پھر قریب تھا۔

مکانی قرب کے علاوہ لکھنؤ کی محفل سخن کی آراستگی میں وہاں کے نواب وزیروں اور عمائد کی قدردانی کا بھی بڑا دخل ہے۔ شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ سے ہی اہل کمال کی قدردانی اور عزت افزائی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجہ میں چندے فیض آباد "بیت الغزل" بنا اور پھر لکھنؤ "ایوان سخن"۔ سالار جنگ کی وجہ سے سراج الدین علی خاں آرزو نے بھی دہلی کو خیر آباد کہا اور فیض آباد پہنچے[1] خان آرزو کے علاوہ مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر بھی اودھ آ گئے۔ ان شاعروں کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ ان کی شاعری پر اودھ کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کو غزل میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن مثنویوں اور دوسرے اصناف سخن میں تو بہت نمایاں ہیں۔ سودا کے یہاں شجاع الدولہ کے جو مدحیہ قصائد اور ضاحک کی ہجویات ہیں وہ اسی دور سے متعلق ہیں۔

---

[1] ابواللیث صدیقی' لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' صفحہ ۸۱' طبع ثانی' لاہور۔

سودا اور میر نے آصف الدولہ کی مختلف دلچسپیوں اور ان کی زندگی کے واقعات کو بھی نظم کیا ہے۔ آصف الدولہ کی شخصیت اور شاعروں کی قدردانی نے اودھ کو ایک ادبی مرکز بنا دیا۔ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ لکھنؤ نے دہلی کی جگہ لے لی۔ بقول انشاء ''ایں شہر شاہجہان آباد شدہ است، لکھنؤ نمانده است'' [۲] آصف الدولہ خود بھی اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں فن تعمیر کو بڑا فروغ دیا۔ اپنے اس ذوق کا اظہار شعر کے پیرائے میں اس طرح کیا ہے۔

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے عمارت بناتے چلے جایئے

خان آرزو، میر، سودا، میرسوز، حشمت، تحسین، دیوانہ یہ وہ شاعر ہیں جو دہلی میں اپنے مزاج کے پتھر کو شعر کے شیشہ میں ڈھال چکے تھے۔ اسی لیے انہیں اس دور کا شاعر قرار دینا مناسب نہ ہو گا۔ ان کے بعد کی نسل کے شاعر مصحفی، انشاء، رنگین اور جرأت ہیں۔ اول الذکر تین شاعروں کی شاعری کا آغاز دہلی میں ہو چکا تھا۔ مصحفی کا غنچہ سخن دہلی ہی میں کھل کر پھول بن چلا تھا۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ

اے مصحفی پورب ہی میں شاعر نہ ہوا میں دلی ہی میں چوری مرا دیوان گیا تھا

اسی طرح ''مجالس رنگین'' کی کئی مجلسیں دلی کے ادبی ماحول سے متعلق ہیں۔ رنگین، شاہ حاتم کے شاگرد تھے اور ایسے شوخ شاگرد کہ استاد کے شعر پر اعتراض کرتے اور استاد مان لیتے۔ لیکن ان شاعروں کی شاعری اور زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لوگ نئے ماحول سے جس طرح متاثر ہوئے خاص طور پر انشاء اور رنگین، اس کا مطالعہ ان کی شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔ جرأت نے تو فیض آباد ہی میں نشو ونما پائی تھی۔ میر حسن جو عمر میں ان سب سے بڑے تھے ان کے کلام پر بھی نئے ماحول کی چھاپ نظر آتی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''دبستان لکھنؤ'' کی بنیاد انہیں لوگوں کے ہاتھوں پڑی۔ ناسخ نے اس نئے رنگ کو ایک ضابطہ عطا کر دیا اور زبان کو مرتب کرنے کی کوشش کی۔

---

[۲] انشاء، دریائے لطافت، ص ۲۳۲، ۲۳۳

نواب وزیران اودھ کے علاوہ اودھ میں ان شاعروں کے اور بھی قدر دان اور سرپرست تھے جن کا ذکر شعرا کے حالات کے سلسلہ میں آئے گا۔ میر نوازش علی خاں (سالار جنگ کے بیٹے) مرزا مینڈھو' نواب محبت خاں فرزند رحمت خاں کے علاوہ دلی کے شاہزادے مرزا سلیمان شکوہ نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ ان کی سرکار سے انشا' مصحفی اور رنگین سب ہی وابستہ رہے۔ یہ سب ''سرکاریں'' اور خاص طور پر مرزا سلیمان شکوہ کا دربار شاعروں کی چشمکوں' معرکوں بلکہ سازشوں کا مرکز بن گیا۔ بعض کی قدر دانی کی جاتی' بعض کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا جاتا۔ مصحفی اس بارے میں خاص طور پر بدنصیب تھے۔

لکھنؤ کی فضا نے اگر ایک طرف غزل کو رعایت لفظی' معاملہ بندی اور خارجی انداز دیا (اس پہلو پر آگے چل کر ناسخ اور آتش کے سلسلہ میں گفتگو زیادہ مناسب ہو گی) تو دوسری طرف امرا کے اثرات سے سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا رواج بڑھا اور پھر غزل در غزل۔ باہمی چشمک شاعروں کو دوغزلہ' سہ غزلہ' چہار غزلہ کہنے پر اکساتی اور اس پر فخر کا اظہار کیا جاتا۔

اے مصحفی اک تازہ غزل اور سنا دے   مشتاق ہیں آخر کو سخن دان ہمارے

جواب اپنی غزل کا تو آپ کہہ جرأت

لکھنؤ کے اس دور کی ایک اور نمایاں خصوصیت اردو کی خود مختاری کے اعلانات ہیں۔ اردو غزل کو مرزا مظہر' میر' سودا' درد وغیرہ نے اس مرتبہ تک پہنچا دیا تھا کہ بعد والے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکیں

مصحفی فارسی کو طاق میں رکھ   اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

اب تو جرأت ہے یہ رتبہ غزل ہندی کا   کہ مشوش ہوئے سن کے شعراء ایراں کے

لکھنوی دبستان شاعری کا مختصر تجزیہ اس مقالہ کے آخری باب میں پیش کیا گیا ہے۔ چند نکات اس باب میں اور اگلے باب میں بھی آئیں گے۔ بہرحال اس دور کے شاعروں کے کلام کے سیاسی اور تاریخی پہلو کے جائزہ سے پہلے یہ عرض کر د

ہے کہ اس دور میں مثنوی کو فروغ حاصل ہوا۔ میر حسن، مصحفی اور رنگین نے مثنوی کی صنف کو رُودار بنایا۔ رنگین نے تو مثنوی میں ریختی بھی کہہ دی۔ دو ہم صنفی ذوق رکھنے والی عورتوں کے ساتھ ایک مرد کے انتقام کو رنگین نے مثنوی کی شکل میں پیش کیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ نظیر زمانی اعتبار سے اس دور کے شاعر ہیں مگر اپنی شاعری کی بنا پر اپنا دور آپ ہیں۔ تذکرہ نگاری کے عہد میں تذکرہ نویسوں نے انہیں سوقیانہ انداز کا مالک سمجھ کر ان کے ذکر سے اپنے قلم کو ''آلودہ'' نہ ہونے دیا لیکن عہد حاضر میں وہ اردو کے ''پہلے عوامی شاعر'' قرار دیئے جاتے ہیں۔

جدید اردو تنقید نے جہاں ادبی اقدار کے از سر نو تعین کی کوشش کی ہے وہاں شاعروں کے مراتب کا تعین دوبارہ کیا گیا ہے۔ یقین، قائم، مصحفی، نظیر اکبر آبادی اور غالب کے نام اس سلسلہ میں سب سے ممتاز ہیں۔ نظیر کی اہمیت کا احساس آج صرف ادبی نقاد ہی کو نہیں بلکہ برعظیم کا تمدنی مؤرخ بھی نظیر کے وسیلہ سے اس عہد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

> ''وہ اپنے مذاق میں آزاد اور بے تعصب تھے۔ ان کے الفاظ کا ذخیرہ درباری شاعروں کے ذخیرۂ الفاظ کی طرح محدود نہ تھا بلکہ وہ الفاظ کا خود ایک مجسم گنجینہ تھے...... آب حیات میں اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ بہ ایں ہمہ اس کے اشعار انیسویں صدی کی ہندوستانی شاعری میں تصنع کے خلاف بغاوت کا پیشہ خیمہ ہیں''[۳]

ان چند معروضات کے بعد اب اس عہد کی شاعری کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

میر حسن عمر میں اپنے بیشتر ہم عصروں سے بڑے تھے۔[۴] میر حسن اپنے والد کے ساتھ

---

۳ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ صفحہ ۱۴۱۔

۴ مختلف مؤرخوں نے ان کا سالِ پیدائش مختلف بتایا ہے۔ یہ سال ۱۱۴۰ھ (م ۱۷۲۷ء) سے ۱۱۵۴ھ (م ۱۷۴۲ء) تک کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سارے بیانات کی تنقیح کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ میر حسن ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے (میر حسن اور ان کا زمانہ، ص ۲۰۴) گویا تقویم عیسوی کے اعتبار سے ان کا سالِ پیدائش ۱۷۴۱ء یا ۱۷۴۲ء ہے۔

دہلی سے فیض آباد پہنچے۔ پہلے انہوں نے میر ضیاء الدین ضیاء سے اصلاح لی اور بعد میں سودا کے شاگرد ہو گئے۔ یہ سلسلہ فیض آباد سے لکھنؤ تک جاری رہا۔ لکھنؤ میں میر حسن جب شاعری کے دام سے اپنے آپ کو ''نجات'' دلانا چاہتے تھے تو سودا شعر کہنے کے محرک بنے۔

گیا تھا بھول سب کچھ میں تو ''بنگلے کی جدائی میں''
غزل یہ مجھ سے کہوائی حسنؔ سودا نے کہہ کہہ کر

ضاحک اور سودا کے معرکہ میں میر حسنؔ نے اپنے والد کی جانب سے سودا کی ایک ہجو لکھی جو اُن کے قلمی دیوان میں موجود ہے۔[۵]

میر حسن کی شاعری میں ان کی اور ان کے عہد کی زندگی کے بہت سے پہلو موجود ہیں۔

ان کی آمدنی قلیل تھی۔ سردار جنگ خلف نواب سالار جنگ کی سرکار سے انہیں مشکل سے اتنی رقم ملتی کہ پیٹ بھر جاتا۔ ویسے بے روزگاریوں کے دور میں انہیں اسی رقم کا پابندی سے ملنا غنیمت معلوم ہوتا تھا۔

---

۵ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ یہ ہجو میر حسن کی نہیں بلکہ میر ضاحک کی ہے جو غلطی سے میر حسن کی کلیات میں شامل ہو گئی (علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر صفحہ ۱۴۳) ہمارے خیال میں قاضی صاحب کا استدلال اس بارے میں محکم نہیں۔ رہا سودا کی وفات پر میر حسن کا یہ شعر۔

حسن سودا زبان اپنی میں خلّاقِ معانی تھا
کرے اب کیا سخن کی کوئی خلّاقی تکلف ہے

سوا سے اس ہجو کے خلاف دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس دور کی اخلاقی قدروں میں سے ایک قدر تھی کہ مرنے والوں کا ذکر احترام سے کیا جائے۔ یہ قدر آج بھی زندہ ہے کیونکہ موت کے ساتھ سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ مصحفی نے بھی انشا کا ذکر احترام اور عزت کے ساتھ ایسے لہجہ میں کیا ہے کہ پڑھنے والوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ باہمی معرکہ آرائی کی تلخی بھی انشاء کے ساتھ مر گئی۔

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگِ قتیلؔ و مُردنِ انشا مجھے

ہے غنیمت جو اس زمانے میں اپنی تنخواہ پائے جاتا ہے
ورنہ بے روزگاریوں کا غم ایک عالم کو کھائے جاتا ہے

☆☆☆

جز بے سروسامانی حسن ہم نے جہاں میں افسوس کہ کچھ اور سر انجام نہ دیکھا

میر حسن کے کلیات کے دو مخطوطے کتاب خانہ رام پور میں موجود ہیں۔ ان میں سے قدیم تر اور بہتر ۱۲۵۳ھ (م ۳۸۔۱۸۳۷ء) کا لکھا ہوا ہے، یعنی میر حسن کی وفات کے کوئی ۵۲ سال بعد کا ہے۔ رامپور کے نسخہ کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"دیوان کلیات میر حسن مع مثنویات بموجب حکم حضور پر نور نواب صاحب قبلۂ دوراں فیاض زماں نواب احمد علی خاں بہادر دام اقبالہ بدستخط عاصی پُر معاصی رحیم اللہ[۶] باتمام رسید در ۱۲۵۳ھ"

اس مخطوطہ میں سالار جنگ، آصف الدولہ، جواہر علی خاں اور آفرین علی خاں کی مدح میں قصائد موجود ہیں۔

ایک مثنوی میر حسن نے اپنی حویلی کی ہجو میں لکھی ہے۔ میر حسن کی یہ مثنوی ہمیں میر صاحب کی یاد دلاتی ہے۔ وہ بھی اپنے مکان سے نالاں تھے۔ "ہجو حویلی میر حسن" کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

ہے احاطہ فلک کا یہ جب سے کس نے دیکھا ہے ایسا گھر تب سے
ہم نے جیسا لیا ہے یاں اِک گھر دو روپے کے تئیں کرایہ پر
صحن اس کا بتاؤں کس مقدر اکؔ دوؔ تینؔ چارپائی وار
نوکا یا دس کڑی کا اک دالان تس پہ اس ٹوٹی جھونپڑی کی شان
سیڑھی اک بانس کی پرانی سی آنے جانے کے واسطے ہے رکھی
رات دن سب کے دل میں خطرۂ جاں پاؤں پھسلے تو پھر عدم کو رواں

[۶] امتیاز علی خاں عرشی نے دستور الفصاحت کے صفحہ ۸۵ کے حواشی میں کاتب کا نام "محمد رحیم" لکھا ہے وہ پورا نام لکھنا بھول گئے۔

اس مثنوی میں بیانیہ کا پہلو نمایاں ہے۔ اپنے مسائل کی پیش کش میں اردو کے شاعروں نے اگر ایک طرف مبالغے سے کام لیا ہے تو دوسری طرف ایسی حقیقی اور سچی تصویریں بھی ملتی ہیں۔

فیض آباد کی تعریف میں جو مثنوی ہے اس میں یادِ دلی بھی شامل ہے۔ مصحفی نے میر حسن کے حال میں لکھا ہے کہ "بہ عمر دوازدہ سالگی قضا او را بہ طرف پورب افگندہ" [۷]

اس مثنوی میں میر حسن نے اپنے معاشقۂ دہلی کا ذکر کیا ہے۔

لگا تھا ایک بت سے واں مرا دل ہوئی اس کی جدائی سخت مشکل
چلا گاڑی میں یوں آیا میں لاچار قفس میں جس طرح صیدِ گرفتار
کسی رہ میں نظر پڑتا تھا جب باغ میں اپنے دل کے لگتا دیکھنے داغ

ڈاکٹر وحید قریشی مصحفی کے اس بیان کو درست نہیں سمجھتے کہ میر حسن بارہ سال کی عمر میں اودھ آئے۔ ان کی تحقیق کے مطابق "میر حسن فیض آباد میں ۱۱۷۹ھ اور ۱۱۸۳ھ کے درمیان وارد ہوئے۔ [۸] ڈاکٹر وحید قریشی نے "دلائل کے کئی سلسلوں کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے" مگر ہمارے نزدیک ایک معاصرانہ شہادت کے ہوتے ہوئے یہ سلسلے چنداں وقیع نہیں۔ مصحفی، میر حسن سے خاصے قریب تھے۔ اس کا اندازہ میر حسن کی وفات پر ان کے قطعہ تاریخ سے ہوتا ہے۔

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں رہ ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی "شاعر شیریں زباں" تاریخ یافت

۱۲۰۱ھ

مصحفی نے جہاں کہیں تاریخیں دی ہیں عموماً درست ہیں۔ رہا بارہ برس کی عمر میں عشق، سو یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔ ادبیات عالم کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

---

۷ مصحفی، تذکرہ ہندی (مرتبہ مولوی عبدالحق) ص ۶۸، طبع اول ۱۹۳۳ء۔

۸ وحید قریشی، میر حسن اور ان کا زمانہ، ص ۳۴۱

میر حسین کے یہاں دلی کی یاد محض ''حب وطن'' کا تقاضا نہیں بلکہ اس سے ان کی پہلی محبت بھی وابستہ ہے۔ مثنوی کے اشعار میں یہ پہلو ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ غزلوں میں بھی اسی کیفیت کی جھلک ہے۔

گئے وے دن جو رہتے تھے جہاں آباد میں ہم بھی
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھ

OOO

کس سے پوچھوں حالِ دل باشندگان دل کا ہائے
اس نگر کے رہنے والے کس نگر کو اٹھ گئے

''باشندگانِ دل'' کی ترکیب اسی سیاق وسباق میں اپنی وضاحت آپ کرتی ہے۔

میر حسن کی مثنویاں اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔ دربار' محلات' تقریبات' جشن وجلوس سب پر اودھ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ سحر البیان کا قصہ اگرچہ دوسرے ملک سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کی فضا اودھ کی ہے۔ اور ان کی مثنویوں میں ان کے عہد کے اودھ کا معاشرتی خاکہ بھی نظر آتا ہے۔ بعض ایسے پہلو انہوں نے پیش کیے ہیں کہ اودھ کے تاریخ نگاروں نے انہیں مثنویوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ مثلاً مثنویٔ خوان نعمت میں آصف الدولہ کے دسترخوان کے کھانوں کی تفصیل ہے۔ اسی طرح لکھنؤ اور فیض آباد کا مقابلہ تاریخی طور پر بہت دلچسپ ہے' فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی مذمت' شہروں کی تاریخ اور ترقی و زوال سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خاص اہمیت کی چیز ہے۔ فیض آباد کے بارے میں یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ انگوری وہ موتی باغ دیکھا ارم جس کے حسد سے داغ دیکھا
سرِ بازاروں تر پو لیا ہے کہ جُوں دروازۂ جنت کھلا ہے
بنایا ہے کسی استاد کا وہ نمونہ ہے جہاں آباد کا وہ

میر حسن کے دور کا لکھنؤ ''باغوں کا شہر'' نہیں تھا بلکہ

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا   کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
عجب ہے یاں کی رسم و راہِ گندی   گہے پستی ہے اور گاہے بلندی

فیض آباد سے میر حسن کی وابستگی کی وجہ وہاں کے ترپولیا کی جہاں آباد سے مماثلت بھی ہے۔

میر حسن کی کلیات میں ''فردیات'' کی نوعیت تاریخی ہے۔ یہ فردیات مختلف طوائفوں کی تعریف میں ہیں اور ہر فرد میں طوائف کا نام نظم کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ میر حسن کے دور میں یہ سب طوائفیں اودھ کی ''ممتاز شہری'' ہوں' کیونکہ وہاں کے تمدن میں انہیں ''کلیدی'' حیثیت حاصل تھی۔ یہ بھی امکان ہے کہ یہ نام فرضی ہوں۔ چند نام پیش کیے جاتے ہیں:

شرفو' راجہ' جیونی' جلالو' ماہ رتن' فیضو' پنّا' مصری' مانی' جمعیت' اوجاگر' گوجری' نورن' دولت آبادی' ظہورن (ظہوراً) چیت لگن' کاکو' کریم بخش' برفی۔ ننھی اور ''دردانہ'' کے بارے میں فردیات ملاحظہ ہوں۔

لیے جاتی ہے دل آنکھوں میں سب کا   سمجھتی ہی نہیں ایسی ہے ننھی

عجب لذت' مزا ہے اس میں یارو   بدن دُردانہ ہے اس گلبدن کا

ان فردیات کو ہم نے اس غرض سے پیش کیا ہے کہ ان میں لکھنوی انداز شاعری کے آغاز کو دیکھا جا سکتا ہے۔ میر حسن ''لکھنویت'' کے بانیوں میں سے ہیں' ان کے یہاں لکھنویت کا مذہبی پہلو بھی ہے اور جنسی پہلو بھی۔ ان کی غزلوں میں بھی لکھنو کی معاملہ بندی کی جھلک نظر آتی ہے۔

غیر سے وہ گرم سرجوشی رہا جو دیر تک   میں پڑا زانو بدلتا اور گھبراتا رہا

مضامین و موضوعات سے قطع نظر فنی طور پر بھی میر حسن ''لکھنویت'' کی تاریخ کے طائرانِ پیش رو میں سے ہیں۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اپنی رعایت لفظی کی وجہ سے بدنام ہے۔ میر حسن کے یہاں یہ رعایت کثرت سے موجود ہے۔

گریہ کرتا ہے حسن زیرِ درختِ بادام　　یاد آئی ہے اُسے کیا کسی دلدار کی آنکھ

OOO

گیسو درازِ سُن کے ترے دل ہوا ہے بند　　تو سلسلہ میں اپنے ہمیں بھی مرید کر

غلام ہمدانی مصحفی کے بارے میں مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ "وہ بیک وقت ماضی کی یادگار اور حال کی کشاکش میں مبتلا اور مستقبل کے میلانات کا اشاریہ ہیں"۔[۹]

مجنوں کے یہ الفاظ نہایت اہم ہیں، اگرچہ ہمارے ذہن میں ان کے معانی خود صاحب مقالہ سے مختلف ہیں۔ مجنوں نے کہا یہ ہے کہ ان کے کانوں بلکہ ذہن میں متقدمین کے راگ گونج رہے تھے؟ اور ان کے عہد میں جرأت و انشاء کا اسلوب مقبول ہو رہا تھا، مصحفی نے انہیں ملا کر ایسے اندازِ سخن کی بنیاد رکھی جو مستقبل کا معیارِ تغزل بن گیا۔ ادبی اسلوب سے قطع نظر سیاسی اور تاریخی طور پر بھی یہ بات مصحفی کے بارے میں درست ہے۔ وہ ایک بدلتے ہوئے معاشرے میں ماضی کی یادگار تھے کیونکہ انہیں اسلاف کی اقدار عزیز تھیں اور اسی لیے انہوں نے حال سے مفاہمت نہیں کی، اور اگر کی بھی تو یک طرفہ شرائط پر نہیں۔ ان کی اسی جانداری کا نتیجہ اگر ایک طرف ان کا ادبی مرتبہ ہے تو دوسری طرف یہ حقیقت کہ وہ ہماری شاعری کے اُس عہد کے بہترین سیاسی اور ادبی مبصروں میں سے ہیں۔

یہ ادبی اور سیاسی بصیرت ان کے پیش روؤں میں بھی تھی، لیکن مصحفی نے مختلف اثرات کو یکجا کر دیا۔ اس طرح ان کی شاعری اپنے دور کے میلانات اور رجحانات کا سنگم بن گئی اور شاید اسی بنا پر فراق گورکھپوری نے بڑی جرأت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ "مصحفی کے یہاں بہ نسبت میر کے تنوع زیادہ پایا جاتا ہے"۔[۱۰]

مصحفی شجاع الدولہ کے دور ہی میں ۱۷۷۱ء یا ۱۷۷۲ء میں اودھ پہنچ گئے تھے۔ پھر وہ اپنی متاعِ ہنر کے ساتھ دہلی واپس چلے گئے۔ مصحفی کی یہ واپسی دہلی سے ان کی

---

۹ مجنوں گورکھپوری (مقالہ مصحفی اور ان کی شاعری) اردو کے کلاسیکی شعراء (مرتبہ ایم۔ حبیب خاں) جلد اول، صفحہ ۱۰۵ علی گڑھ ۱۹۶۲ء

۱۰ فراق گورکھپوری، اندازے

شدید محبت اور وابستگی کی دلیل ہے' حالانکہ وہ امروہہ کے رہنے والے تھے اور دہلی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ دہلی سے وہ سخت انتشار کے دور میں نکلے تھے۔ شاہ عالم کا دور تھا۔ دہلی پر مرہٹوں کے تسلط کے علاوہ چور اچکوں کا قبضہ تھا' لیکن مصحفی کے لیے مرہٹوں کا غلبہ ناقابل برداشت تھا۔ سندھیا نائب شاہ تھا اور مسلمانوں پر اس کے مظالم کا عالم یہ تھا کہ مہاجروں کے قافلے ہر صبح جامع مسجد کے میناروں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے دور دراز منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ مصحفی نے اپنے شہر آشوب میں جس طرح اس سیاسی پس منظر کو پیش کیا ہے' اس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں۔ وہ مختلف پیشہ وروں کے حال زار کو پیش کرنے کی جگہ حقائق کی تہ تک پہنچ گئے۔

کہتی ہے اُسے خلق جہاں سب شہِ عالم | شاہی جو کچھ اُس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے
اطراف میں دلی کے وہ لٹھ ماروں کا ہے زور | جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ وہاں ہے
اس شہر کا جس دن سے ہوا سندھیا حاکم | چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر ایک نگراں ہے
بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے واں کا | ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے
اس شہر کے باشندوں سے جا کر کوئی پوچھے | جز خون جگر کچھ بھی غذائے دل و جاں ہے
اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک | ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے
دلی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں | ویران ہیں محلّے' سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں بادِ خزاں کے ہاتھوں | اُکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں

یہ اشعار مصحفی کے ''تنوع'' کا ثبوت ہیں۔ جذبات اور مشاہدات' داخلیت اور خارجیت کا یہ امتزاج دوسری جگہ مشکل سے ملے گا۔ ''چمن''، ''بادِ خزاں'' اور ''شجر'' کی علامتیں دوسرے شاعروں کے یہاں اس طرح نہیں اُبھر سکیں۔ ''افراد'' کی جڑیں اپنے معاشرے میں درختوں ہی کی طرح پیوست ہوتی ہیں۔

مصحفی دلی واپس چلے تو گئے لیکن وہ دہلی میں رہ نہ سکے اور مجبوراً ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء میں دوبارہ لکھنؤ آنا پڑا۔ مصحفی کے پہلی بار لکھنؤ سے جانے کو ہمارے ادبی مؤرخوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اسی طرح دہلی میں دوبارہ کم از کم بارہ سال کے قیام کی مدت کی

سختی کو نہیں سمجھا گیا۔ مصحفی مصائب کا مقابلہ کرنا جانتے تھے' لیکن ایسے دور میں مقابلہ کی قوت کب تک باقی رہتی؟ دوسری بار لکھنؤ پہنچنے کے بعد مصحفی کو مرزا مینڈھو اور خاص طور پر مرزا سلیمان شکوہ سے توسل رہا۔ مرزا سلیمان شکوہ کے زمانۂ ملازمت ہی میں مصحفی اور انشاء کا مشہور معرکہ ہوا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی تحقیق کے مطابق آغاز مصحفی کی غلط فہمی سے ہوا' اور پھر تو سلسلہ اتنا کھنچا کہ معاذ اللہ۔ شاید اسی معرکہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ مصحفی کی تنخواہ میں کمی ہو گئی۔

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے
ہم بھی کہیں روزوں میں تھے پچیس کے لائق

غیرت مند مصحفی اپنی یہ ذلت برداشت نہ کر سکے اور سلیمان شکوہ کے ''در'' سے رخصت ہو گئے۔

جاتا ہوں ترے در سے تو قیر نہیں یاں کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

مصحفی نے کم سے کم ۲۱ ممدوحین کے قصیدے لکھے۔[۱۱] ان میں مرزا مینڈھو' میر محمد نعیم خاں' مرزا سلیمان شکوہ' جہاں دار شاہ اور آصف الدولہ کے نام زیادہ ممتاز ہیں' لیکن ان کی زندگی جس طرح گزری اس کی تلخ شہادت ان کی شاعری ہے۔ مصحفی کی قسمت میں معاشی خوشحالی کی کوئی ساعت نہ آئی۔ انہیں نان شبینہ کے لیے اپنی ''اولاد معنوی'' بھی بیچنی پڑی۔ اگر دوشالہ مل جاتا تو رنگائی کے لیے دام نہ ہوتے اور تنخواہ مہینوں نہ ملتی۔

شاہا کہ وسیع تر ہے ترا دست سخا گزرے کئی ماہ ازرہ لطف و عطا
انعام ہوا تھا جو دوشالہ مجھ کو رنگت کے لیے ہے وہ کھٹائی میں پڑا

○○○

دی بانٹ محل میں چُن چُن کے تنخواہ اور ہم کو بہانوں میں ہی ٹالا کئی ماہ
انصاف سے کتنا دور ہے میر نعیم لاحول ولا قوۃ الا باللہ

معاشی بدحالی کی جسمانی تکالیف اپنی جگہ مسلّم' لیکن مصحفی کی نفسیاتی اور ذہنی

۱۱۔ ڈاکٹر ابو اللیث' مصحفی اور ان کا کلام' صفحہ ۵۷' بارِ اول' لاہور۔

تکالیف زیادہ شدید تھیں۔ مصحفی لکھنؤ والوں کے اندازِ زیست' زبان اور شاعری سے مطابقت پیدا نہ کر سکے جب کہ انشاء' رنگین اور جرأت اسی رنگ میں رنگ گئے۔ خود میر حسن اسی تبدیلی کے اولین ترجمانوں میں سے بن گئے۔ بہرحال مصحفی اپنے آپ کو لکھنؤ میں ادبی اور لسانی طور پر ہمیشہ غریب الوطن سمجھتے رہے۔ ان کے یہاں اس باب میں جو تلخی ہے وہ زہر آلود ہے۔ تنہائی ناگن کی طرح ذہن اور روح کو ڈستی ہے۔

مصحفی کے ہر دیوان میں یہ مضمون ملتا ہے۔

اے مصحفی جدا ہے انداز اس بیاں کا صحرائیانِ پورب کب جانتے ہیں اس کو

یا رب! شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

غالباً مصحفی کا یہی شعر "دِلّی کہیں ہیں جس کو......" اُس مشہور قطعہ کی بنیاد بن گیا جو میر تقی میر کے نام سے منسوب ہے۔

کیا بودو باش پوچھے ہو پورب کے ساکنو

ادبی اور لسانی ذوق کے اختلاف کے علاوہ اودھ کے مذہبی رجحانات نے بھی اس سرزمین کو مصحفی کے لیے کبھی قابل قبول نہ بننے دیا۔ ایک رباعی میں اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے۔

سمجھے ہیں درود سے بھی لعنت کو یہ خوب یہ شیوہ نہیں طبع کے اپنی مرغوب
ہے مجلس شیعان میں اک سُنی یوں سو نکٹوں میں جیسے ناک والا معیوب

یہ تلخی مصحفی کی رباعیوں' قطعوں اور قصیدوں میں زیادہ ہے۔ غزل میں زمانہ کے ستم کو انہوں نے بقول فراق "ایک رچے ہوئے اعتدال" میں ڈھال دیا۔ یہ تلخیاں ان کے لیے ایک مسلسل ترستے رہنے کی کیفیت میں بدل گئی ہیں۔ یہ کیفیت مصحفی کی

ردیفوں میں بھی ہے اور استعاروں میں بھی۔ ''جا سکتے ہیں'' ''جاتے رہتے''، ''جاؤں گا''، ''کرتی رہی''، ''باقی ہے''، ''رہ گیا ہوگا''، یہ چند ردیفیں ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ اسی طرح ''ہماری قدیم شاعری کی علامات یعنی استعاروں میں ''مرغ اسیر'' بظاہر فرسودہ اور پیش پاافتادہ ہے لیکن مصحفی نے اپنی زندگی، اپنی آرزوئیں اور تمنائیں، حسرتیں اور ناکامیاں سب اسی ایک استعارہ میں کس کس طرح ادا کی ہیں''[۱۲] اس حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ مصحفی کے دیوانوں سے ترتیب کے ساتھ چند اشعار پیش کیے جائیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ علامت مصحفی کی شخصیت تک پہنچنے کا دروازہ ہے۔ دیوان اول تا چہارم سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

دیوان اول

کنج قفس سے چھوٹ کے پہنچا نہ باغ تک — حسرت یہ جی میں مرغ گرفتار لے گیا

○○○

قفس میں مرغِ گرفتار کا وہ شور نہیں — پھڑک پھڑک تپش دل سے رہ گیا ہوگا

○○○

صیاد کو کیا مرغِ گرفتار خوش آیا — کرتا تھا قفس میں وہ چمن زار کی باتیں

دیوان دوم

قفس سے چھوڑے ہے اب مجھ کو کیا تو اے صیاد — چمن کے بیچ کہاں موسم بہار رہا

چاک قفس سے مُرغِ قفس سر نکال کر — کہہ کے مر گیا ''قفس مجھ پہ تنگ تھا''

دیوان سوم

رہے اسیر قفس سالہا ہزار افسوس — نہ دیکھی ایک بھی فصل بہار ہم نے تو

اتنا ہوا ضعیف کہ باہر نہ جا سکی — چاک قفس سے مرغ گرفتار کی نگاہ

---

۱۲ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مصحفی اور ان کا کلام، ص ۸۴،۸۵۔

دیوان چہارم

فصل بہار آ گئی اب قفس کے بیچ　　پھڑکیں ہیں طائرانِ گرفتار کس لیے

مصحفی کے کلیات کا اب تک شائع نہ ہونا اپنے ادبی ماضی سے ہماری بے تعلقی کا تکلیف دہ ثبوت ہے۔ نہ جانے اردو والے ناخن کا یہ قرض کب ادا کریں گے؟ مصحفی ہی وہ شاعر ہے جس نے برطانوی استعمار کے خلاف اپنے تمام پیش رووں اور ہم عصروں سے زیادہ قوت کے ساتھ آواز بلند کی۔

اسلامیوں میں دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی　　کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اب ہم غلام اور وہ صاحب ہیں یا نصیب　　ملنے سے جن کے اپنے غلاموں کو ننگ تھا

انگریز جس طرح اودھ کے نواب وزیروں سے بار بار کسی نہ کسی بہانے روپیہ وصول کرتے تھے' اس نے مصحفی کو یہ کہنے پر مجبور کیا

یہ طرفہ کہ ہم کو ہی کرو قتل　　اور الٹا ہمیں سے خون بہا' لو

مصحفی کی غزلوں سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں جن میں بیداد فرنگ کا ذکر بھی ہے اور برعظیم کے کسی نہ کسی حصہ میں مسلسل جنگ کا حال بھی ہے۔

تری بیدادی سے شہر اے "فتنہ گر" خالی ہوئے
قافلے لاکھوں گئے اور گھر کے گھر خالی ہوئے

ہندوستان نمونۂ دشت بلا ہے کیا　　جو اس زمین پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

تیری دہشت سے باغ میں صیاد　　مرغ سب آشیاں چھوڑ گئے

ہے مصحفی کہیں کا کہیں فرد کی طرح　　جب سے ہوا ہے دفتر ہندوستان غلط

مصحفی کی شاعری سے جو نمونے پیش کیے گئے' ان کی بنا پر ہم انہیں اس عہد کا

سب سے اہم شاعر قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے۔ مصحفی صاحب سیف نہیں تھے۔ سیاستدان نہیں تھے' مغربی سامراج کے خلاف میدان جنگ میں داد شجاعت نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے فن کو ایک حربہ کی طرح استعمال کیا' تڑپتے رہنے کی کیفیت' کسک اور بے کسی کے مسلسل اظہار کے باوجود ان کی شاعری میں دعوت عمل اور للکار بھی ہے۔ ان کے بال و پر' تو قابل پرواز نہیں تھے لیکن صیاد کے خلاف ان کے لبوں کی فغاں کبھی نہ تھمی۔ وہ ایسے مرغ گرفتار تھے جو قفس میں ہمیشہ چمن زار کی باتیں کرتا رہا۔

میر انشاء اللہ خاں انشاء ایسے جوہر قابل تھے جس نے اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح نہیں پہچانا۔ جب معاشرہ میں توازن نہ ہو تو یہ المیہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ وہ ہفت زبان تھے۔ عربی' فارسی' ترکی' ہندی اور پنجابی زبانوں ہی سے نہیں بلکہ ان کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ دریائے لطافت اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ خوش طبعی اور ذکاوت کی دولت سے مالا مال تھے لیکن کبھی رُک کر اپنا جائزہ نہ لیا۔ شاید روشنی طبع کے بلا ہونے کی بات انہیں کے بارے میں پیشین گوئی کے طور پر کہی گئی تھی۔

شاہ عالم کے زمانے میں انشا مرشد آباد سے اپنے والد کے ساتھ دلی پہنچے۔ وہاں علم و فضل کی پوچھ نہ تھی۔ انشا نے اپنی ظرافت اور پھکڑ پن سے بادشاہ کے حلقہ میں اپنی جگہ بنائی۔ اس اعتبار سے وہ ہمیں فارسی کے ہزل گو عبید زاکانی کی یاد دلاتے ہیں۔ دلی ہی میں مرزا عظیم بیگ عظیم سے ان کا معارضہ ہوا۔ یہ معارضہ ان کی آنے والی زندگی کا اشاریہ تھا۔

دوسرے صاحبانِ کمال کی طرح انشا بھی لکھنؤ پہنچے۔ ان کے ورود لکھنؤ کا سال ۱۷۹۰ء ہے۔ یہاں وہ مرزا سلیمان شکوہ کے دامن سے وابستہ ہوئے۔ مصحفی اور رنگین سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی۔ رنگین نے ''مجالس رنگین'' میں انشا سے اپنے یارانے کا

ذکر کیا ہے۔ مصحفی کے ذکر میں مصحفی وانشا کے معرکے کا ذکر ہو چکا ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر انشا کے کلام میں ہجوٗ ابتذال اور پھکڑ پن کے عناصر کی موجودگی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ان عناصر کے باوجود انشا کے کلام میں ان کے عہد کے تاریخی اور سیاسی واقعات کا عکس ہے۔ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ ان حالات کو انہوں نے جس طور پر پیش کیا ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے دائرہ فن میں شامل نہیں۔

جس پاس کہ سولاکھ روپے کا بھی نہیں ملک اس شخص پہ اصلا نہیں نواب کی پھبتی

انشا بڑے زمانہ شناس آدمی تھے۔ جس عہد میں مصحفی برطانوی سامراج کے خلاف اپنی فریاد کو نغمہ کا لباس عطا کر رہے تھے' انشا نے اسی سامراج کے چوکھٹ پر گردن جھکا دی۔ انشاء نے بادشاہ انگلستان جارج سوم کی سالگرہ کے موقع پر نئے آہنگ کا قصیدہ لکھا ہے۔ غالباً یہ اُردو شاعری کا پہلا نمونہ ہے جس میں انگریزی کے الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ بات صرف انگریزی الفاظ تک محدود نہیں بلکہ اس میں ایک مخصوص فضا بھی موجود ہے۔ قصیدہ کی تشبیب بہار یہ ہے مگر یہ بہار برعظیم کی نہیں چمنستان فرنگ کی ہے۔

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے ''پوڈر''
بیٹھ کر جلوے کی کرسی پہ دکھاوے گا پھبن
اپنے ''گیلاس'' شگوفے بھی کریں گے حاضر
غنچہ و گل سبھی واں کھولیں گے بوتل کے دہن
پتے ہل ہل کے بجائیں گے ''فرنگی طنبور''
لالہ لاوے گا سلامی کو بنا کر ''پلٹن''

یہ قصیدہ لسانیات اور اصطلاح سازی کے سلسلہ میں انشا کی خداداد صلاحیت کا ثبوت ہے۔ ''میوزیکل باکس'' کا ترجمہ انہوں نے ''صندوق فرنگی'' کیا ہے۔ اس طرح رجمنٹ قصیدہ میں ''رجمن'' ہو گئی ہے جیسا کہ سیاسی تجزیہ میں عرض کیا گیا ہے بیک وقت دو حکومتیں تھیں اور انشا بٹی ہوئی وفاداریوں کے آدمی تھے۔

دونوں سرکاروں کا اقبال رہے روز افزوں دوست سب شاد ہوں پامال رہیں سب دشمن

انشا کی غزلوں میں بھی انگریز کے اقبال کا سایہ نظر آتا ہے۔

مروڑی فوج انگریزی نے دی اک ایسے ہی بل کی
کہ رسی کٹ گئی بلکر کی' ٹوٹا جاٹ کا جوڑا

''جاٹ کے جوڑے'' سے مراد روپ رام کٹار اور رنجیت سنگھ راجہ بھرت پور ہیں۔

انشا کی شاعری میں ہندو دیومالا کے کرداروں کے ذکر سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ''رادھکا'' ''کشن'' اور ''مہادیو'' وغیرہ' یہ کردار ان کی شاعری کے جنسی پہلو کو ابھارتے ہیں۔

کیڑے کے پر انگیا میں لگا رادھکا بولی ہے کشن یہ ٹن کو مورے انگ میں کیڑا

رادھکا کو چین کیا آوے کنہیا جی بغیر واقعی کافور اڑ جاوے اگر فلفل نہ ہو

ناسخ اور آتش کے شاگردوں کو جس رنگ غزل کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے' انشا کے یہاں وہ بہت شوخ ہے۔ محبت کی جگہ محبوب بلکہ محبوب کے جسم' لباس اور زیور کو غزل کا موضوع بنانے والوں کے طبقۂ اول میں وہ بھی شامل ہیں۔

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت ٹال کر کہنے لگے ''دن ہے ابھی رات کے وقت''

نہ لگی مجھ کو جب اس شوخ طرح دار کی گیند اس نے محرم کو سنبھال اور ہی تیار کی گیند

یہ انشا کی زندگی اور شاعری کا ایک پہلو ہے۔ وہ بڑے ''ہنسوڑ'' تھے لیکن زندگی کس کا لحاظ کرتی ہے۔ زندگی نے انشا کے تبسم میں بھی غم کی گرد شامل کر دی۔ اس کی مثال ان کی مشہور غزل ہے' جس کا مقطع ہے۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

سعادت یار خاں رنگین اور انشا میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں نے نظم اور نثر کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ رنگین اس باب میں خوش قسمت ہیں کہ ان کی کم و بیش تمام تصانیف محفوظ رہ گئیں۔ مجالس رنگین اور ''اخبار رنگین'' شائع ہو چکی ہیں۔ مجالس رنگین میں اس عہد کی ادبی فضا مقید ہو گئی ہے اور اسے پڑھتے ہوئے ہم اپنے آپ کو حلقۂ یاراں میں بیٹھا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اخبار رنگین تاریخی اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے۔

رنگین نے اپنی پیدائش کا سال ۱۱۷۰ ھ (۵۷ ۔ ۱۷۵۶ء) بتایا ہے۔ مرزا طہماسپ بیگ کا یہ بیٹا مہم جو تھا۔ دلی میں شاہ حاتم کے حلقۂ تلمذ کا شوخ رکن بنا۔ پھر کبھی تجارت کی، کبھی تلوار ہاتھ میں لے میدان جنگ کا رُخ کیا اور آخر میں امرا اور شہزادوں کا مصاحب بنا۔ اس کے سر پرستِ خصوصی مرزا سلیمان شکوہ تھے۔

ریختی کا آغاز اگرچہ دکن میں ہو چکا تھا مگر اُسے رنگین نے اردو کی باقاعدہ صنف بنایا۔ ان کے تلامذہ کے حلقہ میں ریختی گو خواتین بھی شامل تھیں۔ مجالس رنگین میں انہوں نے دختر قصاب سے اپنے معاملہ کا حال بیان کیا ہے اور طوائفوں سے اپنے معاشقوں کی نشاندہی کی ہے۔ رنگین لکھنؤ کی جنسی تاریخ کے مؤرخ اور نمائندے ہیں، مگر اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مجلس پنجاہ و ہفتم (مجالس رنگین) میں اپنے ارادہ حج کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس ارادے سے کلکتہ بھی پہنچ گئے تھے مگر ''اُدھر کا اشارہ'' نصیب نہ ہو سکا۔

اپنے معاشرہ کی جنسی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ رنگین نے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کا شہر آشوب سب سے مختلف ہے، وہ کامیابی کے لیے جھوٹ بولنے کی تلقین کرتے ہیں۔

جھوٹا کبھی نہ جھوٹا ہووے   جھوٹے کے آگے سچا رووے

ہمارے موضوع کے پیش نظر رنگین کی سب سے اہم تصنف ''جنگ نامہ رنگیں'' ہے۔ یہ جنگ نامہ انہوں نے ۱۲۴۵ھ (۳۰۔۱۸۲۹ء) میں جنگ پاٹن کے متعلق لکھا جو

۱۲۰۲ھ (۸۔۱۷۸۷ء) میں لڑی گئی تھی۔[۱۳]

شمالی ہند میں رزمیہ شاعری کی کمی کے پیش نظر یہ جنگ نامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ رنگین خود بھی اس میں شریک تھے۔ ڈاکٹر صابر علی خاں نے اس کے نمونے درج کرنے کے ساتھ ساتھ اس جنگ کے پس منظر کو بھی اجاگر کیا ہے۔ بادشاہ دہلی مرہٹوں سے بے حد خوفزدہ تھا اور ان سے نواب اسماعیل خاں کی چھوٹی سی فوج نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ تین لاکھ مرہٹہ فوج کے مقابلہ میں چھ ہزار سوار تھے۔ عام مسلمانوں کو مرہٹوں سے جو نفرت تھی اس کا اظہار اس جنگ نامہ سے ہوتا ہے۔ سپاہیوں نے نواب اسماعیل خاں سے کہا کہ

زبردست ہے سندھیا گو پٹیل — تو ہم بھی نہیں ہیں کچھ اس کے دبیل
وہ کافر ہے اور ہم مسلمان ہیں — بہ دل صاحب دین و ایمان ہیں
مغل ہم ہیں اور وہ مرہٹہ گنوار — جوان اپنے دس اور اس کے ہزار

اسماعیل خاں ''مرد ہشیار'' تھا اور معاملات کو سمجھتا تھا' اس نے جواب دیا کہ

وہ کافر نہایت خبردار ہے — وہ دانا ہے' عاقل ہے' ہشیار ہے
تم اس کام میں مت شتابی کرو — مبادا کہ ناحق خرابی کرو

مگر خرابی ہوئی اور ایسی کہ رنگین کے اپنے دستہ کے ایک سو پانچ سواروں میں سے صرف پانچ سپاہی اور گھوڑے بچے۔

رنگین' انشاء کی طرح انگریز پرست نہ تھے۔ مرہٹوں کے علاوہ انہوں نے فرانسیسیوں اور انگریزوں دونوں کو بُرا کہا ہے۔ ان کی غزل میں بھی غلامی پر غم کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہم رہے کنج قفس میں فصل گل جاتی رہی — اب کہو چشم رہائی کیا رکھیں صیاد سے

۱۳؎ ڈاکٹر صابر علی خاں' سعادت یار خاں رنگین' ص ۲۳' کراچی ۱۹۵۶ء

"لکھنؤ" کی شاعری میں جرأت' معاملہ بندی کی بدولت خاص طور پر مشہور یا مطعون ہیں۔ اس رنگ میں جرأت کو امام اور دوسروں کو مقلد قرار دیا گیا ہے۔[۱۴] جرأت کی شاعری مجموعی طور پر اس رائے کی تائید کرتی ہے لیکن ان کی شاعری کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں میں دو دنیاؤں کا فرق ہے اور ہم آدمی کو غالب کی زبان میں "محشر خیال" کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جرأت دہلی میں پیدا ہوئے' اوائل عمر میں اودھ آ گئے اور نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں سے وابستہ ہوئے۔ بعد میں مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں جگہ ڈھونڈھی۔ ایک مثنوی میں انہوں نے دہلی کی تباہی اور فیض آباد کی آبادی اور نواب محبت خاں سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔

فلک نے کر جہاں آباد برباد ۔۔۔ کیا تھا خوب فیض آباد' آباد
یہ عاصی اپنے تھا نواب ساتھ ۔۔۔ محبت کا یہ شیشہ جن کے ہے ہاتھ
وہی نواب نامی فخر صائب ۔۔۔ وہ ہیں یعنی محبت خان صاحب

فخر صائب کہہ کر جرأت نے نواب محبت خان کی شاعری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جرأت جوانی ہی میں اندھے ہو گئے تھے۔ "حیف کہ چشمش در عین جوانی بہ یک ناگاہ نابینا شدہ"[۱۵] اس سانحہ نے ان کی عشقیہ شاعری میں لمسیاتی پہلو کو ابھار دیا اور شاید اسی حسرت نے جنسی رنگ کو شوخ کر کے انہیں معاملہ بندی کا امام بنا دیا اور دوسری طرف محرومی کے احساس کے تحت وہ دوسرے شاعروں سے الجھنے لگے۔ جرأت نے ایک نئے انداز کا شہر آشوب لکھا ہے۔ دیوان جرأت کے مخطوطۂ رام پور میں اس کا عنوان ہے۔ "شہر آشوب در ہجو نو شاعران و مخصوص ظہور اللہ خاں نوا"۔ اس ہجو کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

---

۱۴ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی' لکھنو کا دبستان شاعری' ص ۱۴۹' طبع دوم' لاہور۔
۱۵ مصحفی' تذکرہ ہندی' ص ۶۳۔

اب ان کو دے شفقِ چرخ شال نارنجی   بُنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنجی
یہ دیکھ کیونکہ نہ الجھے بہ خانۂ تن جی   ظہور حشر نہ ہو کیوں، جو کلچری گنجی
حضورِ بلبلِ بستان کرے نوا سنجی

دیوان جرأت کے اس مخطوطہ میں وزیر علی کی ''تاریخ قید'' ہے۔ وزیر علی کو انگریزوں نے جس طرح لکھنؤ کی مسند سے الگ کیا وہ کمپنی کے نام پر ایک دھبہ ہے۔ اس واقعہ پر ہم پہلے دو ابواب میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ مجمدار نے وزیر علی کے واقعہ کو تاریخ آزادی کا اہم واقعہ قرار دیا ہے جو انگریزوں کو برعظیم سے نکالنے کی منظم تحریک کی ایک کڑی تھا۔ جرأت اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لیتے ہیں کہ انہوں نے بڑی حد تک اس کی اہمیت کو سمجھا اور ''قید فرنگ'' کے اسیر پر آنسو بہائے' یہ واقعہ ۱۲۱۲ھ (م ۱۷۹۸ء) کا ہے۔ وزیر علی ستمبر ۱۷۹۷ء سے جنوری ۱۷۹۸ء تک لکھنؤ کے نواب وزیر رہے۔ ''تاریخ قید'' سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

زمیں پر عجب نیّرِ خوش دلی   درخشاں تھا رشکِ مہِ آسماں
سو اس کو کیا داخل بُرجِ غم   کر اس چرخ نے شعبدہ بازیاں
مقید ہوا وہ بقیدِ فرنگ   جو تھا صاحب فوج با عظم و شاں
شجاعت میں تھا جو کہ یکتائے دہر   سو اب کیا وہ لاچار ہے الاماں
ہوا اب جو عالم کا عالم کچھ اور   تو عالم نہ ہو کیونکہ گریہ کناں
جنہوں کے لیے تھی یہ کوشش وہی   اسیری سے اس کی ہوئے شادماں
بہ فانوسِ زندانِ ہوا وہ چراغ   جو تھا روشنی بخشِ ہندوستاں
وہ نواب حاتم وزیرِ علی   پڑا بس بے بس ہو جب ناگہاں
تو جرأت سے پوچھی میں تاریخ قید   کہا ''یہ ہوا شور محشر عیاں''

(۱۲۱۲ھ)

ڈاکٹر محمد صادق معاملہ بندی اور لکھنوی انداز سخن کے پردوں کو ہٹا کر غالباً مصحفی اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی رہنمائی میں جرأت کی اداسی تک تو پہنچ گئے مگر ان کے

خیال میں یہ غم اندھے پن کا نتیجہ تھا۔ ''جرأت ایک آزاد منش اور فیشن ایبل آدمی تھے اور سوسائٹی ان کی جان تھی...... ان کی شاعری کے لامحدود کرب اور درد کا میری رائے میں ایک ہی سبب ہے ۔ ان کا اندھا ہو جانا۔ [۱۶] ہمیں ڈاکٹر صادق کی رائے اور تجزیہ سے اختلاف ہے۔ ویسے بھی کسی چیز کا ''ایک ہی سبب'' قرار دینے کا رجحان خطرناک ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے دعوے کی شہادت کے طور پر جو اشعار پیش کیے ہیں وہ بصارت کھونے کے غم سے زیادہ اس عہد کے تاریخی حالات سے متعلق ہیں۔ ادب کے تخلیقی طریقہ کار کے پیش نظر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جرأت کے ذاتی غم میں ''غمِ حالات ہندوستان'' بھی شامل ہو کر ان اشعار کی صورت میں تشکیل پذیر ہوا ہے۔ نابینا ہونا تو ستم تھا ہی' جرأت کی تنگدستی اور دوسرے مصائب کو بھی ان کے المیہ لہجہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ''لکھنؤ میں عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ لیکن جرأت کی قسمت میں مصائب اور آلام مقدر تھے' اس لیے ان کی زندگی تنگدستی میں گزری اور اسی کا اثر ان کے کلام پر نظر آتا ہے۔ [۱۷]

صیاد اس قدر بھی ستم تک قفس مرا لے جا خدا کے واسطے تو بوستاں تلک

اس صید گرفتار کی کیا کہیے کہ صیاد سونپے ہے قفس میں جسے اور توڑے ہے پر بھی

ان اشعار میں ہمیں ڈاکٹر صادق کے نقطۂ نظر کی شہادت کہیں نظر نہیں آتی۔ جرأت نے بھی اپنے پیش رو اور ہم عصر شعراء کی طرح انہیں اشاروں میں برعظیم کی سیاسی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ ایک غزل کے دو اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

بلبل کہے نہ کیونکہ چمن میں کہ ہائے باغ
اڑتے پھرے ہیں اب خس و خاشاک جائے باغ
ہر گل کی جیب چاک ہے بلبل ہے نوحہ گر
ماتم سرا سے کم نہیں عشرت سرائے باغ

---

[۱۶] Dr Mohammad Sadiq, A History of Urdu Literature, pp 130-131, London, 1964.

[۱۷] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' لکھنو کا دبستانِ شاعری' ص ۱۵۹

میر حسن، مصحفی، انشاء، رنگین اور جرأت کے جلو ہی میں ناسخ اور آتش کی آواز لکھنؤ کی فضا پر چھانے لگی تھی ۱۸

ناسخ و آتش، دبستانِ لکھنؤ کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ ناسخ سے پہلے مہاجر شعرائے دہلی کے طبقۂ دوم نے جس اندازِ سخن کا آغاز کیا، ناسخ نے اسے ترقی دے کر لکھنؤ کی ادبی مرکزیت قائم کر دی۔

ناسخ فیض آباد سے لکھنؤ آنے کے کچھ عرصہ بعد مرزا جانی سے وابستہ ہوئے۔ مرزا کی صحبت اور ان کے باکمال متوسلین سے ناسخ کو اپنے ملکۂ شاعری کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ ۱۸۱۸ء کے لگ بھگ سیاسی اسباب کی وجہ سے مرزا جانی کی نظر بندی سے ناسخ کی پریشانیوں کا دور شروع ہوا، مگر وہ کئی درباروں کا رنگ دیکھ چکے تھے اسی لیے معتمد الدولہ کے مقرب ہو گئے، یہی نہیں بلکہ وہ معتمد الدولہ کی سازشوں میں بھی شریک ہوئے۔ ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر نے مسند نشین ہوتے ہی معتمد الدولہ کے اثر ورسوخ کی جڑ کاٹ دی اور یوں ناسخ کے مصائب کا دوسرا دور شروع ہوا۔ معتمد الدولہ کے حریف میر فضل علی اور حکیم مہدی کا ستارۂ اقبال چمکا اور ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ کانپور، بنارس اور عظیم آباد گئے مگر زیادہ تر قیام الٰہ آباد میں رہا۔ حکیم صاحب کے زوال کے بعد ناسخ پھر لکھنؤ آئے۔ ۱۸۳۷ء میں امجد علی شاہ نے حکیم مہدی کو دوبارہ وزیر بنایا

---

۱۸ مصحفی نے ریاض الفصحا میں دونوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ (م ۱۸۰۶ء) میں شروع کیا گیا اور ۱۲۳۶ھ (م ۲۱-۱۸۲۰ء) میں مکمل ہوا (مولوی عبدالحق دیباچہ ریاض الفصحا) ریاض الفصحا سے دونوں کے ذکر سے متعلق مختصر اقتباسات میں پیش کیے جاتے ہیں۔

امام بخش ناسخ کے متعلق مصحفی لکھتے ہیں۔

"عمرش سی و ہفت سالہ است از سن بست سالگی بمقتضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی می کند"

(صفحہ ۳۳۴، طبع اول)

آتش کا ذکر انہوں نے تعریف کے پیرائے میں کیا ہے۔ آتش ان کے شاگرد تھے۔ "جوان، وجیہہ و مہذب الاخلاق است ...... حالانکہ سنِ عمرش بہ بست ورنہ سالگی، رسیدہ، دریائے طبعش بہ جوش و خروش" (ص ۴)

اور ناسخ نے پھر وادیٔ غربت میں قدم رکھا۔

ناسخ صنعتوں اور خیال آفرینی کے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ مبالغہ و تمثیل کے بغیر ان کی شاعری کا تصور ذہن میں نہیں آتا۔ لیکن سیاسی حالات اور درباری سازشوں کی وجہ سے غریب الوطنی نے ان کے ذہن اور کلام کو متاثر کیا۔ ہمیں ان حالات میں ناسخ کے کردار سے بحث نہیں۔ ہمارا موضوع ان کی شاعری میں ان حالات کا سراغ لگانا ہے۔ ناسخ کے کلام میں اپنی جلاوطنی اور دیارِ غیر میں قیام کا ذکر متعدد مقامات پر ملتا ہے۔

سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ　　شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

ناسخ وطن میں دیکھیے دیکھیں گے گھر کو کب　　غربت میں مدتوں سے ہے اپنا مکاں سرا

اتنی مدت سے ہوں میں وادیٔ غربت میں خراب　　کہ وطن جاؤں تو پاؤں نہ کبھی گھر اپنا

دائرہ شاہ اجمل الہ آباد میں اپنے دوبارہ قیام کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

ہر پھر کے ''دائرہ'' ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

ناسخ کی شاعری کو عام طور پر زندگی کے مسائل سے بے تعلق سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ رائے مجموعی طور پر غلط بھی نہیں۔ وہ تو زبان کی نوک پلک درست کرنے میں لگے رہے یا اپنے مضامین عالی کی فضا میں پرواز کرتے رہے' لیکن جس طرح ماہ و سال اپنا نقش ہمارے چہروں پر جھریوں کی شکل میں مرتب کرتے ہیں اسی طرح سیاسی و تاریخی واقعات شاعری میں اپنی جگہ بنا ہی لیتے ہیں۔ ناسخ نے زندگی کے تقاضوں سے بھاگنا چاہا مگر زندگی ہر ہاتھ میں ہزار آئینے لے کر ان کے فن میں غریب الوطنی کے رخنہ سے داخل ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ناسخ کے یہاں سیاسی صورت حال کی طرف بھی اشارے موجود ہیں۔

اس خرابے میں نہیں ہے کوئی دو دن آباد　　آج معمور جو ہیں' ہوں گے' وہ گھر کل خالی

ذکر پرواز تو کیا تنگ ہے اتنا یہ چمن　　جھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہپر اپنا

ناسخ نے اثنا عشری عقائد کو جس طرح غزل میں داخل کیا وہ تاریخی اعتبار سے اہم ہے۔ لکھنؤ میں شیعیت کا مسلک ریاست کا مذہب بھی تھا اور تمدن کی بنیاد بھی۔ ناسخ اور شیعیت کے زیر اثر منقبتِ اہل بیت' لکھنؤ کی شاعری کا لازمی حصہ بن گئی۔ منقبت میں تبرا کا چھپا ہوا پہلو بھی موجود ہے۔

فصل کیونکر کروں دونوں میں گوارا ناسخ　　کہ محمدؐ سے نہیں حیدر کرارؓ جدا

اسی طرح وہ حضور ﷺ اور حضرت علیؓ کا ذکر کہیں کہیں ایک ہی سطح پر کرتے ہیں' بلکہ حضرت علیؓ کا رتبہ بڑھا ہوا ہی معلوم ہوتا ہے۔

رجعت خورشید اور شق قمر سے ہے عیاں　　ہے نبیؐ مالک لیالی کا' علیؓ ایام کا

ناسخ کی اصلاحِ زبان ایک تاریخی کارنامہ ہے چاہے ہمیں ان کے "آئین نسخ" کی ہر دفعہ سے اتفاق نہ ہو۔ صاحب تذکرۂ جلوۂ خضر نے اصلاحات ناسخ کی جو فہرست مرتب کی تھی وہ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ناسخ کا دوسرا کارنامہ شعرائے لکھنؤ کی تربیت و اصلاح ہے۔ وزیر' برق' رشک' منیر شکوہ آبادی' بحر' جلال' قلق اور امانت جیسے شاعر انہیں کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

حیدر علی آتش معاشرہ کے خلاف فرد کے ردعمل کی مثال ہیں۔ اس نکتہ کو نہ سمجھتے ہوئے بعضوں نے انہیں "لکھنؤ کا غیر لکھنوی شاعر" کہا ہے۔ میر' سودا اور درد کے سلسلہ میں ہم سیاسی و تاریخی واقعات کی اہمیت کے ساتھ ساتھ فن کار کی افتاد اور طبع کی اہمیت کا کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ آتش کا کلام عمل اور ردعمل کا سلسلہ ہے۔ ایک طرف ان کی قلندری اور صوفیانہ اندازِ فکر لکھنؤ کے معاشرے سے مطابقت نہیں رکھتا' دوسری طرف لکھنؤ کے انداز سخن اور ادبی ماحول کی وجہ سے وہ دو غزلے' سہ غزلے لکھنے پر مجبور ہوئے اور سنگلاخ زمینوں پر قدم جما کے چلنا پڑا۔

آتش زمینِ شعر ہو ہر چند سنگلاخ　　لغزش سے آشنا نہیں اہل سخن کے پاؤں

آتش کے یہاں مصحفی کے اثرات کے وجہ سے دہلی کی زبان کے جوہر بھی موجود

ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں عمل اور حرکت کی جو فضا ہے وہ لکھنوی شاعری میں کم نظر آتی ہے۔ آتش تھکنے کے قائل نہیں۔ وہ ایسے دور میں اقدار کے چراغ کو اپنی شخصیت کے دامن میں چھپائے اور جلائے بیٹھے تھے جب اخلاقی چلن بدل رہا تھا اور مخالف ہوائیں بہت تیز تھیں۔ عمل اور حرکت کے عنصر کو ان کے ان دو مشہور شعروں میں ملاحظہ کیجیے۔

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں — زہر پی کر مزہ شہد و شکر لیتا ہے

سفر ہے شرط' مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اقدار کی اسی پاسداری نے آتش کے کلام میں عظمتِ آدم کا تصور پیدا کیا ہے جو لکھنؤ کے دبستان میں ختم ہو چلا تھا۔ یہ تصور انہیں مصحفی سے ورثہ میں ملا ہے' جن کے نزدیک انسان سے ''گریباں گل صبح معطر'' ہے۔ تصوف کے فکری پہلو نے آتش کے کلام میں گہرائی پیدا کی ہے۔ لکھنؤ کی شیعیت میں وہ تصوف کے علمبردار ہیں۔ عظمت آدم کا تصور میر' مصحفی' آتش اور غالب کے وسیلہ سے اقبال کی شاعری تک پہنچا ہے۔ اس سلسلہ میں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

عرش سے آگے ارادہ میری خاکستر کا ہے — دل ہے پروانہ الٰہی! کس چراغِ بام کا

OOO

''چشم بینا'' بھی عطا کی' ''دل آگہ'' بھی دیا — میرے اللہ نے مجھ پر کیے احساں کیا کیا

OOO

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا — تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

''دل آگہ' چشم بینا'' اور ''ظہور آدم خاکی'' کی ترکیبیں اقبال کے یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ اقبال پر اُردو شاعری کے اثرات کا مطالعہ اب تک نہیں کیا گیا ہے۔

آتش کی غزلوں میں سیاسی رنگ بھی ہے' لیکن اس باب میں بھی وہ دبستان لکھنؤ کے شاعروں سے مختلف ہیں۔ وہ قاتل سے مقابلے کی دعوت دیتے ہیں اور اسی طرح

غلامی کے مرکز کو اپنا وطن سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ لکھنؤ اور کمپنی کے تعلقات جس نوعیت کے تھے اس کا اندازہ ذیل کے تین اشعار میں سے آخری شعر سے ہوتا ہے۔

روک منہ پر وارِ قاتل کا سپر کی طرح سے　　مرد کے چہرے کا زیور زخم ہے شمشیر کا

آج ہی چھوٹے جو چھٹنا یہ خرابہ کل ہو　　ہم غریبوں کو ہے کیا غم یہ وطن ہے کس کا؟

پر کترنے سے تو صیاد چھری بہتر ہے　　قصہ کوتاہ کرے حسرتِ پرواز اپنا

لکھنؤ کے دبستان شاعری کو آتش نے دیا شنکر نسیم، نواب مرزا شوق، رند اور صبا جیسے شاعر عطا کیے۔ لکھنؤ کے دو بہترین مثنوی گو شعرا کا ان کے سلسلہ سے متعلق ہونا محض اتفاق نہیں ہے۔

نظیر اکبر آبادی اردو شاعری میں عوامی زندگی کے سب سے اہم مبصر ہیں۔ پروفیسر شہباز اور مخمور اکبر آبادی سے نظیر کی تفہیم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی آخری کڑی (تا حال) ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی کتاب ''نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری'' ہے۔

نظیر کا دائرۂ نگاہ اور دائرۂ شاعری بہت وسیع ہے۔ ''دنیا کو کتاب سے پڑھا اور استاد سے سیکھا بھی جاتا ہے، مگر دل زندہ ہو تو اسے آنکھوں اور کانوں سے پیا بھی جا سکتا ہے'' [۱۹] نظیر نے دنیا کو آنکھوں اور کانوں سے پی لیا اور اسی لیے ان کی بیشتر نظمیں خاص طور پر ''تماشائے دنیائے دوں'' کے بارے میں یہ رائے درست ہے کہ ''نظیر کی یہ نوحہ خوانی کسی ایک سیاسی انقلاب یا حادثہ پر نہیں بلکہ ایک تہذیب اور ایک تمدن کے زوال پر ہے''۔ [۲۰]

---

۱۹ خورشید الاسلام، غالب، صفحہ ۱۷، علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۲۰ ابو اللیث صدیقی، نظیر اکبر آبادی اُن کا عہد اور شاعری، ص ڈ، کراچی ۱۹۵۷ء

نہیں ہے زور جنہوں میں وہ کشتی لڑتے ہیں
جو زور والے ہیں وہ آپ سے پچھڑتے ہیں
جھپٹ کے اندھے بٹیروں کے تئیں پکڑتے ہیں
نکالے چھاتیاں کبڑے اکڑتے پھرتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

نظیر کی شاعری میں دنیا کے تماشے کے ساتھ ساتھ ایک اور پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ وہ ہے اقتصادی مسئلہ کا احساس۔ دوسرے شاعروں نے معاشی بدحالی کا رونا رویا ہے اور اپنے شہر آشوبوں میں بے روزگاری کا تذکرہ کیا ہے لیکن ''آٹے دال'' اور ''تلاشِ زر'' کا ذکر جس طرح نظیر نے کیا ہے کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔ آٹے دال اور روپے کو انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کی طرح پیش کیا ہے۔ ایسی حقیقتیں جو مفلس و کنگال اور تونگر و غنی سب کی زندگی کا محور ہیں۔

کیا کہوں یارو میں نقشہ خلق کے احوال کا　　اہل دولت کا چلن یا مفلس و کنگال کا
یہ بیاں تو واقعی ہے ہر کسی کے حال کا　　کیا تونگر، کیا غنی، کیا پیرا اور کیا بالکا
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

اسی طرح ''مخمس تلاش زر'' میں نظیر کہتے ہیں:

دکھن سے زر کے واسطے سب یاں کو آتے ہیں

مصحفی کے یہاں بھی ہم شمالی ہند پر مرہٹوں کے حملہ کو اسلوب بیان کے ایک حصہ کے طور پر دیکھ چکے ہیں۔ نظیر کو اس درون بینی کی فرصت نہ تھی کہ وہ مرہٹوں کے حملہ کو عشقیہ شاعری کے پیرائے میں ڈھالتے۔ وہ اس تاریخی حقیقت کو بلا واسطہ زندگی کی ایک حقیقت سے ہم آہنگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ نظیر کو اپنے بارے میں یہ کہنے کا حق پہنچتا تھا کہ

ہمہ آفتاب بینم، ہمہ آفتاب گویم

اگر دہلی کو میر، سودا اور مصحفی جیسے نوحہ خواں ملے تو آگرہ کو نظیر جیسا ماتم کرنے والا

نصیب ہوا۔ آگرہ کی معاشرتی زندگی اپنی قوت کھو چکی تھی۔ زندگی میں ایسا تضاد تھا جس نے طوائفوں کے اڈوں اور خانقاہوں کو شرفا کی زندگی میں یکجا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عام آدمی کی زندگی اس عہد کے کھیتوں اور خزانوں کی طرح خالی اور کھوکھلی تھی۔ لوگوں کے اس حالِ زار نے نظیر جیسے شاعر کے اختیار کو اس کے سخن پر بند کر دیا تھا، لیکن وہ ان پابندیوں پر عوامی زندگی سے اپنے گہرے رشتہ کی قوت کی بدولت غالب آیا۔ ہمارے نزدیک یہی بات نظیر کے فن کی اساس ہے اور اسی نے اسے آگرہ کے گرد و نواح کی بولی کو ادبی زبان بنانے کے قابل بنایا۔ نظیر کا یہ امتیاز ہی کیا کم ہے کہ اس نے قلعہ میں بند زبان کو وہاں سے نکال کر میلوں، ٹھیلوں، عرسوں اور مختلف شہر و دیار کی سیر کرائی اور اسے نئی توانائی عطا کی۔ نظیر کے یہاں ہولی، دیوالی، راکھی، جنم کنھیا جی، بلدیو جی کا میلہ، بھیروں، کنھیا راس، شب برات، عید، محرم اور بزرگوں کے عرس کے مُرقعے ہیں۔ اس نے زندگی کو دیکھا، اور ہر پہلو سے دیکھا۔ مشاہدہ کی یہ وسعت اس کے شہر آشوب میں بھی کسی حد تک موجود ہے، حالانکہ اس نے یہ شہر آشوب اپنی طبع کی گرفتاری کے حلقے کو توڑنے کے لیے لکھا تھا۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند — رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر میں ہے موج دار بند — ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

کپڑا نہ گٹھڑی بیچ، نہ تھیلی میں زر رہا — خطرہ نہ چور کا، نہ اُچکے کا ڈر رہا
رہنے کو بن کواڑ کا پھوٹا کھنڈر رہا — کھنکھار جاگنے کا نہ مطلق اثر رہا
آنے سے بھی جو ہو گئے چورو چکار بند

صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار — دیتے تھے سب کو نقد، سو کھاتے ہیں اب اُدھار
بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار — بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنی دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

نظیر کے الفاظ کھردرے ہیں، لیکن ان کھردرے لفظوں سے انہوں نے اپنے

دور کی زندگانی کا مجسمہ تراشا ہے۔ وہ ہماری زبان کے پہلے کوہ کن ہیں جس نے عوامی زندگی کے تیشہ سے زبان کے روایتی تصور کے پہاڑ کا قلب چیر کر مشاہدہ کی جوئے رواں جاری کر دی۔ دوسروں کی شاعری میں روغنی تصاویر ہیں' مجسمہ ساز اس عہد میں نظیر کے سوا کوئی اور نہیں۔

دلّی کا دوسرا عہد زرّیں

شاہ نصیر سے ۱۸۵۷ء تک

جس طرح بعض چیزیں فرسودہ ہونے سے اپنی دلکشی نہیں کھوتیں، اسی طرح بہت سی باتیں ''تکرار'' سے اپنی صداقت سے محروم نہیں ہوتیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ صداقتیں بہت عام ہیں اور ہم سب ان سے باخبر ہیں۔ مگر کبھی تو بات کا سرا گرفت میں لانے کے لیے ان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جس طرح بیمار مرنے سے پہلے سنبھالا لیتا ہے، چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے، اسی طرح کسی عہد کے دورِ آخر میں باکمالوں کا مجمع نظر آتا ہے اور پھر اُس دور کا خاتمہ انہیں باکمالوں کے بکھر جانے سے ''المیہ'' کی شان کا حامل بن جاتا ہے۔

جب دلّی سیرگاہ حوادث تھی تو خواجہ میر درد کے سوا تقریباً سبھی اہم شاعر دہلی سے اودھ چلے گئے۔ میر و سودا سے لے کر رنگین، مصحفی، انشا بلکہ میر ممنون تک ہجرت کا یہ سلسلہ خاصا طویل ہے۔ دہلی اپنے آخری عہد میں ایک بار پھر ادبی و علمی مرکز بنی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور ۱۸۵۷ء تک دلّی مختلف علوم کے کیسے کیسے اکابر کا مرکز تھی اس کا اندازہ اس عہد کی کتبِ تاریخ اور خاص طور پر آثار الصنادید کے متعلقہ باب ''تذکرہ اہل دہلی'' سے ہوسکتا ہے۔ ان باکمالوں سے قطع نظر اس عہد میں ہمیں جو شاعر نظر آتے ہیں ان کے افکار اور فن نے اس عہد کو دہلی ہی کا نہیں بلکہ اُردو غزل کا دوسرا ''عہدِ زریں'' بنا دیا۔

اس باب میں جو شاعر شامل ہیں ان کا تعلق شاہ عالم ثانی کے عہد آخر، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے دور سے ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ شاعروں کی ایک طویل فہرست پیش کرنے اور ان کے کلام پر عمومی تبصرہ کرنے کی جگہ ایسے اہم شاعروں کا ذکر

کیا جائے جو مجموعی طور پر اس عہد کی نمائندگی کا حق رکھتے ہیں اور ان کے کلام کے صرف ایسے پہلوؤں سے بحث کی جائے جن کا ہمارے موضوع سے علاقہ ہے۔ ایک جُداگانہ باب اُردو شاعری اور ۱۸۵۷ء سے متعلق اس مقالہ میں شامل ہے' اسی لیے جن نسبتاً غیر اہم یا کم اہمیت رکھنے والے شاعروں کا اُس باب میں ذکر کیا گیا ہے ان کو یہاں شامل نہیں کیا گیا ہے۔[۱]

شاہ نصیر قائم کے شاگرد شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ جس خیال بندی' دِقت پسندی' سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کو ناسخ کی روایت قرار دیا جاتا ہے' دہلی کے شاعروں میں شاہ نصیر کے یہاں یہ تمام عناصر موجود ہیں لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان اور سطحی نہیں جس انداز سے اب تک اس پر بحث کی گئی ہے۔ خیال بندی' مضمون آفرینی' دِقت پسندی' سنگلاخ زمینیں' مشکل قوافی...... یہ ساری باتیں ہمیں شاہ حاتم اور سودا کے یہاں بھی نظر آ جائیں گی۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک متاخرین شعرائے فارسی کا اثر ہے۔ حاتم نے دیوان زادہ کے دیباچہ میں اگر ریختہ'' میں ولی کو اپنا استاد گردانا ہے تو فارسی میں

---

[۱] تکرار سے بچنے کے علاوہ اس کے دو اور سبب ہیں:

1. اردو شاعری پر ۱۸۵۷ء کے اثرات پیش کرتے ہوئے ہم نے ان شاعروں کو شامل کیا ہے جنہوں نے یہ ہنگامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا خواہ وہ کلام بعد کے زمانے میں لکھا گیا ہو۔
2. شاہ نصیر سے ۱۸۵۷ء تک...... کے تحت صرف ان شاعروں کو شامل کیا گیا ہے جن کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ ۱۸۵۷ء تک ان کی ادبی حیثیت تسلیم کی جانے لگی تھی۔ اسی بنا پر غالب کے شاگردوں میں سے کئی اہم شاعر شامل نہیں کیے گئے۔ اس کا معیار ہم نے سال پیدائش کو قرار دیا ہے۔ مثلاً نواب سید محمد زکریا زکی دہلوی ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے' میرزا شہاب الدین ثاقب ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ (مالک رام' تلامذۂ غالب' دہلی ۱۹۵۸ء) ان لوگوں کو ہم نے اس دور میں شامل نہیں کیا۔

دوسری طرف وہ شعراء ہیں جن کی شاعری کا آغاز تو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہو گیا تھا مگر آج وہ اپنے انہیں کارناموں کی بنا پر ہماری تاریخ ادب میں مقام امتیاز رکھتے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آئے' مثلاً الطاف حسین حالی اور مرزا داغ۔ ان کے علاوہ کچھ شاعر ایسے ہیں جن کا تعلق ۱۸۵۷ء سے پہلے کے دور سے بھی ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد کے عہد سے بھی۔ مثال کے طور پر مرزا غالب' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ' ظہیر دہلوی' سالک' نسیم دہلوی اور میر مہدی مجروح' انہیں ہم نے اس باب میں شامل کیا ہے اور ۱۸۵۷ء سے متعلق شاعری کے جائزہ میں بھی۔

صائب کو۔ مرزا بیدل تو خیال بندی کے سلسلہ میں غالب کے اشعار کی مقبولیت سے بدنام ہوئے ورنہ وہ اس رنگ میں تنہا نہیں تھے۔ شوکت بخاری' مرزا جلال اسیر' بیدل' غنی کاشمیری اور ناصر علی سرہندی ان سب کا فکری سرمایہ اور انداز نظر یکساں ہے' فرق ان کی فنی صلاحیتوں کا ہے۔ اُردو میں شاہ نصیر اور ناسخ نے اس انداز کو کچھ تو ان شاعروں کے اثرات کے تحت' کچھ اپنی افتادِ طبع کی بنا پر اور کچھ اپنے عہد کے حالات کی وجہ سے اپنایا۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اپنی تحقیقی کتاب ''غالب'' میں اس کے ابتدائی دور پر مذکورہ بالا شاعروں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے لیکن وہ شاہ نصیر کو بھول گئے۔ آج غالب کا دیوان تاریخی ترتیب سے ''نسخہ عرشی'' کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے پہلے حصہ ''گنجینۂ معنی'' میں شاہ نصیر کے اثرات یقیناً موجود ہیں۔

زندگی سے بے تعلقی شاہ نصیر کی شاعری میں تمثیل نگاری اور خیال بندی کی صورت میں متشکل ہوئی۔ ان کی تمثیل نگاری ذوق کے حصہ میں بھی آئی اور اسے ذوق نے آگے بڑھایا۔ اس بے تعلقی کا اظہار ایسی زمینوں اور ردیفوں سے بھی ہوتا ہے۔

روحِ فرہاد! لپٹ بن کے جبل کی مکھی ۔۔۔ خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عمل کی مکھی

لیکن یہ شاہ نصیر کی شاعری کا محض ایک رُخ ہے۔ آدمی زندگی سے لاکھ بے تعلق ہونا چاہے مگر خود زندگی اپنے حقائق کے ساتھ ذہن کے دریچوں سے شخصیت کے قلعہ میں در آتی ہے۔ شاہ نصیر ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب دربار کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور خاص طور پر شاعروں کے باب میں۔ شاہ نصیر بھی شاہ عالم ثانی کے متعلقین میں سے تھے مگر یہ دور ایسا تھا کہ ایک دوشالہ کے لیے بھی شاعر کو اپنے فن کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ آزاد نے ان کے ایک قطعہ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک قطعہ بطور حسن طلب جاڑے کے موسم میں انہوں نے کہہ کر دیا تھا اور صلہ حاصل کیا تھا۔ اس کے دو شعر مجھے یاد ہیں۔

بچائے گا تو ہی اے میرے اللہ! ۔۔۔ کہ جاڑے سے پڑا بے ڈھب ہے پالا

پناہ ''آفتاب'' اب مجھ کو بس ہے ۔۔۔ کہ وہ مجھ کو اڑھاوے گا ''دوشالا'' [۲]

''آفتاب'' شاہ عالم ثانی کا تخلص ہے۔

شاہ نصیر اپنے عہد کے واقعات سے متاثر ہوتے تھے اور انہیں شاعری کا موضوع سمجھتے تھے۔

''جب کوئی واقعہ قابلِ یادگار شہرت پاتا تو اس پر بھی شاہ صاحب کچھ نہ کچھ ضرور کہا کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی اسماعیل صاحب نے جب جہاد میں شکست کھائی اور دلّی میں خبر آئی تو انہوں نے اس موقعہ پر ایک طولانی قصیدہ کہا''۔ [۳]

آزاد نے اس قصیدہ کے تین شعر نقل کیے ہیں۔ آزاد کی روایت کے مطابق شاہ اسماعیل شہید کے عقیدت مندوں نے اس قصیدہ کو سن کر شاہ نصیر کا گھر گھیر لیا تھا اور کوتوال دہلی نے بڑی مشکل سے ان کی جان بچائی۔ ویسے یہ اشعار ہمیں آزاد کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکے۔ ہم نے ان اشعار کے لہجہ کی بنا پر انہیں تحریک جہاد اور اُردو شاعری کے باب میں شامل کرنے کی جگہ شاہ نصیر کے تذکرے کے تحت شامل کرنا مناسب جانا۔

کلام اللہ کی صورت ہُوا دل ان کا سی پارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نصِ قرآنی

ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے
اگرچہ تھے دم شملہ سے وہ شیر نیستانی

نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

غالباً مومن خاں نے جس ''شحنۂ'' دہلی کی معزولی کی تاریخ کہی ہے وہ یہی مرزا خانی ہیں۔

---

۲ محمد حسین آزاد' آبِ حیات' صفحہ ۳۹۵' لاہور ۱۹۵۴ء

۳ محمد حسین آزاد' آبِ حیات' صفحہ ۴۰۲۔ ۱۹۰۷ء

شاہ نصیر کی غزلوں میں بھی اس دور کے حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ دلّی میں ان کی قدردانی ان کے حوصلہ کے مطابق نہیں ہوئی۔ وہ دو بار لکھنؤ گئے، پہلی بار مصحفی و انشا کے دورِ عروج میں اور دوسری بار اس وقت جب شیخ امام بخش ناسخ کا سکہ لکھنؤ کے بازار شاعری میں چل رہا تھا۔ اسی طرح وہ کئی بار حیدرآباد گئے۔ صاحب گل رعنا نے چار بار لکھا ہے اور ڈاکٹر زور نے تعداد کی وضاحت کیے بغیر کہا ہے کہ "کئی بار حیدرآباد گئے"۔[۱] اس مسلسل سفر کی وجہ معاشی خوش حالی کی تلاش تھی۔ ایک طرف یہ ذاتی مسائل اور دوسری طرف غلامی کا احساس۔ یہ دونوں عناصر ہمیں شاہ نصیر کی غزل میں ملتے ہیں۔ کون جانے کہ اشعارِ ذیل میں سے ایک میں "ساقی کم ظرف" کی ترکیب شاہ دہلی کے لیے استعمال کی گئی ہو۔

برگشتہ بخت ہم وہ اس دور میں ہیں ساقی
لب تک کبھو ہمارے جام و سبو نہ آیا

کر ذبح اسیران قفس کو کہیں صیاد ‏ پرواز کی طاقت نہیں تا بام کسی کو
انصاف تو کر دل میں تک اے ساقی کم ظرف ‏ خالی کوئی دیتا ہے بھلا جام کسی کو

صیاد قفس کو نہ اٹھا صحنِ چمن سے
باقی ہے ابھی مرغِ گرفتار کی حسرت

شاہ نصیر کی شاعری کے صرف ایک پہلو کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر فنکار اپنی انفرادیت اور مخصوص افتادِ طبع کے باوصف اپنے گرد و پیش کی دنیا سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ تاثر جس درجہ فن کے پیمانے میں ڈھلتا ہے اسی نسبت سے فنکار آنے والے ادوار میں اپنے دور کے ترجمان اور ایک حساس و زندہ شخصیت کی حیثیت سے یاد رکھا جاتا ہے۔ جو اپنے دور کی ترجمانی نہیں کر سکتا اس میں ابدیت کے عناصر بھی نہیں مل

---

[۱] ڈاکٹر محی الدین قادری زور، اردو شاعری کا انتخاب، صفحہ ۹۴، دہلی ۱۹۶۰ء

سکتے۔ یہ بات تضاد نہیں بلکہ ادبی تاریخ کی حقیقت ہے۔ شاہ نصیر "عسل کی مکھی"، "جبل کی مکھی" اور "فلک پہ بجلی زمین پہ باراں" ہی کے شاعر نہیں' بلکہ ان کے کلام کے ایک حصہ میں (خواہ وہ مختصر سہی) ان کے عہد کے خدوخال نظر آتے ہیں' اسی لیے ان کے متعلق انتہائی قطعیت کے ساتھ یہ کہنا درست نہیں کہ "جب کلام کا جائزہ لیجیے تو سوائے خس و خاشاک کے کچھ اور ہاتھ نہیں آتا"۔ ۵

میر نظام الدین ممنون اُردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کے شاعرانہ مقام کے ازسرِ نو تعین کی ضرورت ہے۔ کسی صاحبِ نظر کا یہ خیال درست ہے کہ ہر نسل کو اپنی ادبی تاریخ خود مرتب کرنی چاہیے۔ اردو میں یہ کام تو نہ ہو سکا' لیکن کئی شعراء کے مراتب کا تعین ہمارے دور میں اس طرح کیا گیا کہ وقت کی گرد ان کے کارناموں سے ہٹ گئی۔ یقین' تاباں' مصحفی' نظیر اکبر آبادی اور مومن کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ممنون کی شاعری کا لہجہ اپنے تمام ہم عصروں سے مختلف ہے۔ ان کی آواز غالب اور مومن جیسے شاعروں کی برادری میں بھی اپنی جداگانہ خصوصیات کی بنا پر پہچانی جا سکتی ہے۔ جس طرح اقبال کے تصورِ عشق اور مقامِ آدم کے ابتدائی نقوش میر' آتش اور غالب کے یہاں مل جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا یہ خیال درست ہے کہ ممنون اپنی زمینوں' تراکیب اور آہنگ کی بنا پر فنی طور پر اقبال کے پیش رووں میں سے ہیں۔

ممنون غزل کے مزاج داں ہیں۔ ایمائیت کے قائل' مگر اس طرح کہ پردہ آواز کو اور اُبھار دے۔ انگریزوں کے اقتدار نے جس طرح ہمارے قومی وجود کو ہلا دیا اس کی ساری کہانی شاید ممنون کے اس شعر میں سمٹ آئی ہے۔

---

۵ ڈاکٹر رفیق حسین' اردو غزل کی نشوونما' صفحہ ۲۱۷' الہ آباد ۱۹۵۵ء

آمد سے تری ہم پہ جو ہونی تھی سو ہوئی اب دغدغۂ حشر' نہ پروائے قیامت

''ہونی تھی سو ہوئی'' کے ٹکڑے نے اس شعر کو روایتی عشقیہ شعر بننے سے بچایا ہے۔

ممنون نے صرف غزل کے رموز و علائم کے وسیلہ ہی سے اپنے عہد کے معاملات کو نہیں دیکھا ہے بلکہ ان کی ''شاعرانہ زبان'' Diction پر بھی سیاسی حالات و واقعات کا اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ممنون کی غزلوں میں جو اداس سی کیفیت ہے اور ''دھواں دھواں شام'' کا سا جو منظر ہے اسے بھی ان کے عہد کے حالات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات اس لیے بڑی اہم ہے کہ ان کی شاعری کا لہجہ بلند آہنگ ہے اور ''شور کلامش سرور افزا...... اشعارش...... نہایت انشراح بخش خاطر'' [۶]

شب ہم کو کشت و خون جو رہا فوج غم کے ساتھ
سو حسرتیں شہید ہوئیں اپنے دم کے ساتھ

تھا روز کون سا کہ یہاں غم نہیں رہا پڑھ پڑھ کے دل کا مرثیہ ماتم نہیں رہا

بس ہے یہ لطفِ صبا بہر گرفتارِ قفس راہِ بوئے گل کرے سوراخِ دیوارِ قفس

اکبر شاہ ثانی کے ''فخر الشعرا'' کے یہاں دیوار قفس کے سوراخ کا ذکر تو مل جاتا ہے' بہادر شاہ ظفر کے عہد کے شاعروں پر بُوئے گل کی یہ راہ بھی بند ہو گئی تھی۔

ذوق اپنے عہد میں ملک الشعرا اور خاقانیٔ ہند تھے۔ قلعہ تمدن اور ادب کا معیار ساز تھا' لیکن زندگی کے نظام اور تنقیدی ذوق کی تبدیلی نے اپنا فیصلہ غالب و مومن کے حق میں کیا۔ آج کیفیت یہ ہے کہ شاہ نصیر کی طرح بہت سے نقادوں کو ذوق کی غزلوں میں ''خس و خاشاک'' کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ عہد حاضر میں ایک نئے زاویے سے

۶۔ میر محمد خاں بہادر سرور' عمدۂ منتخبہ صفحہ ۵۔۴۴۴

''ذوق فہمی'' کا آغاز فراق گورکھپوری نے انہیں ''پنچایتی شاعر'' کہہ کر کیا۔ ذوق کے یہاں نہ غالب سی نگاہ ہے جو ہر رنگ میں بہار کا اثبات کرے اور نہ مومن کی سی کوچہ گردی ہے جس کا غبار نہایت بلند عشقیہ شاعری کی فضا بن گیا' لیکن وہ اپنے دور کے عام اخلاقی تصورات اور زندگی کی مروجہ اقدار کے سب سے اہم ترجمان ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے وہ تمثیل نگاری میں شاہ نصیر کے جانشین ہیں۔

ادب اور شاعری میں اخلاقی کُلیات و اصول' اخلاقی زوال کے دور میں زیادہ اہتمام اور تکرار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ صرف ادب و شعر ہی میں نہیں' یہ سوزخوانی اور رِقّت عام تحریر و تقریر کی خصوصیت بن جاتی ہے۔ اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام نے لکھا ہے کہ ''اخلاق جب زندگی میں جاری و ساری ہوتا ہے تو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتا لیکن جب یہ زندگی سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو روزمرہ کی گفتگو' مذہبی مباحثوں اور شعر و شاعری میں صاف طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک اخلاق وہ ہوتا ہے جو عمل سے ٹپکتا ہے۔ دوسرا اخلاق وہ ہوتا ہے جو الفاظ سے ٹپکتا ہے اور اس کی قدر و قیمت الفاظ کے دروبست' پامال محاوروں' ضرب الامثال سے ثابت کی جاتی ہے۔ [ے]

اس خیال کی تکمیل کے لیے یہ کہہ دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ ''دوسرا اخلاق'' جو الفاظ سے ٹپکتا ہے روایتی ہوتا ہے اور اسی لیے محاروں اور ضرب الامثال کے ذریعہ اس کا ایسا شعری اظہار ممکن ہے کہ وہ اشعار خود ضرب المثل بن جائیں۔ ذوق نے اس مروجہ اخلاقی ضابطہ کی مختلف دفعات کو شعر بنا دیا۔ وہ اخلاقی ضابطہ جس میں زبان خَلق کو نقارۂ خدا کا اعتبار اور درجہ عطا کیا گیا تھا' جس میں وضع داری پر جان جاتی تھی' دوستی اور دوست داری اسلوب حیات میں شامل تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ فیض کے اسباب کا رشتہ روح یا ضمیر کے کسی تقاضے سے نہ تھا بلکہ ''نام منظور ہو تو'' اور اسی طرح بدگوئی نہ کرنے کا جواز صرف یہ تھا کہ خود بھی دوسروں کی بدگوئی سے محفوظ رہا جائے۔

ے ڈاکٹر خورشید الاسلام' غالب' صفحہ ۱۲۵' علی گڑھ' ۱۹۶۰ء

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

OOO

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

OOO

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سُنے ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

ذوق کے ایسے اشعار میں انسان اور اس کے اعمال کے بارے میں گہری اور فلسفیانہ فکر نہ سہی لیکن ان عام خیالات کو اُردو میں ان سے بہتر کسی نے نظم نہیں کیا۔ ایک خاص عہد کے اخلاقی تصورات کو یوں پیش کر دینا بھی تاریخی اور ادبی اہمیت کی بات ہے۔

ذوق کے اخلاقی تصور کی سطح جہاں کہیں بلند ہوگئی ہے وہاں انہوں نے میر اور غالب کی طرح زیادہ بنیادی مسائل کو شعر میں ڈھالا ہے۔ خاص طور پر ''مقام آدم'' کے تصور کو جن شاعروں نے اقبال سے پہلے واضح اور نمایاں طور پر پیش کیا ہے ان میں ذوق بھی شامل ہیں۔

جو خانۂ ہستی میں ہے انساں کے لیے ہے آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہے

ذوق اخلاقی تصورات میں اس درجہ گھر گئے تھے کہ وہ اپنے عہد کی ناہمواریوں اور انقلاب زمانہ کی تاویل بھی اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ ان کے یہاں محض واقعات کی عکاسی نہیں بلکہ اس کی اخلاقی تاویل بھی ہے۔

کتنے مفلس ہو گئے، کتنے تونگر ہو گئے خاک میں جب مل گئے، دونوں برابر ہو گئے

اسی نقطۂ نظر نے ذوق کی غزلوں میں اجتماعی اور سیاسی رنگ کو اُبھرنے نہیں دیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے تحقیقی مقالہ ''ذوق...... سوانح اور انتقاد'' میں ذوق کی غزلوں کے منتخب اشعار پیش کر کے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ''کیا ان شعروں میں دم توڑتی ہوئی مغل تہذیب، دہلی کی مٹتی ہوئی شہنشاہیت، بیرونی اقتدار کے بڑھتے ہوئے سائے، دورِ آخر کی انتزاعی کیفیت اور قلعہ سے باہر کی زندگی کے درمیان کش مکش کا کوئی عکس، تاثر یا تصور

موجود نہیں؟''[8] مجموعی طور پر ہمارا جواب نفی میں ہے۔ ذوق'' جانی پہچانی روایتوں اور علامتوں'' کو اپنے عہد کے حالات کا پیمانہ نہیں بنا سکے۔

ایسا پیمانہ جس میں یہ حالات شعر بن کر ڈھل جاتے۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے جو اشعار پیش کیے ہیں' ان میں سے ہمارے نزدیک صرف ایک شعر ایسا ہے جو ان کے دعوے کی تائید کرتا ہے۔

اے شمع! ایک چور ہے بادِ نسیم صبح مارے ہے کوئی دم میں ترے تاج زر پہ ہاتھ

غزل کی علامتوں کی مدد سے ہم گزشتہ ابواب میں سیاسی حالات کا مطالعہ کرتے آئے ہیں' لیکن ذوق کے یہاں یہ علامتیں بہت روایتی انداز میں آئی ہیں۔ ڈاکٹر عادی نے علامتوں کے ساتھ ''روایتوں'' کا استعمال ٹھیک ہی کیا ہے۔ مندرجۂ بالا شعر میں غزل کی علامتوں کی مدد سے جو سیاسی تبصرہ پیش کیا گیا ہے وہ بہت واضح ہے، ''شمع'' لال قلعہ کا مغل شہنشاہ ہے جو کسی نہ کسی طرح اپنی عمرِ طبعی گزار رہا ہے۔

''بادِ نسیم صبح'' میں اس آہستگی کا اظہار ہے جس سے انگریزوں نے برعظیم میں تاج و تخت کی طرف قدم بڑھائے اور پھر تاج زر پر ہاتھ مارنا۔

ذوق کے قصائد ان کی افتادِ طبع کے روایتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ غالب کے قصیدوں اور قطعات مدح سے بھی اس عہد کی ابتری کا اندازہ ہو جاتا ہے' لیکن کیا ذوق کے قصیدوں میں (جو ان کے سرمایۂ کمال کا سب سے نمایاں حصہ ہیں) ''دہلی کی مٹتی ہوئی شہنشاہیت' دورِ آخر کی انتزاعی کیفیت کا کوئی عکس' تاثر یا تصور موجود ہے؟'' اس کا جواب ذوق کے قصیدے خود ہیں۔ وہ بادشاہ جو لال قلعہ میں بھی مجبور تھا اس کے بارے میں ہمیں یہ اشعار ملتے ہیں۔

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع فلک موئید و اختر معین و بخت نصیر

بہادر شاہ جو صورتِ شمع' زوال کی طویل تاریک رات میں پگھل رہے تھے ان کے قہر کی طغیانی اور شمشیر کی برش استاد ذوق یوں پیش کرتے ہیں:

---

[8] ڈاکٹر تنویر احمد علوی' ذوق۔ سوانح اور انتقاد' صفحہ ۸۔۲۰۷' لاہور ۱۹۶۳ء

آ ئے طوفاں جو ترے قہر کا طغیانی پر   کشتیٔ نوح بھی اعدا کو ہو گرداب صفت

وہ تری تیغ کی برش ہے کہ سایہ جس کا   کردے ایک دم میں ہیولیٰ سے مفارق صورت

بہر حال اپنے حدود کے باوجود ذوق کے اخلاقی تصورات‘ قصائد اور غزلوں کے بعض اشعار ان کے عہد کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ذوق دہلی کے وفاداروں میں سے تھے۔ دیوان چندو لال نے انہیں دکن آنے کی دعوت دی مگر ذوق نے اس دعوت اور معاشی خوشحالی پر دلّی کی گلیوں کو ترجیح دی۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن   کون جائے ''ذوق'' پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

مومن خاں مومن کی شاعری پر سید احمد شہید کی تحریک کے ضمن میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہماری رائے میں اگرچہ مومن سے پہلے اُردو کے کئی شاعروں میں سیاسی شعور نظر آتا ہے مگر ایک تحریک سے اپنی وابستگی کی بنا پر مومن اولین قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ مومن کی غزلوں کو اب تک محض ''شاہد بازاری و جمال پرستی'' تک محدود قرار دیا گیا ہے‘ لیکن ''تحریک سید احمد شہید'' کے باب میں مومن کی غزلوں کا مطالعہ ان کی شخصیت اور ذوق جہاد کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس باب میں شاعرانہ عظمت کے تحت ان کی شرکت لازمی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جو تحریک جہاد سے متعلق نہ ہونے کے باوجود ان کے عہد کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے۔

اس عہد کے انتشار سماجی اور سیاسی حالات نے قصیدہ گوئی کو ایک نیا اسلوب دیا۔ یہ اسلوب ذوق کے روایتی اسلوب سے مختلف ہے۔ اس اعتبار سے مومن اور غالب میں ہمیں کئی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ مومن کے ایک قصیدہ کے الفاظ میں ان کے عہد اور ان کی دلّی کو دیکھیے۔

خاک میں رشک آسماں سے ملے ہائے کیسے بلند ایوانی

ایسی وحشت سرا میں آئے کون؟ بے دری کر رہی ہے دربانی

کیا ہوئی وہ بلندیٔ دیوار؟ کیا ہوئے وہ عماد طولانی
جائے گل ہیں چمن میں ریزۂ سنگ کاہ کرتی ہے ناز ریحانی
شورِ زاغ و زغن سے سمع خراش اب کہاں بلبل و غزل خوانی

کلیات مومن میں کوتوال دہلی کی معزولی پر ایک قطعۂ تاریخ ہے۔ معزولی کی تاریخ ۱۲۵۹ھ (م ۱۸۴۳ء) ہے' اس قطعۂ تاریخ سے شہری انتظامیہ کے حال زار کا اندازہ ہوتا ہے۔ حکام ''خلق آزار'' اور رشوت خور تھے۔ جہاں مستقبل پر یقین نہ ہو وہاں لوگ ''عالم دوبارہ نیست'' کا نعرہ دل ہی دل میں لگا کر دولت کے حصول میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

قطعۂ تاریخ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے اس میں تخرجہ سے کام لیا گیا ہے۔

شحنۂ دہلی خلق آزار بچۂ افغان رشوت خوار
خوار ہوا بارے اس سال لوگوں کا تھا یار اقبال
نام بتاؤں کیا اے یار ناموزوں ہوں گے اشعار
ہاں تو پوچھے گر تاریخ اس سے بہتر کیا تاریخ
سب نے کہا جب چھوٹا ''کام'' اترا شحنہ مردک نام

(۱۲۵۹=۱۳۲۰-۶۱)

مومن کو حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے غیر معمولی محبت تھی۔ اس کے اسباب واضح ہیں۔ مومن کی مذہبی شخصیت اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے ان کی دلچسپی۔ اس خاندان کے عظیم نمائندہ' حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات نے مومن کے قلب کو تڑپا دیا اور انہوں نے شاہ صاحب کی وفات پر وہ قطعۂ تاریخ لکھا جو ہماری زبان میں بے مثال ہے اور فنی اعتبار سے فارسی میں بھی اس کی مثال مشکل ہے۔ مومن کی عقیدت اور فنی عظمت نے تخرجہ کو عیب کی صف سے نکال کر ہنر بنا دیا۔ اس قطعہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبد العزیز
بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آ گیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایمان میں خلل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا
لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسئی گردوں محل
دست بیداد اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

''آج غالب دہلی کے اس عہد زریں کی سب سے نمایاں شخصیت کا درجہ رکھتے ہیں''۔

اس بیان میں ان کی شخصیت اور فن کے سبھی گوشے سمٹ آئے ہیں۔ دیوان غالب ''نسخۂ عرشی'' کی اشاعت اب ہمیں غالب کے ذہنی ارتقاء کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ غالب اپنی خیال بندی کے دور میں بھی ''رنج خمار'' کے مارے ہوئے نہیں تھے کہ حقیقت یا زندگی یا محبوبہ ساری عمر آغوش سے آغوش تک نہ پہنچ پاتی۔ وہ تو شروع ہی سے ''تقاضائے دیدن'' اور ''تمنائے چیدن'' سے آشنا تھے اور زندگی کی بہار کو اپنے ذوق گناہ کی دلیل جانتے تھے۔ مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ غالب کے ابتدائی دور میں بھی زندگی سے اتنی دوری نہیں، جیسی سمجھی گئی ہے۔

ان کی ریختہ گوئی کا پہلا دور ۱۸۲۲ء میں ختم ہوا اور اس کے بعد غالب نے اپنے آپ کو بڑی حد تک پہچان لیا تھا۔ اس دریافت کو ان کے اسلوب، لہجہ اور فکر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن غالب کے پہلے دور میں بھی، جسے لوگوں نے ''وادیٔ بے راہ'' کہا ہے، ہمیں ان کی راہ دانی کا اعتراف کرنا ہوگا۔ نوعمری میں ان کے یہاں ہزار آفتوں اور

وبالِ ہزار آرزو کا مطالعہ اجتماعی حالات کے پس منظر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

ہزار آفتَ و یک جانِ بے نوائے اسد　　　خدا کے واسطے اے شاہ بیکساں! فریاد

○○○

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا　　　یا رب! میں کس غریب کا بخت رمیدہ ہوں

○○○

اسد طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے　　　خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

اور بعد میں تو ان اشاروں کے پردوں کو الٹ کر غالب نے اپنی دلّی کی بے سروسامانی کو یوں پیش کر دیا ہے۔

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر　　　کیوں نہ دلّی میں ہر اِک ناچیز نوابی کرے

غالب کے قطعات ''مدح میں ذم'' کی بہترین مثال ہیں۔ کبھی مغل شہنشاہ نہیں بلکہ اس کے وزیر اور امیر شاعروں کے منہ موتیوں سے بھر دیتے تھے اور غالب کے دور میں شۂ جم جاہ تحفہ میں دال بھیجتے یا بیسنی روٹی۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضور والا نے　　　مجھے جو بھیجی ہے، بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر　　　جو کھاتے حضرتِ آدمؑ یہ بیسنی روٹی

○○○

بھیجی ہے جو مجھ کو شۂ جم جاہ نے دال　　　ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال　　　ہے دولت و دین و دانش و داد پہ دال

غالب کا ایک مشہور قطعہ کس شان سے شروع ہوا ہے۔

اے شہنشاہ آسماں اورنگ　　　اے جہاندارِ آفتاب آثار

لیکن تمہید کس لیے باندھی گئی ہے؟ جاڑوں کی جڑ اول اور ماہ بماہ تنخواہ کے لیے۔

اس قطعہ کے باقی اشعار اس تمہید کا منہ چڑھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر　　　تانہ دے، باد زمہریر، آزار
کچھ خریدا نہیں ہے، اب کے سال　　　کچھ بنایا نہیں ہے، اب کی بار

میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے، مُردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اس چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ان قطعات کے علاوہ غزلوں میں بھی غالب نے ایسے مسائل اور اپنی ضروریات کا ذکر کیا ہے اور حسنِ ادا کے ساتھ بہادر شاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

اسی غزل میں غالب نے محبوب کے التفات کے حصول کے لیے بھی حسنِ ادا اور نُدرتِ اسلوب سے کام لیا ہے۔

بہرا ہوں چاہیے مجھے دونا ہو التفات سُنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

حرف التفات کی تکرار شاید غالب کو بڑھاپے میں بھی حاصل ہو گئی ہو مگر شاہ پر ان کا حال کہہ کر بھی ظاہر نہ ہوا۔

ان شخصی مسائل سے قطع نظر ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی اگر ایک طرف غالب کی غزلوں میں آزادی کی تمنا اور ہوائے سر رہ گزر پر جان دینے کا عزم نظر آتا ہے تو دوسری طرف انہیں گلشن کے ''بندوبست برنگِ دگر'' کا پوری طرح احساس ہے۔ کبھی وہ منزل آتی ہے کہ ''نہ عبرت ہے نہ ذوق'' اور ''نہ دنیا ہے نہ دین''۔ یہ بے حسی حالات کو تبدیل نہ کر سکنے کے احساس کا نتیجہ ہے۔ شاید ذیل کے اشعار کو کسی قسم کے تعارف یا تفصیل کی ضرورت نہیں۔

گلیوں میں مری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہ گزار تھا

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

○○○

بیضہ آسا، تنگ بال و پر پہ ہے کنجِ قفس　　از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

○○○

خزاں کیا ؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

○○○

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا　　وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

○○○

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟　　اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

○○○

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال　　حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

۱۸۵۷ء کا اثر غالب کے ذہن نے جس طرح قبول کیا اسے متعلقہ باب میں اختصار سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اس واقعہ سے متعلق ان کا ایک قطعہ اور ایک شعر اس باب میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس　　یوں کہا "آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب؟
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے　　"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب"

○○○

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے　　کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

آخری شعر غالب کے ایک خط بنام مجروح میں ہے۔ اس کی وضاحت غالب کی اس عبارت سے ہو سکے گی کہ "میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ [۹]

بہادر شاہ کے جو چار دیوان موجود ہیں وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہیں، لیکن ان میں کتنے ہی ایسے شعر ہیں جو ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات پر تبصرہ معلوم ہوتے ہیں۔

---

۹ مکتوب غالب بنام میر مہدی مجروح مؤرخہ ۲ فروری ۱۸۵۹ء

یہ مسئلہ خاصا پریشان کن ہے اور اس گرہ کو ظفر کے حالات ہی کھولتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ انہیں رواج اور روایت کے مطابق ولی عہد بننا چاہیے تھا مگر اکبر شاہ کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ممتاز محل کے بطن سے اپنے دوسرے بیٹے جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ جب کمپنی نے اعتراض کیا تو انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ "سراج الدین میرا بیٹا ہی نہیں ہے"۔ یہ زخم ظفر جیسے حساس آدمی کے لیے بہت گہرا تھا۔ مرزا جہانگیر ۱۸۲۱ء میں مر گئے اور کمپنی کے دباؤ کے تحت، اکبر ثانی کو اپنے بیٹے سراج الدین کو ولی عہد تسلیم کرنا پڑا۔ مالک رام کا خیال ہے کہ ظفر کا یہ شعر اسی واقعہ سے متعلق ہے۔

کیسی تدبیر ظفر، جب وہ کرے اپنا کرم
کام بگڑے ہوئے بن جائیں یوں ہی آپ سے آپ [۱]

ظفر کی شاہزادگی کے دور کی بے بسی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تخت نشینی سے پہلے وہ اپنا کوئی دیوان بھی شائع نہ کرا سکے۔ پھر باسٹھ سال کی عمر میں وہ تخت نشین ہوئے۔ موروثی بادشاہت میں، باپ کی طویل عمر، بیٹے پر کیسی کیسی گراں گزرتی ہوگی، اس کا اندازہ شاید زیادہ مشکل نہیں۔

ظفر کی زندگی میں تخت نشینی سے پہلے یہ اضطراب تھا۔ باپ کا یہ اعلان انہیں ناگ کی طرح ڈستا ہوگا کہ "یہ میرا بیٹا نہیں ہے" پھر وہ تخت پر بیٹھے تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ قید فرنگ، قید حیات سے کچھ کم نہیں۔ ظفر، اکبر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے جانشین تھے۔ اپنی مجبوری اور بے بال و پری کا احساس اور یہ تضاد انہیں ذہنی طور پر تڑپا دیتا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں کشمکش کا عنصر مجبوری، بے بال و پری اور بے بسی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ ملتا ہے۔ غالباً ان کی زندگی کے اس مطالعہ کے بعد ان دونوں پہلوؤں میں کوئی تضاد نہیں رہ جاتا۔ ایک طرف تو سلطنت دہلی کے حکمران کی ذہنی اور حقیقی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ

---

[۱] مالک رام، تلامذۂ غالب، صفحہ ۲۰۷ تا ۲۰۹

اسیر کنج قفس ہوں میں اے نوا سنجو! بلا سے میری گر آیا بہار کا موسم

○○○

جو پھڑک بھی نہ سکے طاقتِ پرواز کہاں دیے صیاد نے اس صید کے پر کھینچ کے باندھ

○○○

جہاں چمن میں نشیمن تھے بلبلوں کے ظفر ہزار حیف کہ واں آشیانِ زاغ بنے

تخت نشینی کے بعد انگریزوں سے ان کے تعلقات کی جو نوعیت رہی اور وہ جس کش مکش سے گزرے' اسے تاریخی پس منظر کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ کمپنی کی سخت گیری' وعدہ خلافی اور اپنی شرائط پر زور دینے سے ظفر کے قلب افسردہ میں بھی ''بغاوت'' کے شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ اشعار ایسے ہی لمحات کی پیداوار ہیں ؂

بہار آئی' اسیران قفس آپس میں کہتے ہیں
پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

○○○

گر اسیروں کو یونہی صیاد تو پھڑکائے گا تو نکل بھاگیں گے وہ اک دن قفس کو توڑ کر

○○○

ظفر کی شاعری کو اسی پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے ظفر کی غزل میں قفس' آشیاں' صیاد وعندلیب کی علامتی حیثیت کو ادبی روایت کے ساتھ ساتھ ایک نئی اور زندہ حقیقت بنا دیا۔ اسی طرح کارواں' شکستہ پائی' بے پال و پری اور بہار کے اشاروں کو ظفر نے اپنے سوانح کے ابواب کا درجہ دے دیا۔ غزل کی ایمائیت کے سیاسی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے آج جن شاعروں کا نام سب سے پہلے ہمارے ذہن میں آتا ہے' بہادر شاہ ظفر کو ان میں بھی امتیازی درجہ حاصل ہے۔

اس عہد کے دوسرے شاعروں کے ذکر سے پہلے شاہی خاندان کے شاعروں کا ذکر مناسب ہو گا۔ شاہ عالم ثانی آفتاؔب سے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں تک خاندان مغلیہ کے شاہوں اور شہزادوں کی شاعری کا سلسلہ ایک ایسی زنجیر ہے جس کا کوئی حلقہ ٹوٹا ہوا نہیں۔

مرزا محمد دارا بخت دارا' بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد اول تھے۔ شہزادے کی شاعری میں اگرچہ "لغزش مستانہ" کا بھی ذکر ہے' مگر دِلی میں اپنی کم بضاعتی کا یہ احساس زیادہ شدید ہے کہ

کوئی کوڑی کو بھی گاہک نہیں ہوتا اس کا　　بیچنے کے لیے جاتے ہیں جو بازار میں دل

مرزا فتح الملک بہادر غلام فخر الدین "رمز" (عرف مرزا فخرو) بہادر شاہ ظفر کے چوتھے بیٹے تھے۔ ان کے ساتھ بہادر شاہ ظفر نے جو سلوک کیا' وہ شاہ ظفر کے ساتھ ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے برتاؤ کی یاد دلاتا ہے۔ بہادر شاہ نے زینت محل کے کہنے سے مرزا جوان بخت کی ولی عہدی کے لیے انگریزوں کو درخواست دی تھی' جو مسترد کر دی گئی اور مرزا فخرو اس شرط پر ولی عہد بنائے گئے کہ برائے نام بادشاہ ہوں گے اور قلعہ معلی سے اٹھ کر مہرولی جا رہیں گے۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں انتقال ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انہیں زینت محل نے زہر دلوا دیا[۱] یہ روایت محض "خیال" تک محدود ہے۔ ویسے مرزا فخرو کی شاعری میں بھی وہی بے چینی اور کشمکش ہے جو خود ظفر کے زمانۂ ولی عہدی کی شاعری میں ملتی ہے اور اسباب بھی یکساں ہیں۔ ایک طرف تو ولی عہدی وہ مشکل ہے جو آسان نہیں ہوتی اور دوسری طرف اپنے والد انہیں "زینتِ مجمعِ اغیار" نظر آتے ہیں۔

سب کچھ آساں ہے تجھے گردش دوراں کرنا　　ایک مشکل' مری مشکل کا ہے آساں کرنا

○○○

تم رہو اور مجمعِ اغیار میرا کیا ہے' ہوا ہوا' نہ ہوا

مرزا خضر سلطان' بہادر شاہ ظفر کے وہ بیٹے ہیں جن کا نام مرزا غالب کی بدولت پڑھنے والوں کی زبان تک آ ہی جاتا ہے۔

خضر سلطان کو ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو مرزا مغل اور مرزا ابوبکر کے ساتھ خونی دروازے کے باہر گولی ماری گئی اور یوں ان کی وہ حسرت پوری ہو گئی جس کا شکوہ انہوں نے شاعری میں کیا تھا۔

---

[۱] مالک رام' تلامذۂ غالب' صفحہ ۱۳۰

کہتے ہوئے اِک روز تجھے قتل کریں گے　　پر یہ بھی تو اے شوخ ستم گر نہیں ہوتا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اس عہد کے اکابر ادب میں سے ہیں۔ ان کا دیوان ان کے مرتبۂ شعر کا گواہ ہے اور تذکرہ گلشن بے خار شعر فہمی کی سند۔ ویسے شیفتہ کی شعر فہمی کو عہد حاضر کے ایک نقاد نے نزاعی مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے اور خاصی محنت سے' لیکن ہمارے نزدیک حالی کی چند سطریں اس مضمون پر بھاوی ہیں۔ مقدمۂ شعر و شاعری کو جدید اردو تنقید کا ''صحیفہ اول'' قرار دیا گیا ہے اور اس صحیفہ کے مصنف نے نیا نقطۂ نظر شیفتہ کی صحبت سے حاصل کیا تھا۔ حالی نے ۱۹۰۱ء میں نواب عماد الملک کی فرمائش پر اپنے مختصر حالات لکھے تھے' اس میں شیفتہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ

نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو کے شاعر تھے اس کی نسبت سے ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور ارفع تر واقع ہوا تھا...... وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا' اس کو منتہائے شاعری سمجھتے تھے...... ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔[۱۲]

شیفتہ مومن کے شاگرد تھے' ویسے غالب سے بھی مشورہ کیا' لیکن گلشن بے خار میں مومن کے متعلق لکھا ہے کہ میرے مینائے سخن کی شراب انہیں کی عطا کردہ ہے۔ مذہبی افتادِ طبع رکھنے کی وجہ سے مومن کے ذوق جہاد میں بھی شریک تھے۔ شیفتہ شہید فرنگ' ''صہبائی'' کے نوحہ گر' زخم خوردۂ فرنگ ''آزردہ'' کے غمگسار اور خود انگریزوں کے معتوب تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سزا ہوئی' جاگیر ضبط کی گئی' بعد میں آدھی واگزاشت ہوئی۔ شیفتہ کی غزلوں کا سیاسی پہلو بہت نمایاں ہے۔ سید احمد شہید' ان کے رفقاء اور

۱۲ـ　بحوالہ مولانا حامد حسن قادری' داستانِ تاریخ اُردو' صفحہ ۵۷۰ـ۵۷۱' آگرہ' ۱۹۴۱ء

دوسرے مجاہدین آزادی نے جس طرح جان دے کہ پنجۂ صیاد سے نجات حاصل کی، غالباً اُسی کا شاعرانہ اظہار شیفتہ نے یوں کیا ہے۔

رشک آزادی پہ ہے ایسے اسیروں کی مجھے — چھٹ گئے جو جان دے کر پنجۂ صیاد سے

مومن کے ذہنی اثرات کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ شیفتہ نے محض حالات کی ابتری کے نوحے نہیں پیش کیے ہیں، بلکہ دعوتِ عمل بھی دی ہے۔ ان کے سوانح سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر صاحب ضبط وصبر تھے۔ جاگیر کی ضبطی پر منہ سے حرف شکایت نہ نکالا، سرطان کے مسلسل آ پریشنوں پر اُف نہ کی۔ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے۔ حالات کی تعبیر میں رجائیت سے کام لیتے تھے اور اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ قافلے نالہ وفریاد سے نہیں عمل سے منزل آزادی تک پہنچتے ہیں۔

بے تکلف جی میں جو آئے کرو — کیا دھرا ہے نالہ و فریاد میں

ہوئی بے تابیٔ بلبل مؤثر — کہ گھبرایا ہوا کچھ باغباں ہے

اس دعوتِ عمل کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کو بھی پیش کیا ہے۔ وہ دور جس میں دانش و دین کے چرچے پر غوغائے غلامی چھا چکا تھا۔ ہر قدم پر شہیدانِ آزادی کے مزار تھے اور کوئی دل بے زخم نہ تھا۔

نہ اس زمانے میں چرچا ہے دانش و دیں کا — نہ شوق شعرِ تر و بذلہ ہائے رنگیں کا

○○○

یاں فغاں سے لہو ٹپکتا ہے — میں نواسنجِ شاخسار نہیں

○○○

دور میں اس کی چشم مژگاں کے — کس جگہ تربتِ شہید نہیں

○○○

کس نے تاراج کیا ملکِ دل و دیں کہیے — آج تم شیفتہ کچھ بے سرو ساماں سے ہو

"ملک دل و دیں" کی ترکیب کو ذہن میں رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ شیفتہ کی بے سرو سامانی کا تذکرہ نہیں، بلکہ مسلمانوں کی کیفیت کا

تاریخی بیان ہے۔ ویسے شیفتہ کی ذاتی زندگی بھی ان کی شاعری میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

گاؤں بھی ہم کو غنیمت ہے کہ آبادی تو ہے　　آئے ہیں ہم سخت پُر آشوب صحرا دیکھ کر

OOO

شیفتہ ہم سے ہو جس شخص کو ملنا، مل لے　　صبح اس شہر سے ہم عزم سفر رکھتے ہیں

اس عہد کے شاعروں میں منشی گھنشیام لال عاصی کو زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں فنی اعتبار سے کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن ان کے کلام میں تاریخی واقعات و حالات کو قطعات اور نظموں کی صورت میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

عاصی غالباً ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۵ء میں انتقال کیا۔ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے مرزا بابر شاہ کے ملازم اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔[۱۳] شاہی ملازمین و متوسلین کا عالم یہ تھا کہ سردیوں کے لیے لباس موزوں بھی نہ رکھتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر عاصی نے اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں ایک قطعہ پیش کیا اور دوشالہ حاصل کیا۔ قطعہ کا دوسرا شعر یہ ہے۔

کر کرم مجھ پر ذرا مہرِ سپہرِ تیمور　　ورنہ سردی کی ہوا نے مرے دل کو لپکا

عاصی کے قصائد میں بھی حقیقت پسندی بہت نمایاں ہے۔ ایک قصیدہ کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ غالباً یہ قصیدہ مرزا بابر شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

آج ہے وہ روز عشرت، آج ہے دن عید کا　　ہوتے ہیں اکثر بغل گیر آشنا سے آشنا

ہاں چنانچہ ایک میرے بھی شفیق و مہرباں　　یار جانی، دوست صادق اور محبّ باصفا

آئے میرے گھر وہ اور احوال میرا دیکھ کر　　دیر تک حیراں رہے اور بعد حسرت یہ کہا

"تو بھی عاصی اب تلک وہ ہی پریشاں حال ہے　　وہ ہی اک کہنہ دوشالہ وہ ہی اک کہنہ قبا

وہ ہی اک یابو کہ ایڑوں سے نہیں چلتا قدم　　ہر قدم پر ہے مٹا جاتا برنگِ نقشِ پا"

OOO

۱۳　من موہن لال ماتھر۔ دیباچۂ کلام عاصی دہلی ۱۹۳۹ء

جس طرح انشا نے ''جارج سوم'' کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تھا' اسی طرح عاصی کے یہاں ہمیں بارنس صاحب کی مدح میں قصیدہ نظر آتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احساس و شعور رکھنے والے نام نہاد حکومت کی حقیقت سے باخبر اور انگریزوں کے اقتدارِ اعلیٰ کے معترف تھے۔

بحرِ امواج کرم' صاحب بہادر بارنس فی الحقیقت صورت انساں میں ہیں عیسیٰ نفس

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی پر عاصی نے ''معنی خیز کبت'' لکھا ہے۔

واہ جی واہ! بہادر شاہ جن کے تانامل وزیر
کمر ٹوٹو بخشی ہے اور نلی ٹوٹو نائب ہے

تانامل' میرزا لعل بیگ کی طرف اشارہ ہے۔ کمر ٹوٹو بخشی سے مراد بخشی مرزا محمود خاں ہیں جو کبڑے تھے اور نلی ٹوٹو مرزا شاہ رخ کو کہا ہے جو لنگڑے تھے۔

عاصی کے کلام میں کتنی ہی اور چیزیں اس عہد کے واقعات سے متعلق ہیں مثلاً بہادر شاہ ظفر کے دربار سے راجہ دیبی سنگھ و راجہ سالک رام کی موقوفی کی تاریخ۔ تاریخ یہ ہے۔

کہا ہاتفی نے زروئے قسم
قلعہ سے بدر ہو گئے راہ' کیت
(۱۲۵۸ھ)

''راہو کیتو دو منحوس ستارے ہیں جن کے اثرات سے ہندوؤں کے عقیدہ اور علم کے مطابق سورج اور چاند کو گرہن لگتا ہے''۔ یہاں راہ کیت سے مراد دنوں بھائی ہیں' جنہیں منحوس قرار دیا ہے۔

عاصی کے کلام سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ''شاہ پرستی'' کا بت ٹوٹنے لگا تھا۔ یہ سلسلہ ہمارے شعر و سخن کی تاریخ میں تو جعفر زٹلی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ عاصی نے زینت محل کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کے نکاح کا جو قطعۂ تاریخ لکھا ہے وہ خاصا مبتذل ہے۔ عاصی نے دولہا دلہن کی عمروں کے تفاوت کا ذکر ابتذال سے کیا ہے۔ اس قطعہ کا

آغاز خاصا ''معتدل'' ہے۔

بے فصلِ گل مزا دے ہرگز نہ سیرِ گلشن برسائے لاکھ گوہر بے وقت ابرِ بہمن

اور اسی تمہیدی شعر سے آنے والے اشعار کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں ظہیر دہلوی کی شاعری اور ان کی ''داستان غدر'' کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ ظہیر، ذوق کے شاگرد تھے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جن شاعروں کا اس عہد میں قومی جذبۂ احساس اور آرزوں سے علاقہ رہا ہے وہ کسی نہ کسی رشتہ سے مومن خاں مومن سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ خود ایک مستقل مطالعہ کا موضوع ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مومن نے حقائق و واقعات کو شاعری کی اساس بنایا اور اسی لیے شیفتہ نے اپنی مینائے غزل کے جرعات کو عطیۂ مومن کہا ہے۔ یہی احساسِ حقیقت ایک طرف شیفتہ کے واسطے سے حالی کو ملا اور دوسری طرف اسی سے ظہیر کی غزل کو رنگِ نو ملا۔

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

۱۸۵۷ء کے بعد دلّی کی یاد سے متعلق ان کے اشعار کا انتخاب، متعلقہ باب میں پیش کیا گیا ہے۔ ظہیر کی شاعری کا ایک حصہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں زیادہ احتیاط کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان اشعار کا پس منظر ۱۸۵۷ء سے پہلے کے واقعات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظہیر کو غالباً ہنگامہ آزادی سے پہلے کا دور بھی گرفتاری کا دور معلوم ہوتا ہے۔

دل شکستہ ہیں، قفس توڑ کے جائیں کیا خاک بجلیاں ٹوٹ پڑیں تازہ گرفتاروں پر

محمد علی تشنہ بھی ذوق کے شاگرد تھے۔ آزادہ رو اور مزاج کے اعتبار سے اس عہد کی شورشوں کا مظہر تھے۔ اپنی آزادہ روی کے باوجود وہ اپنے عہد کے عام احساس حسرت و یاس سے نہ بچ سکے۔ یہ احساس جو انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی تھا۔ اس

اجتماعی عنصر کے بغیر ادب دُوسروں کے لیے قابل قبول کیسے ہو سکتا ہے۔

کبھی یہ دل تماشاہ گاہ صد عیش و مسرت تھا   اب اس میں حسرت ویاس وتمنا سیر کرتے ہیں

نسیم دہلوی مومن کے نامور شاگرد ہیں اور انہیں کی توسط سے مومن کا شاعرانہ رنگ و آہنگ ہمارے عہد تک حسرت کی غزل میں منتقل ہوا۔ نسیم ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰۔ ۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۴ھ (م ۲۹۔ ۱۸۲۸ء) میں وہ لکھنؤ پہنچے۔ تیس سال کی عمر میں وہ اپنے شاعرانہ کمال کی بنا پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ایسی شہرت کہ لکھنؤ میں ان کے پہنچنے سے "غلغلۂ شیوہ بیانی" بلند ہوا۔

"شیخ امیر اللہ تسلیم ارباب سخن کی خدمت میں التماس آرا ہے کہ...... ۱۲۴۴ھ میں شاعر نامور...... ہم پایہ قدسی و کلیم جناب مرزا محمد اصغر علی خاں نسیم ابن نواب آقا علی خاں قاچار شاگرد جناب حکیم محمد مومن خاں۔ خطۂ پاک دہلی سے لکھنؤ میں تشریف فرما ہوئے۔ غلغلۂ شیوا بیانی' آوازۂ نکتہ دانی بلند ہوا۔[۱۴]

نسیم نے لکھنؤ میں تقریباً ۳۸ سال قیام کے بعد ۱۴ رمضان المبارک ۱۲۸۲ھ (م ۳۱/ جنوری ۱۸۶۶ء) کو انتقال کیا۔ ان کا دیوان دفتر شگرف ۱۲۸۵ھ (م ۶۹۔ ۱۸۶۸ء) میں شائع ہوا۔ ویسے اندرونی سروق پر ۱۲۸۴ھ کی تاریخ بھی درج ہے۔ نسیم کی شاعری کی تقسیم زمانی اعتبار سے یقینی طور پر نہیں کی جا سکتی' لیکن جیسا کہ تسلیم کی شہادت کی بنا پر عرض کیا گیا' وہ لکھنؤ آنے سے پہلے شاعرانہ شہرت حاصل کر چکے تھے۔ مومن سے ان کی قربت اگر ایک طرف ان کے رنگ سخن میں ابھری ہے تو دوسری طرف انداز فکر میں بھی' اور انہیں دونوں کا مجموعہ ان کی شاعری ہے۔ اس نکتہ کو ذہن میں رکھ کر ہم نے نسیم کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور اس داخلی شہادت کی بنا پر ہم ذیل کے اشعار کو ان کے عہد دہلی سے متعلق سمجھتے ہیں۔ ویسے اس باب میں کوئی کلام نہیں کہ یہ شاعری ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ہے۔ نسیم کا انتقال ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ اپنی زندگی کے آخری دس بارہ سالوں میں

[۱۴] امیر اللہ تسلیم' دفتر شگرف (دیباچہ) صفحہ ۲ اور ۳' لکھنؤ ۱۲۸۵ھ

انہوں نے حسرت موہانی کی شہادت کے مطابق مشکل سے چند غزلیں لکھی تھیں اور ان غزلوں کا انداز بہت مختلف ہے۔ وجہ یہ تھی کہ نسیم نے لکھنوی اندازِ سخن کو ردیفوں اور زمینوں کی حد تک اپنا لیا تھا تاکہ اربابِ لکھنؤ ان کی استادی کے سامنے سر جھکا دیں۔ نسیم نے اپنے آپ کو بڑے التزام کے ساتھ "نسیم دہلوی" کہا ہے۔ ان کے شاگرد تسلیم نے بھی لکھنؤ میں یہ دعویٰ بلند آہنگی کے ساتھ کیا کہ

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

لیکن انسان اپنے ماحول سے اثرات قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میر اور سودا جیسے شاعروں کے دورِ آخر کے کلام پر قیامِ لکھنؤ کی مہر ثبت ہے۔ میر امن کی نثر میں بھی "پورب" کے لفظ ملتے ہیں۔ نسیم بھی لکھنؤ کے اثرات سے بالکل بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔

ان معروضات کے بعد نسیم دہلوی کے چند ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو ان کے عہد کے سیاسی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔

تنہا نہیں گوشۂ قفس بھی جھگڑا ہے ساتھ بال و پر کا

مژدۂ چاکِ قفس کیا ہے اسیروں کے لیے آنکھ کھولے ہوئے بیٹھے ہیں نگہبانِ قفس

○○○

دید کے قابل ہے اس کی نا اُمیدی اے نسیم! ہائے وہ طائر جو زیرِ دامِ صیاد آ گیا

○○○

فصلِ گل میں کر دیا بے بال و پر صیاد نے اے دلِ مایوس! اب شوقِ رہائی ہے عبث

○○○

چمن ویراں ہوا' مرجھا چکے گل چلو پوچھیں' مزاجِ باغباں آج

○○○

تری شمشیر نے پیدا کیا خم سجدہ کرنے کو لہو چاٹا جو اے کافر مسلمانوں کی گردن کا

ان چند اشعار کا تجزیہ ہمیں نسیم کے سیاسی شعور کا یقین دلا دیتا ہے۔ گوشۂ قفس کے

ساتھ ''بال و پر'' کے مسئلہ کا احساس اور پھر وہ حقیقت پسندی جو چاک قفس سے دھوکہ نہیں کھاتی۔ دوسرے شعر میں انگریزوں کے مزاج اور نگہبانی کی مکمل تصویر ہے۔ اسی طرح آخری شعر میں ملّی درد ہے۔

میر مہدی مجروح ۱۸۵۷ء میں چوبیس سال کے تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ سالک دہلوی بھی ان کے ہم عصر ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے متعلق ان کا ذکر متعلقہ باب میں کیا گیا ہے۔ مجروح اور سالک کے ہاں دہلی کے بلاواسطہ اور راست ذکر کے ساتھ ساتھ غزل کے اشاروں میں اس دور پر تبصرہ ملتا ہے۔ میر مہدی مجروح کی ایک غزل کے چند اشعار اور سالک کے دو شعر نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ ان اشعار سے یہ بات اور واضح ہو سکے گی کہ اس دور کے شعراء کی غزل میں ''اسیر''، ''بال و پر''، ''صیاد'' ''پرواز''، ''مرغانِ قفس'' اور ایسے ہی دوسرے اشارے سیاسی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان کی بار بار تکرار اتفاقی نہیں، انہیں سیاسی حالات نے ان اشاروں کی معنویت کو اردو غزل میں، فارسی غزل سے مختلف بنا دیا ہے۔ اس نکتہ پر مقالہ کے آخری باب میں گفتگو کی گئی ہے۔

میر مہدی مجروح

اسیر رہنے کی ضامن شکستہ بالی ہے — مری طرف سے عبث ہے تو بدگماں صیاد
چمن کے زمزمہ سنجوں کو کیا قفس سے کام — مگر ہماری ہوئی گردشِ زماں، صیاد
خیال دل سے اڑائیں نہ کیوں رہائی کا — شکستہ بال، قفس بند، پاسباں صیاد

سالک دہلوی

آسماں ٹوٹ پڑا ہے قفس ہے صیاد — جائے اب نالۂ مرغانِ گرفتار کہاں؟

○○○

صیاد اور بندِ قفس سے کرے رہا — جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

اس باب کے آخر میں ''ہُد ہُد'' کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔ ناہموار حالات اگر

ایک طرف زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں تو دوسری طرف ادب کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ریختی اس کی بہت نمایاں مثال ہے۔ اسی طرح زٹل اور ہزل کو بھی اسی زمرہ میں شمار کرنا چاہیے۔ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری اس سے بلند تر سطح کی چیز ہے۔ اس سلسلہ میں سودا اور اکبرالٰہ آبادی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ہُد ہُد ۱۸۵۷ء سے پہلے کی زندگی کے کھوکھلے پن کا مظہر ہے۔ ''ایک صاحب عبدالرحمٰن نام پورب کی طرف سے دہلی آئے اور حکیم صاحب (حکیم آغا جان عیش) کے پاس ایک مکان میں مکتب تھا اُس میں لڑکے پڑھانے لگے۔'' انہیں حکیم صاحب نے شاعر بنوا دیا اور حلیہ کی نسبت سے ''ہُد ہُد'' تخلص رکھ دیا۔ بہادر شاہ ظفر نے انہیں ''طائر الاراکین' شہپر الملک' ہدہد الشعرا' منقار جنگ بہادر'' جیسے خطابات دیے۔ اس سے خطابات کی بے وقعتی کا اندازہ کیجیے۔

ایک بار برسات میں ''ہدہد'' کا مکان گر گیا۔ شاہ ظفر کی خدمت میں انہوں نے یوں عرض مدعا کیا ؎

دے دے اس کو بھی زمیں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے
مارتا پھرتا ترا ہدہد ہے ٹامک ٹوئیے[۱۵]

''بے گھر گھونسلے'' ہونے کے اس عالم کا رشتہ بہر حال اس عہد کی اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ بے بسی کا یہ احساس ہُد ہُد سے لے کر اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر سب کی زندگی پر چھایا ہوا تھا۔

---

۱۵ محمد حسین آزاد۔ آب حیات' صفحہ ۴۷۰ تا ۴۷۵' طبع شانزدہم

سلسلۂ ناسخ، آتش، مصحفی و جرأت

دبستان لکھنؤ ۱۸۵۶ء تک

دبستان لکھنؤ کے اس عہد کے کئی نامور شاعروں کا ذکر ''انتزاع سلطنت اودھ اور اردو شاعری'' کے تحت کیا گیا ہے، جس میں واجد علی شاہ کے لکھنؤ کی ادبی اور معاشرتی فضا اور ماحول کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ اس باب میں ان شاعروں اور ان کے دوسرے ہم عصروں کے اس کلام کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جائے گا جو ۱۸۵۶ء سے پہلے کا ہے اور جس میں لکھنؤ کی زندہ دلی، عیش و عشرت اور معاشرتی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ پیا جان عالم کا ذکر کسی داستان کے مرکزی کردار کی طرح کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کے اس عہد کی شاعری بڑی حد تک انگیا، کنگھی، چوٹی تک محدود ہے لیکن کہیں کہیں سیاسی موضوعات اس جنسی تاریکی میں بجلی کی طرح چمک اٹھتے ہیں [۱]۔

فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں برقؔ، ناسخؔ کے ممتاز شاگرد تھے۔ ان کے خطابات ہی سے شاہِ اختر سے ان کے تعلقات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ برقؔ اپنے سلطان عالم کے ساتھ مٹیا برج بھی گئے تھے۔ ۱۸۵۶ء سے پہلے کے کلام میں لکھنؤ کی بہاروں کا ذکر ہے۔ جوانانِ لکھنؤ جان لکھنؤ تھے۔ ان کو سیاست کی زیریں لہروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ واجد علی شاہ پریوں کا اکھاڑا سجائے ہوئے تھے۔ ان کی مثنویاں شاہی اسٹیج پر ناٹکوں کی صورت میں پیش کی جاتیں۔

گہر افشاں ہے نیستانِ کرم سلطانِ عالم کا بہار آئی جوانانِ چمن کی لکھنؤ چمکا

---

[۱] اس باب میں جان صاحب اور ریختی گو شعرا کا تذکرہ اور اسی طرح کمتر درجہ کے شعراء کا حال و کلام بھی شامل نہیں کیا گیا۔

سلطان عالم اپنے مصاحبوں' شاعروں اور دوسرے فنون کے ماہروں کے قدردان تھے۔ اگرچہ ان کا خزانہ بھرا ہوا نہیں تھا مگر جو کچھ تھا اس کا بڑا حصہ ''ارباب نشاط'' کے بعد ''ارباب سخن'' ہی پر صرف ہوتا تھا۔ سلطان عالم کی انہیں خوبیوں نے انہیں اپنے عہد کے شاعروں کی غزلوں کی ردیف بنا دیا۔ برق کی ایک ایسی ہی غزل کے دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

زبان موج سے بادِ بہاری کہتی پھرتی ہے — کہ قیصر باغ کے سروِ رواں' سلطان عالم ہیں
بنا ہے لکھنؤ کنعان ورشکِ مصر کوچے ہیں — عزیز و یوسفِ ہندوستاں' سلطان عالم ہیں

علی اوسط رشک ناسخ کے شاگردوں میں اپنے استاد کے لسانی قوانین کے سب سے بڑے شارح اور ترجمان ہیں۔ ان کی شاعری زبان کے شکنجوں میں بُری طرح اسیر ہے۔ اس کی قیمت انہوں نے جذبہ کی قربانی کی شکل میں ادا کی ہے' لیکن غریب الوطنی نے ان کے وجود میں سوئی ہوئی شعر کی دیوی کو کہیں کہیں جگا دیا ہے۔ رشک کے لیے یہ موضوع ''برائے بیت گفتن'' نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ رشک لکھنؤ کے حالات سے گھبرا کر کربلا چلے گئے تھے اور وہیں ۱۸۶۷ء میں وفات ہوئی۔ شام غریباں کی سیاہی ان کی شاعری کے لیے سپیدۂ سحری ہے۔ اس شعر میں جذبہ کی چمک دیکھیے۔

اور اس کے سوا کیا کہوں اے شام غریباں! — مفہوم ہوں میں لفظِ غریب الوطنی کا

شیخ امداد علی بحر (۱۸۱۰ء) میں پیدا ہوئے۔ زندگی عسرت و تنگدستی میں بسر ہوئی۔ دن بھر اپنے گھر کی ڈیوڑھی کے بغلی کمرے میں بیٹھے ہوئے افیون کا مزا لیتے یا اپنے عالم میں گم رہتے۔ ان کی زندگی ان کے اس شعر میں سمٹ آئی ہے۔

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں — دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

دوسرے شعرائے لکھنؤ کی طرح ''بحر'' بھی ''دریا'' ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ اپنی دنیا میں گم رہے۔ یہ دنیا اس درجہ خیالی تھی کہ خواب بھی اس کی تعبیر نہ بن سکے۔ شاید لفظی

تحقیق کو انہوں نے اپنی ذہنی پناہ گاہ کے طور پر اپنایا تھا۔ ان کے واسوخت لکھنوی تمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔

سلسلۂ ناسخ کے شاعروں میں آغا حسن امانت کو اپنی تمثیل نگاری اور واسوخت کی بنا پر درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ امانت کی اندر سبھا کو اردو کا پہلا ناٹک سمجھا جاتا رہا ہے لیکن پروفیسر مسعود حسن رضویؒ نے واجد علی شاہ کے رہسوں کی تاریخ پیش کر کے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ ویسے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اِندر سبھا عوامی سٹیج کی پہلی پیش کش ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نہ جانے کتنے شاعروں نے ایسی ہی سبھائیں لکھیں۔ اندر سبھا اور واسوخت امانت دونوں چیزیں ۱۸۴۸ء تک لکھی جا چکی تھیں۔ امانت لکھنؤ کی نسائیت' ابتذال اور رعایت لفظی کے نمائندے ہیں۔ اگر کسی کو ان خصوصیات کو یکجا دیکھنا ہے تو غالباً امانت کا مطالعہ کافی ہوگا۔

منیر شکوہ آبادی رشک کے شاگرد تھے۔ ان کا ذکر ۱۸۵۷ء کے شاعروں میں کیا گیا ہے۔ منیر کی مثنوی حجاب زنان میں نصیر الدین حیدر کے دربار کا مرقع تاریخی طور پر اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہے۔

آتش کے سلسلہ میں دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق کا ذکر آ چکا ہے۔ نسیم نے اپنی مثنوی کو لکھنوی معاشرہ اور ہندو دیو مالا کا سنگم بنا دیا۔ مرزا شوق کی مثنویاں' دوسرے ہم عصر شاعروں کی نسبت ہمیں لکھنوی معاشرہ کے بطون میں جھانکنے کا موقع دیتی ہیں۔ اس معاشرہ کے عام آدمی کا اندازِ عشق و زیست کیا تھا؟ اخلاقی تصورات اور جنس کی باہمی کشمکش کتنی شدید تھی؟ مرزا شوق کی مثنویاں انہیں سوالوں کا جواب ہیں' اسی لیے ان کی تاریخی اہمیت مُسلّم ہے۔

نواب سید محمد خان رند آتش کے ممتاز شاگرد ہیں۔ ۱۷۹۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۴ء میں لکھنؤ آئے اور یہیں آتش کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔

تخلص کی رعایت سے زندگی کا بڑا حصہ رندی میں گزرا۔ پھر اس کا ردِ عمل شروع ہوا۔ ترک مئے و ساقی سے زندگی کے حقائق تک پہنچے اور جب آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے وطن پر بھی پردیس کا دھوکہ ہوا۔ اس دور میں تاج و تخت اپنے مالکوں کو آئے دن بدل دیتے تھے۔ رند نے لکھنؤ کے رسمی مضامین اور رندی کے موضوعات کی جگہ ان حقائق کو اپنی شاعری میں جگہ دینی شروع کی۔

سمجھا ہوں جو اس منزل ہستی کو سرا میں　　دھوکہ ہے وطن پر بھی غریب الوطنی کا

○○○

یہ آج صاحبِ طبل و علم ہے کل وہ ہے　　ہے اپنے نام کی نوبت ہر اک بجا جاتا

ان حالات کا احساس اتنا بڑھا کہ رند کو لکھنؤ چھوڑ دینے کی خلش ستانے لگی۔

مہمان چند روز ہوں پادر رکاب ہوں　　کرتے ہیں مجھ سے کاوشیں اہل وطن عبث

آخر وہ حج و زیارت کے لیے ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ لکھنؤ سے نکلے مگر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی وجہ سے بمبئی سے آگے نہ جا سکے اور وہیں انتقال کیا۔

مہر وزیر علی صبا کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ آج ان کی شاعری کا مطالعہ ان کے بیشتر لکھنوی ہم عصروں کے کلام کے مطالعہ کی طرح اپنے ذوق سے لڑنے کے مرادف ہے لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صبا کا انتقال انتزاع اودھ سے دو ایک سال پہلے ہو گیا تھا' لیکن انہیں ''قتیل شیوہ و انداز لکھنؤ'' ہونے کے باوجود اس کا احساس تھا کہ سیاست اور تاریخ کا رُخ کیا ہے؟ اس احساس کو ان کی شاعری میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

بلبل کہاں' بہار کہاں' باغباں کہاں　　وہ دن گزر گئے' وہ زمانہ گزر گیا

صبا نے ''گردش زمانہ'' کے ذکر میں کھیل کا پہلو بھی پیدا کر دیا ہے۔ اس طرح واقعاتی رنگ لکھنوی انداز سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔

گردش سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہتا　　کس دن تہ و بالا یہ ہنڈولا نہیں رہتا

مظفر علی اسیر سلسلۂ مصحفی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق نے انہیں ابتذال، نسائیت، محبوب کے جسم کے غیر ضروری ذکر اور تفصیلات سے بچا لیا۔ اگرچہ ان کی شاعری کی ذہنی سطح اونچی نہیں ہے، لیکن سطحی عیش کے اس دور میں ان کا لہجہ معتدل ہے اور اس معتدل لہجہ میں المیہ انداز ملتا ہے۔ لکھنؤ میں انہیں بھی تنہائی کا احساس رہا، اگرچہ وہ اودھ کی خاک کا حصہ تھے۔

لوگ نا آشنائے غم ہیں اسیر کون سنتا ہے مرثیہ میرا

امیر مینائی، اسیر کے شاگرد تھے۔ ان کا ذکر ۱۸۵۷ء سے متعلق باب میں کیا گیا ہے۔ امیر بھی اپنے استاد کی طرح واجد علی شاہ کے دربار سے متعلق تھے۔ امیر کے پہلے مطبوعہ دیوان مراۃ الغیب میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں جن میں لکھنؤ کی رونق اور واجد علی شاہ کا ذکر ہے۔ یہ اشعار اور غزلیں اس داخلی شہادت کی بناء پر ۱۸۵۶ء سے پہلے کی ہیں۔ مثلاً ردیف ن کی ایک غزل، جس کا مقطع درج ذیل ہے۔

ہے اگر گردوں مخالف غم نہیں مجھ کو امیر ہوں میں ظلِ دامنِ شاہ ابو المنصور میں

شاہ کمال جرأت کے شاگرد تھے، عمدۂ منتخبہ اور دوسرے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بزرگوں کا وطن کڑا مانک پور تھا۔ ''منصب داران بادشاہی'' میں ملازم تھے۔ پھر لکھنؤ میں آ کر رہ پڑے اور غالباً یہیں جرأت سے اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا۔

شاہ کمال کا شہر آشوب ''ان تمام شہر آشوبوں سے بڑی حد تک مختلف'' ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ شہر آشوب دہلی اور لکھنؤ دونوں کی حالت کا احاطہ کرتا ہے، مگر شاہ کمال نے اسے سیاسی حالت تک محدود رکھا ہے آنے والے ابواب ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تحریکوں سے متعلق ہیں اس لحاظ سے بھی شاہ کمال کا یہ شہر آشوب شروع سے آخر تک سیاسی ہے۔ اپنے استاد جرأت کی طرح شاہ کمال نے وزیر علی کی برطرفی کو

بڑی اہمیت دی ہے اور اس شہر آشوب کے دو بند وزیر علی سے متعلق ہیں۔ یہ شہر آشوب دہلی اور لکھنؤ دونوں کی حالت کا احاطہ کرتا ہے' مگر شاہ کمال نے اسے سیاسی حالت تک محدود رکھا ہے' آنے والے ابواب ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تحریکوں سے متعلق ہیں اس لحاظ سے بھی شاہ کمال کا یہ شہر آشوب اردو شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا کا مناسب نقطۂ اختتام ہے کیونکہ اس میں وہ سیاسی بصیرت پوری طرح جلوہ گر ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد کی اردو شاعری کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ یوں شاہ کمال ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کی اردو شاعری کے درمیان بیک وقت ایک پُل اور حدِ فاصل بن جاتے ہیں۔ شاہ کمال کے اس شہر آشوب کا اقتباس درج ذیل ہے۔

بتنگ ہو کسی عمدہ سے جا کرے ہیں سوال — تو منہ پھرا کے وہ بیٹھے ہے اور پھلا کے گال
لگے ہے کہنے وہ اپنا ہی تنگیٔ احوال — زباں پہ لاتا ہے یہ مثل وہیں فی الحال
کروں میں کیا کہ ہے یاں ایک انار و صد بیمار

وزیر و شاہ جو ہیں ان کے ملک کا ہے یہ ڈھنگ — کہ اپنے بخت سے رہتی ہے ان کو نت اٹھ جنگ
وزیر تو ہیں گرفتاریاں بقید فرنگ — سکھ اور مرہٹوں نے واں کیا ہے شاہ کو تنگ
نہیں رہا ہے کچھ اقبال ان کا جز ادبار

جہاں تھے بجنے کے طبل اور بوق کے دستور — بجے ہے اب وہاں ناقوس اور آہ طنبور
دریغ ایسا ہو برباد خانۂ تیمور — کہ ریزہ چین تھے سدا جس کے قیصر و فغفور
بگڑ گیا ہے زمانہ کا ہائے کیا اطوار

وہی یہ شہر ہے اور وہی یہ ہندوستاں — کہ جس کو رشک جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہو کے سب ویراں — نظر پڑے ہے بس اب صورت فرنگستاں
نہیں سوار ہے یاں سوائے ترک سوار

جہاں کہ نوبت و شہنائی جانجھ کی تھی صدا — فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا

اسی سے سمجھو رہا سلطنت کا کیا رتبہ ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار
جو جانشیں تھا ہوا بعد آصف الدولہ کہ خوش تھے جس سے سب ادنا سے لے کرتا اعلا
نمک حراموں کا ہووے خدا کرے بُرا دیا تھا قید میں ظالم نے اس کو آہ پھنسا
نکل گیا یہ وہ مردانگی سے بس ایک بار

- اردو شاعری اور تحریک سید احمد شہید
- انتزاعِ سلطنتِ اودھ اور اردو شاعری
- اردو شاعری اور ۱۸۵۷ء

اردو شاعری اور تحریک سید احمد شہید

اردو شاعری میں صرف سیاسی اور تاریخی واقعات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کی عکاسی ہی نہیں ملتی بلکہ ہماری زبان نے اپنے ''عہد بلوغ'' کی ہر قومی اور ملی تحریک کی ترجمانی کی ہے۔ اردو شاعری نے جس سیاسی تحریک کی ترجمانی سب سے پہلے کی وہ تحریک ''سید احمد شہید'' ہے۔ ہمارے خیال میں سید صاحب کی تحریک کا سال آغاز ۱۸۱۷ء ہے، جب وہ امیر خاں پنڈاری کی ملازمت چھوڑ کر دہلی آئے تھے کیونکہ امیر خاں نے ان کے مشورہ کو قبول نہ کرتے ہوئے انگریزوں سے صلح کر لی تھی۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ہدایت کے مطابق شاہ اسماعیل شہید اور مولوی عبدالحئی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے، اس کے علاوہ اس تحریک کی اہم ترین اور بنیادی کتابیں ''صراط المستقیم'' اور ''تقویۃ الایمان'' سفر حج سے پہلے مکمل ہو چکی تھیں۔ ان وجوہ کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک کے آغاز کا تحریک وہابیت سے کوئی علاقہ نہ تھا اور اس تحریک کی ذہنی جڑیں اسی سرزمین برعظیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان ذہنی جڑوں سے ہماری مراد حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و شاہ عبدالعزیز کی تحریوں سے ہے، لیکن اس بات کا امکان ہے کہ سفر حجاز میں سید احمد شہید اور ان کے رفقا عبدالوہاب نجدی کی تحریک سے روشناس ہوئے ہوں اور اس کا اثر بھی قبول کیا ہو۔ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے نقش حیات جلد دوم میں یہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور ممتاز مؤرخوں کا ایک گروہ وہابی تحریک کے اثرات کا قائل ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب سید احمد شہید حج کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں عبد الوہاب نجدی کی تحریک سے روشناس ہوئے۔ شیخ عبدالوہاب کا سال وفات ۱۷۹۱ء ہے اور ان کی تحریک ان کی زندگی ہی میں نجد کے حدود سے آگے بڑھ چکی تھی۔ عبد اللہ یوسف علی نے اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے:

"۱۸۲۲ء میں حج کے موقعہ پر انہیں (سید احمد شہید کو) عرب میں وہابی تحریک سے غالباً سابقہ پڑا ہوگا۔ اگرچہ عبدالوہاب نجدی ۱۷۹۱ میں انتقال کر گئے تھے لیکن اس تحریک کو ابتدائی فتوحات ۱۸۰۲ء سے ۱۸۱۸ء تک وسط عرب کے سعودی خاندان کے ماتحت حاصل ہوئیں"[1]

ہمارے خیال میں سید صاحب کے ذہن میں اصلاح کے جو خیالات برعظیم کے مسلمانوں کے حالات سے پیدا ہوئے' اس تحریک کے حامیوں سے حجاز میں ملاقات کے بعد انہیں مزید تقویت پہنچی۔ بعد میں سید صاحب کے رفقا کی تحریروں میں یہ رنگ اس طرح اُبھرا کہ ہمیں تحریکِ عبدالوہاب نجدی کی یاد دلاتا ہے۔ مولوی خرم علی کی کتاب "نصیحت المسلمین" اس اثر کی شہادت دیتی ہے۔ کتاب کے خاتمہ میں چند اشعار بھی مصنف نے درج کیے ہیں اور اس تمہید کے ساتھ۔

"ہر چند بیان شرک نثر میں مفصل ہو چکا لیکن تھوڑا مطلب نظم میں بھی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ نظم بہت جلد یاد ہو جاتا ہے (؟ ہو جاتی ہے) خصوصاً لڑکوں کے یاد کروا دینے کے واسطے بہت خوب ہے"[2]

خدا فرما چکا قرآں کے اندر — مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر
جو خود محتاج ہووے دوسرے کا — بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا
اگر قرآن کو سچ جانتے ہو — تو پھر تم منتیں کیوں مانتے ہو
تمیں یہ طورِ بد کس نے سکھایا — محمدؐ نے کہاں ہے یہ بتایا

شرک کے خلاف مسلسل ذہنی اور فکری جدوجہد دونوں تحریکوں میں قدر مشترک ہے۔ سید صاحب کی تحریک سے متعلق یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ یہ تحریک صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تحریک بڑی ہمہ گیر تھی۔ ان کا نصب العین صرف مسلمانوں کا مذہبی نشاۃ الثانیہ نہ تھا بلکہ مکمل سیاسی اقتدار کا حصول بھی تھا' اس غلط

---

[1] عبداللہ یوسف علی' انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ' ص ۱۹۸' کراچی ۱۹۶۷ء

[2] مولوی خرم علی' نصیحت المسلمین صفحہ ۱۴۰-۱۳۹' مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان۔

نقطۂ نظر کی ترویج کی وجہ یہ ہے کہ سید صاحب کی اولین سوانح عمریاں انگریزوں کے تسلط کے دور استبداد میں لکھی گئیں۔ ان کے معتقد اور مرید مولوی محمد جعفر تھانیسری نے نواب امیر خاں اور انگریزوں کی صلح کے سلسلے میں انہیں انگریزوں کے ہمدرد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سرسید احمد خاں نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے جواب میں یہی نقطۂ نظر پیش کیا اور مرزا حیرت نے بھی انہیں بزرگوں کی تقلید کی، لیکن مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا غلام رسول مہر نے حقائق کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سید صاحب کی تحریک انگریزوں کے خلاف تھی۔ نواب سلیمان جاہ اور شاہ بخارا کے نام سید احمد شہید و شاہ اسماعیل شہید کے خطوط اس امر کا دستاویزی ثبوت ہیں۔ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

> ''نصارائے نکوہیدہ خصال و مشرکین بدمآل بہ اکثر بلاد ہندوستان از لب دریائے اباسین تا ساحل دریائے شور کہ تخمیناً شش ماہ راہ باشد تسلط یافتند و دامِ تشکیک و تزویر بنا بہ اِحمال دین رب خبیر بر یافتند و تمامی آں اقطار بہ ظلمات ظلم و کفر شحون گردانیدند''۔[۳]

> ''ہرگاہ بلاد اسلام در دست کفار لئام افتد بر جماہیر اسلام عموماً و مشاہیر حکام خصوصاً واجب و موکدمی گردد کہ کدو کوشش در مقابلہ و مقاتلۂ آنہا بجا آرند، تاوقتیکہ بلاد مسلمین را از قبضۂ ایشاں برآرند و اللہ آثم و گنہ گاری شوند و عاصی و ستم گاری شوند و عاصی و ستم گار از درگاہ قبول مردودمی گردند''۔[۴]

ان اقتباسات سے پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک بنیادی طور پر انگریزوں کے خلاف تھی۔ شاہ بخارا کے نام شاہ اسماعیل شہید نے اپنے ایک اور خط میں واضح ترین الفاظ میں انگریزوں کی مکّاری اور حیلہ بازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

۳؎ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، صفحہ ۵۳، لاہور۔

۴؎ حوالہ بالا۔

"کفار فرنگ کہ برسر ہندوستان تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار و ہوشیار و حیلہ باز و مکار اند"
ان شہادتوں کے مقابلے میں مولوی محمد جعفر اور سرسید کی تحریروں کو وقت کے تقاضے اور مسلمانوں کو انگریزوں کے مظالم سے بچانے کی مصلحت کے سوا اور کس بات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

ان شہادتوں کے بعد بھی ایک سوال باقی رہتا ہے اور وہ یہ کہ سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف تو جہاد کیا لیکن انگریزوں کو کیوں بخش دیا۔ یہ سوال بظاہر الجھا ہوا اور مشکل نظر آتا ہے مگر قدرے غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سید صاحب کے اس اقدام کے اسباب بڑے واضح اور عملی نوعیت کے تھے۔

سید احمد بریلوی ایک آزمودہ کار سپاہی تھے اور وہ جانتے تھے کہ ایک وقت میں ایک ہی دشمن کے خلاف جنگ آزمائی' عسکری کامیابی کا وسیلہ اور ذریعہ بن سکتی ہے۔ رنجیت سنگھ کی حکومت محض ایک عسکری تسلط تھی جس نے پنجاب اور سرحد میں مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ان علاقوں میں اگرچہ مسلمان اکثریت میں تھے لیکن ان کے حالات ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں ابتر اور زیادہ خراب تھے۔ اس کے علاوہ سید صاحب اور ان کے رفقاء انگریزوں کے "دام تشکیک و تزویر" سے باخبر تھے اور ان کی "تجربہ کاری' ہوشیاری' حیلہ بازی اور مکاری" سے آگاہ تھے' اسی لیے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سکھوں کے مقابلہ میں کامیابی کے امکانات' کمپنی کے مقابلہ میں کامیابی کی نسبت زیادہ روشن ہیں۔ علاوہ بریں پٹھان روایتی طور پر اچھے جنگجو سمجھے جاتے ہیں اسی لیے سید صاحب کو یقین تھا کہ بہتر عسکری تربیت کے بعد پٹھان ان کی تحریک کی اساس اور بنیاد بن سکتے ہیں۔ پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری اسلامی ریاستیں برعظیم کے شمال مغربی خطہ سے قریب تر تھیں اور سید احمد شہید نے اِن ریاستوں سے رابطہ قائم کرنے اور انہیں دعوت جہاد دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مندرجۂ بالا نکات میں سے ہر نکتہ اہم ہے۔ بدنصیبی سے اس معرکہ میں کامیابی سید صاحب کے حصہ میں نہ آئی اور وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے سے پہلے ہی شہید ہو

گئے' لیکن ان کے عزائم واضح اور روشن تھے۔ ہنٹر نے اس تحریک کے حقیقی عناصر اور رُوح کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ جب سید صاحب کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا تو اس وقت ان کا نصب العین ہنٹر کے نزدیک کیا تھا؟ ذیل کا جملہ اس کی وضاحت کرتا ہے۔

Whatever was dreaming in his nature now gave place to a fiery ectasy in which he beheld himself planing the Cresent throughout every district in India.[۵]

اس تحریک کے اثرات ہماری اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ ہمارے ادب پر بھی کافی گہرے پڑے ہیں۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری زبان نے اس تحریک کو برعظیم کے مختلف حصوں تک پہنچا دیا۔ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے مکتوبات فارسی میں ہیں لیکن اس تحریک کی بنیادی کتابیں اردو ہی میں لکھی گئی ہیں۔ تقویۃ الایمان اُردو کے مذہبی ادب میں محض ایک کتاب کا اضافہ نہ تھی بلکہ ایک ذہنی انقلاب کا بنیادی پتھر تھی۔ علاوہ بریں سید صاحب اور ان کے رفقاء عوام کو اردو ہی میں خطاب کرتے۔ یہ ہمارے مطالعہ کے دور کی پہلی تحریک ہے جس نے ادب کی اہمیت کو سمجھا اور اُسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ یوں ہمارے ادب میں افادیت اور مقصدیت کی ابتداعلی گڑھ تحریک سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ اس حقیقت کو اب تک نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ ادب کی شاید ہی کسی تاریخ میں تحریک سید احمد کے ادبی پہلو کا ذکر کیا گیا ہو۔ اس تحریک نے بڑا ادب پیدا نہیں کیا اور نہ ہی یہ ادب زیادہ پھیلا ہوا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ سید احمد شہید مئی ۱۸۲۴ء میں حج سے واپس لوٹے اور ۲ مئی ۱۸۳۱ء کو شہید ہو گئے۔ سات برس کی یہ مدت ان کی تنظیمی کاوشوں' دوروں اور دوسری مصروفیتوں کو دیکھتے ہوئے خاصی مختصر سی تھی۔ پھر اس جماعت کا اولین مقصد جہاد تھا جس کے لیے عسکری تربیت ادبی تخلیق سے زیادہ اہم تھی اور سید صاحب کے بیشتر رفقاء سپاہی تھے' اعلیٰ درجے کے ادیب وشاعر نہ تھے۔ مگر اس تحریک نے نقطۂ نظر میں جو تبدیلی پیدا کی اور ادب میں جن خیالات کے اظہار کے لیے نقطۂ آغاز بنی وہ ضرور اہم

۵ Hunter W,W., The Indian Muslamans, p 53, Calcutta 1945.

ہیں۔ ممکن ہے کہ اس تحریک سے وابستہ لوگوں نے جو شعری اور ادبی ورثہ چھوڑا ہو وہ خاصا ضخیم ہو اور عہد غلامی میں تلف ہو گیا ہو' کیونکہ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ یہ جماعتِ مجاہدین شاعری کو خاصی اہمیت دیتی تھی اور شعر کو رجز خوانی کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اب ہم اس تحریک کے زیر اثر تخلیق شدہ شاعری کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

سید احمد شہید جب ۱۸۲۴ء میں سفر حج سے واپس آئے تو ان کے ایک معتقد شاعر حسنؔ نے ۹۷ اشعار کا ایک قصیدہ پیش کیا۔ یہ قصیدہ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کی جو تصویریں پیش کرتا ہے اور شاعر نے ان ہستیوں کا جس انداز سے تذکرہ کیا ہے اس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریک جہاد کی منصوبہ بندی سید صاحب اس سفر سے پہلے (یعنی ۱۸۲۱ء) مکمل کر چکے تھے۔ اور اس سفر کی غایت غالباً حج بیت اللہ کے علاوہ دنیائے اسلام کے با اثر لوگوں کو اس تحریک سے باخبر کرنا تھا۔ حسن نے سید صاحب کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

کیا کروں قافلہ سالار کا اس کے میں بیاں
جس کے اوصاف ہیں تحریر و بیاں سے باہر
صدق میں ثانئ اثنین کے مانند قوی
جد اور جہد میں اسلام کے ثانی عمرؓ
وہ ہے ایثار میں عثمانؓ کی طرح موجِ رواں
اور صفِ جنگ میں ہم طرز علیؓ صفدر
سید احمد و عالی حسب و فخر زماں
رہبر راہِ شریعتؑ خلفِ پیغمبر
حق میں کافر کے ضیغم کی طرح ہے خونخوار
مومنوں کے لیے شفقت میں پدر سے بہتر

اور سید صاحب کے رفقاء کا حسنؔ نے یوں ذکر کیا ہے:

ہے ہر اک شخص وہاں آمرِ امرِ معروف
قاطع بدعت و ناہی اصول منکر
دشمن کفر زدل' قاتل کفار زجاں
قاطعِ رسم زبوں' تابعِ حکمِ داور[۶]

مذکورۂ بالا اشعار تحریک سید احمد شہید کو اس کے حقیقی خط و خال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ جماعت تھی جس نے ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کو اپنا شعار بنایا تھا' جو کفر کے غلبہ سے مسلمانوں کو نجات دلانا چاہتی تھی' جس کا رہبر اسلام کے لیے اپنی جدوجہد میں ثانی عمرؓ تھا اور صف جنگ میں ''ہم طرز علی صفدرؓ''۔

اس تحریک سے متعلق تاریخی شہادتوں سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وقت جنگ رجز خوانی کے طور پر اردو نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ بالخصوص جنگ مایا کے موقع پر ایک جہاد نامہ رجز کے طور پر پڑھا گیا۔ مستند روایات کی بناء پر مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے ''دو غازی رجز خوانی کر رہے تھے' ایک امان اللہ خاں ملیح آبادی' دوسرے شیخ ریاست علی موہانی۔ امان اللہ اگرچہ خاصے سن رسیدہ تھے لیکن ہمت و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ بزدل بھی ان کی باتیں سن کر شیر دل بن جاتے۔ ان کی لے بڑی پُر تاثیر تھی۔ شیخ ریاست علی بھی بڑے خوش گلو تھے۔ مولوی خرم علی بلہوری کا منظوم جہادیہ پڑھتے جا رہے تھے۔[۷]

اس اردو ''جہادیہ'' میں ۱۷۵ اشعار ہیں۔ مصنف نے اُسے رسالہ جہادیہ کا نام دیا ہے:

بعد تحمید خدا' نعت رسول اکرمؐ
یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم

اس نظم میں شعری محاسن تو نہیں' لیکن مصنف کے خلوص نے بڑی گرمی پیدا کر دی ہے اور خلوص کے کیمیاوی عمل نے الفاظ کو زبانِ گویا بنا دیا۔

---

۶ منقول از بیاض نور الحسن (مخطوطہ)' کتب خانۂ شخصی راقم الحروف (سالِ کتابت ۱۸۳۷ء)

۷ غلام رسول مہر' سید احمد شہید حصہ دوم' صفحات ۲۔۲۴۱

چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

جس کے پیروں پہ گرے گردِ صفِ جنگ جہاد
وہ جہنم سے بچا' نار سے ہے وہ آزاد
اے برادر! تو حدیث نبویؐ تو سن لے
''باغ فردوس ہے تلواروں کے سائے کے تلے''
جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے' نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں' جنت میں خوشی کرتے ہیں
زندگی بھر کے گناہِ شہداء مٹتے ہیں
کیوں نہ ہو' راہ خدا ان کے تو سر کٹتے ہیں
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیٔ جہاد
چلو اب اس کی طرف' مت کرو گھر بار کو یاد
مال' اولاد کی' جورو کی محبت چھوڑو
راہ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو
دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
اب تو غیرت کرو' نامردی کو چھوڑو یارو
سید احمد سے ملو' جلد سے کافر مارو
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو
حضرت مولوی! اب طاق میں رکھ دیجے کتاب
لیجے تلوار و میدان کو چل دیجے شتاب

اے گروہ فقرا! نفس کشی کے استاد
عملِ نفس کُشی کون ہے بہتر ز جہاد
اے جوانان اسد حملہ و رستم قوت!
کام کس دن کو پھر آوے گی تمہاری جرأت
دوستو! جب تمہیں مرنا ہی مقدر ٹھہرا
پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیے در راہِ خدا
گر رہِ حق میں نہ دی جان، تو پچھتاؤ گے
اور پیمبرؐ کو یہ منہ کیا بھلا دِکھلاؤ گے
اہل ایمان کو کافی ہے دلا! اتنا پیام
اب مناجات سے بہتر ہے کہ ہو ختم کلام
اے خداوند سماوات و زمین، رَبِّ عباد
اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیقِ جہاد
اپنا دے زور مسلمانوں کو، زور آور کر
وعدۂ فتح جو ہے ان سے، اسے پورا کر
ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ!
کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

اس تحریک کے ایک اور مجاہد شاعر مولوی سید نصیر الدین دہلوی ہیں، جو شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے نواسے تھے اور مجاہدین کے زمرے میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے جہاد کی تنظیم و توسیع کے لیے سندھ اور دکن کے دور دراز سفر کیے تھے۔ مولوی نصیر الدین دہلوی کے حالات مولانا مہر نے ابو احمد علی کے ایک رسالہ کی بنیاد پر ''سرگزشت مجاہدین'' میں تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کی ذات ہی نے تحریک کے رہنما کی شہادت کے بعد جہاد کے شعلہ کو روشن رکھا تھا۔ مولوی نصیر شاعر بھی تھے لیکن ان کی شاعری تحریک کے مقاصد کے اظہار کے لیے مخصوص

تھی۔ ان کی ایک نظم مولانا مہر نے ابو احمد علی کے رسالہ سے "سرگزشت مجاہدین" میں نقل کی ہے۔ تین شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس نظم کے ابتدائی اشعار میں ذات باری تعالیٰ سے شاعر کا خطاب ہے:

کر دے مسلماں سے شرک کی باتوں کو دور
شوق ہو توحید کا' عمر ہو اس میں بسر
بدعتِ و کفر' نفاق ان کو تو جلدی سے کھو
اوج ہو اسلام کا' شرع ہو بازیب وفر
پھوٹ مسلمانوں سے اے میرے رب دُور کر
اور انہیں ایسا بنا' جیسے ہوں شیر و شکر[۸] (کذا)

وصال فتح پوری اس عہد کے ایک اور شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے مجموعہ میں کئی ایسے اشعار ہیں جو اس تحریک سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ وصال کی تاریخ وفات نہیں معلوم لیکن ان کی قلمی بیاض (جو میرے نانا سید علی اوسط صاحب رشک فتح پوری کی ملکیت تھی) پر ان کے دستخط اور تاریخ موجود ہے جس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ ۱۸۴۷ء تک ضرور حیات تھے۔ اس مخطوطہ سے دو اشعار پیش کرتا ہوں۔

فوجِ خدا نے کفر کا منہ توڑ کر وصال
اسلامیوں کو نیند سے بیدار کر دیا

OOO

"امام عہد حاضر" نے بلایا جس گھڑی ہم کو
اسی لمحہ شہادت گاہ میں ہم نے قدم رکھا

یہ اشعار ایسے ہیں کہ انہیں رسمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں تو شاعرانہ اصطلاحوں اور اشاروں کی چلمن بھی نہیں ہے' جو لیلیٰ سخن کے جلوہ کو نیرنگ نظر بنا سکتی ہے۔ ان اشعار کو تحریک سید احمد شہید سے متعلق سمجھنا درست ہو گا اور دوسرے شعر کی بنا پر شاید یہ

---

۸ غلام رسول مہر' سرگزشتِ مجاہدین' صفحہ ۲۱۰' لاہور ۱۹۵۶ء

دعویٰ بھی بے جا نہ ہو کہ غالباً وصال فتح پوری سید شہید کے عملی رفقا کی جماعت میں شامل تھے۔

سید احمد شہید کے عملی رفقاء اور مجاہدین کی شاعری کا ذکر مختصراً سطور بالا میں کیا گیا' لیکن ابھی اس باب کی اہم ترین شخصیت کا ذکر باقی ہے۔ اس تحریک کا سب سے اہم شاعر مومن ہے۔ مومن خاں مومن۔ وہی مومن جس نے اردو میں عشقیہ شاعری کو اس سطح پر پہنچا دیا جہاں نغمہ شعلہ بن کر دکھائی دیتا ہے اور جسم نغمہ بن کر سنائی دیتا ہے' وہی مومن جس کی مثنویوں سے بقول صاحب کاشف الحقائق کوچہ گردی کی بو آتی ہے۔ مومن خاں کا یہی تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ وہی مومن خاں جو طبیب تھا' مگر اپنے ''مریضوں'' سے دوا لیتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

ہم نے مومن کی شخصیت کے ایک گوشے کو اس کی پوری شخصیت سمجھ لیا ہے' ویسے عشق پیشگی و جذبۂ جہاد میں زیادہ تفاوت بھی کب ہے؟ یہ تفاوت تو حیران ہونے کے لیے یا اپنے آپ کو حیران کرنے کے لیے ہم آپ خود پیدا کر لیتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام نے اپنی ثقافتی تاریخ کی جلد سوم یعنی موج کوثر میں ''سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے کار'' کے سلسلہ میں مومن دہلوی کا ذکر کیا ہے' لیکن انہوں نے ان اسباب پر روشنی نہیں ڈالی جنہوں نے مومن کو اس تحریک سے وابستہ کر دیا تھا۔ شیخ اکرام نے اس باب میں صرف یہی لکھنا کافی سمجھا ہے:

''بعض لوگوں کو تعجب ہو گا کہ ایک حکیم' نجومی اور ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کے عاشقانہ گیت گانے والا مومن کس طرح ان لوگوں میں شریک ہو سکتا ہے جن کی زندگیاں سادہ اور سپاہیانہ تھیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مومن بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا جو شمالی ہند میں بڑے زور سے جاری تھی۔[۹]

عبارت سے اندازہ ہوتا ہے جیسے اکرام صاحب بعض لوگوں کے تعجب کو ختم

---

۹ شیخ محمد اکرام' موج کوثر' صفحہ ۱۴۱' طبع دوم' فیروز سنز۔

کرنے کے لیے مومن کی شرکت تحریک کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔ ہم نے جیسے پہلے عرض کیا ہے کہ عشق اور جذبۂ غیرت دینی میں کوئی تضاد نہیں۔ اس سے قطع نظر مومن کے گھرانے میں ایک دینی ماحول ہمیشہ رہا۔ مومن کے خاندان کے افراد مذہب سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے۔

مومن کے والد حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے مرید تھے اور حضرت سید احمد شہیدؒ بھی اس گھرانے کے نیاز مندوں میں شامل تھے۔ پھر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے کہنے ہی سے شاہ اسماعیلؒ اور مولوی عبدالحئیؒ نے سید احمد بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مومن کا نام بھی شاہ عبدالعزیزؒ ہی نے رکھا تھا۔ مومن کے کانوں تک جو پہلی آواز پہنچی تھی' وہ شاہ عبدالعزیزؒ کی ہی تھی جنہوں نے نومولود بچے کے کانوں میں اذان دی تھی۔ اور اذان کے پردے میں مومن کو ''فلاح'' کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دیا تھا۔ خاندانِ محدث دہلوی سے مومن کے تعلق کی یہ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اپنا لڑکپن اور عنفوان شباب مومن نے اسی گھرانے کی ایمان افروز فضا میں گزارا۔ انہوں نے شاہ عبد القادرؒ کے سامنے زانوائے تلمذ تہ کیا اور استاد کا اثر اپنے شاگرد پر بہت گہرا پڑا۔ مومن عمل کی دنیا میں بہت سے مرحلے طے نہ کر سکے' لیکن ذہنی طور پر وہ دین کے حقیقی تصور سے اچھی طرح روشناس تھے۔ وہ گوشہ نشینی اور ''مجہول تصوف'' کے مارے ہوئے نہ تھے۔ حرکت ان کے مزاج کی افتاد تھی' عشق میں بھی' مذہب میں بھی' اور زندگی کے ہر گوشتہ میں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کا خاندان اور ان کی تعلیمات سید احمد بریلویؒ اور مومن کے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پھر سید احمد بریلوی کی تحریک نے ۱۸۲۴ء سے فروغ حاصل کرنا شروع کیا اور اس وقت مومن کی عمر چوبیس سال تھی۔ سید احمد شہید کی شہادت کے وقت وہ اکتیس سال کے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خون میں بجلیاں کوندتی ہیں۔ ہر حساس اور باشعور نوجوان عشق کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے گرد و پیش' ماحول' فضا اور حالات کو بدل دینے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔

مومن کی شاعری اور زندگی میں اس بے تابی کچھ کر گزرنے کی تمنا اور انقلاب کی

آرزو کے کتنے ہمیں نشانات نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ خواہشیں اور تمنائیں عمل نہ بن سکیں، شعر بن گئیں۔ مومن ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے جب ایک طرف مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو رہا تھا اور دوسری طرف اسی اقتدار کے حصول کے لیے کوششیں جاری تھیں ایک نئے دور کی اولین کرنیں مطلع پر ابھر آئی تھیں جن کی مدھم روشنی کو بہت سی آنکھیں نہ دیکھ سکیں، لیکن مومن نے ان تبدیلیوں کو محسوس کیا۔ یہ احساس ان کی رگوں میں زہر غم بن کر نہ اتر سکا، اور تغزل بن کر بھی اپنی تلخی نہ کھو سکا۔ مومن محض مولوی زادہ ہی نہ تھے رئیس زادہ بھی تھے۔ ایک طرف دین سے وابستگی تھی اور دوسری طرف لذتوں کی دنیا اور حسن پرستی کی کیفیات بھی تھیں۔ مومن نے دونوں سے سے نباہ کی۔

مومن کو محض حسن و عشق کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ ان کی مثنوی جہاد اور چند قطعات کے سوا لوگوں کو ان کی شاعری ایک رنگین سیارہ نظر آتی ہے۔ ہم مومن کی غزلیات، ان کے مزاج اور ان کے عہد کے حالات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ مومن نے اردو غزل کو عشق کا نیا آہنگ دیا ہے اور کوچۂ عشق کو نئی وسعتیں عطا کی ہیں، مگر ان کی غزلوں میں عشق و ہوس کے سوا کچھ اور بھی ہے، اور وہ ہے غزل کی زبان میں اپنے عہد کے حالات پر تبصرہ اور تبصرہ بھی ایک ایسے مبصر کی طرح جو ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہو۔

مومن کی غزل میں ایسے اشاروں اور تبصروں پر گفتگو آگے آئے گی۔ پہلے ان کی شاعری کے اس حصہ کو لیتے ہیں جس میں تحریک سید احمد کا تذکرہ علامات و رموز کے بغیر کیا گیا ہے۔ یہ حصہ اس لیے اور اہم ہے کہ اس سے مومن کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے اور اسی کی مدد سے ہم ان کی غزلوں کی چھپی ہوئی معنویت کو تلاش کر سکتے ہیں۔

''مثنوی بمضمون جہاد'' تحریک سید احمد بریلوی سے متعلق ہے۔ اس کے چالیس اشعار سے صرف مومن کے جذبات کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ مومن نے ملتِ اسلامیہ کو شرکتِ جہاد کی دعوت دی ہے۔ اس میں جہاد کی اہمیت کے ساتھ ساتھ فلسفۂ جہاد کو بھی پیش کیا ہے اور اسے دین و دنیا کی سرخروئی کا وسیلہ بتایا ہے۔ جنت کے دروازے تو غازیوں پر کھلتے ہی ہیں، اس جہاد سے یہ بھی توقع تھی کہ

ایک بار برعظیم پھر مسلمانوں کے زیرِ نگین آ جائے گا۔

یہ ملک جہاں ہے تمہارے لیے　　نعیم جناں ہے تمہارے لیے

مثنوی بمضمون جہاد[۱۰] "مثنوی برائے جہاد"[۱۱] کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مومن اس تحریک سے کس حد تک وابستہ تھے۔

وہ خضرِ طریقِ رسول خدا　　کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا

زہے سید احمدؐ قبول خدا　　سرِ امتحانِ رسولِ خدا

رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات　　ہے کفار کی موت اس کی حیات

جلو میں ہمیشہ دواں ہو ظفر　　رکاب اس کی پکڑے رواں ہو ظفر

خبردار ہو جاؤ، اے اہل دل!　　کہ رحمت برستی ہے اب متصل

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا　　اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا　　فدا جی سے راہ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہے　　خداوند اس سے رضا مند ہے

امامِ زمانہ کی یاری کرو　　خدا کے لیے جاںنثاری کرو

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو　　حیات ابد ہے جو اس دم مرو

جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم　　سزاوارِ گردن فرازی ہو تم

یہ ملک جہاں ہے تمہارے لیے　　نعیم جناں ہے تمہارے لیے

الٰہی! مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　عروج شہید اور صدیق دے

کرم کر، نکال اب یہاں سے مجھے　　ملا دے "امامِ زماں" سے مجھے

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں　　اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

۱۰۔ کلیاتِ مومن، مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۲۳ء

۱۱۔ کلیاتِ مومن، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، کتاب دُنیا، کراچی

اس مثنوی کے علاوہ کلیات مومن میں اس تحریک سے متعلق دو تاریخیں بھی ہیں۔ یہ تاریخیں ''خروج مہدی'' کی تاریخیں ہیں۔ مومن نے کئی مقامات پر سید احمد بریلوی کو امام زماں، امام دوراں اور مہدی قرار دیا ہے۔ ان تاریخوں کا عنوان ہے: ''ایمان تازہ کردن شہور و سنین بدست امیر المومنین ابن امیر المومنین''۔ پہلی تاریخ چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور دوسری میں گیارہ شعر ہیں۔

تاریخ اول

جو سید احمد امام زمان و اہل زماں
کرے ملاحدِ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ وغا
خروج مہدیٔ گفتار سوز کلک تفنگ

۱۲۴۲ھ

اقتباس از تاریخ دوم

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ
کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیم کوثر ہے
وہ کون؟ امام جہان و جہانیاں احمدؒ
کہ محض مقتدیٔ سنتِ پیمبر ہے
زبس کہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد
جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے
وہ شعلۂ خصلت الحاد سوز کفر گداز
کہ جس کا نقشِ قدم مہرِ روز محشر ہے
وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سالِ خروج
امام برحق، مہدی نشان علی فر ہے
(۱۲۴۲ھ)

اس تحریک سے مومن کی دلچسپی محض جذباتی نہ تھی بلکہ وہ اس تحریک تجدید سے علمی و مذہبی دلچسپی اور وابستگی رکھتے تھے۔ وہ عدم وجوب تقلید شخصی کے قائل تھے۔ ویسے اس بات کو ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیے کہ سید صاحب کے رفقا و خلفاء کی آرا بھی اس مسئلہ میں مختلف تھیں۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ تقلید شخصی کو غلط جانتے تھے۔ مولانا عبدالحیؒ تقلید کے قائل تھے۔ ویسے اس بات پر یہ سب متفق تھے کہ یہ مسئلہ جزوی، غیراہم اور فروعی ہے جس کا اصل دین سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر انہیں بنیادوں پر بہت سے مسلمانوں اور ''علماء'' کے ایک طبقہ نے سید صاحب اور ان کی تحریک کی شدت سے مخالفت کی تھی، یا یوں کہیے کہ انہیں ان بنیادوں پر اس تحریک کی مخالفت کا حکم دیا گیا تھا۔ اپنی ایک رباعی میں ایسے لوگوں کے متعلق مومن بڑے تند و تیز لہجہ میں کہتے ہیں۔

یہ چند منافق، سراپا بدعت ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی، امام حق کو گویا کہ جہاد ہے خلافِ سنت

اپنے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے مومن کے لہجہ میں مناظرہ بازوں کی سی تلخی آ جاتی ہے۔ مثلاً

حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

مومن کی کئی رباعیوں کا موضوع یہی مسائل ہیں مثلاً قیاس، تقلید، حق اہل حدیث کا اقرار یا مقلد کے مقابلہ میں شیعہ کے مقام کو افضل تر ماننا۔ یہ عقائد تحریکِ سید احمد بریلوی کے زیر اثر ہی مومن کے دماغ کا حصہ نہیں بنے بلکہ اس میں ولی اللہی خاندان میں ان کی ابتدائی تعلیم کا بھی اثر ہے۔ مومن اپنے دیوان خانہ میں بیٹھ کر ان موضوعات پر سوچتے تھے۔ اگر وہ خود بھی میدانِ جنگ میں جاتے تو اس نظری بحث میں الجھنے کی جگہ وہ جہاد ہی میں مصروف رہتے۔ مومن کی اس نوعیت کی رباعیوں میں صرف ایک ہی رباعی ایسی ہے جس میں مومن کا مخصوص اسلوب کارفرما ہے۔ وہی تغزل کی شان، وہی شوخی، وہ پیرایۂ ادا جو مومن کی ذات سے وابستہ ہو گیا ہے۔

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں
ہے معرکۂ جہادؑ چل دیجے وہاں

انصاف کروؑ خدا سے رکھتے ہو عزیز
وہ جان جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

اب ہم مومن کی غزلوں میں اس تحریک اور اس عہد کے عمومی حالات کا سراغ لگائیں گے۔ غزل گو شاعر کسی پائیں باغ کی طرف کھلنے والے دریچہ کو بند نہیں رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے دریچے سے ہر منظر زیبا و نازیبا کو دیکھتا ہے اور پھر اس کی دروں بینی ان خارجی مطالعوں اور مشاہدوں پر آپ بیتی کا رنگ چڑھا دیتی ہے۔ غزل کی دنیا میں شہروں کا اجڑنا' دل کا اجڑنا بن جاتا ہے۔ مومن کے یہاں یہ اشاریت کچھ اور زیادہ شدید ہے۔ وہ کبھی اشاروں پر رمزیہ اسلوب کے پردے ڈالتے ہیں' کبھی درمیانی کڑیاں حذف کر کے تماشائے اہل نظر دیکھتے ہیں۔ ان کی خود بینی یا اظہار ہنر اس کا متقاضی ہے کہ اہل فن بھی انتہائی توجہ کے بعد ان کے افکار و تصورات تک پہنچ سکیں۔

سن رکھوؑ سیکھ رکھوؑ اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اے اہل فن! اظہار ہنر کرتا ہے

لیکن تحریک سید شہید سے مومن کو اس درجہ وابستگی تھی کہ غزلوں میں بھی بعض مقامات پر اس نے بادہ و ساغر کے بغیر مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں کوئی علامت یا اشارہ استعمال نہیں کیا گیا اور اگر اشاریت ہے بھی تو غزل کے فن کی نہیں ہے بلکہ ہماری زبان کی عام گفتگو اور اسلوب کی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

شوقِ بزمِ احمدؒ و ذوق شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہنچ اس مہدیٔ دوراں تلک

غنچہ ہائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشن ایماں میں آتی ہے بہار

گلشنِ ایمان میں بہار کی آمد کے امکان کو مومن نے اپنی آرزو کے غنچے قرار دیا ہے۔ اور مومن کو اس بات کا دکھ بھی ہے کہ اس کو حقیقت میں بدلنے کے لیے وہ عملی جدوجہد نہ کر سکا' حالانکہ اسے سچے دل سے ''شوق بزمِ احمد'' و ''ذوق شہادت'' تھا' مگر اس کا ماحول' گرد و پیش کی مجبوریاں اور حسن پرست فطرت اس کے ارادوں پر غالب آ گئی۔

وہ دن گئے کہ لاف و گزاف جہاد تھا
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

جس طرح یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جہاد اور سید احمد بریلوی سے متعلق مومن کے اشعار ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء کے درمیانی زمانے میں لکھے گئے' اسی طرح یہ بھی یقینی ہے کہ مذکورۂ بالا شعر شہادت سید احمد کے بعد لکھا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاد کا یہ شعلہ مومن کے دل و دماغ میں عرصہ تک فروزاں رہا اور جہاد کے اس جذبہ نے انہیں بار بار ملکی حالات پر غور کرنے پر مجبور کیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس دور پُر آشوب میں کوئی ایسے مسائل سے بچ کر کہاں جاتا' اور وہ بھی ایک ایسا باشعور انسان جس نے اپنے آپ کو سرکاروں اور درباروں سے ہمیشہ دُور رکھا۔ جو اپنے عہد کو بدل تو نہ سکتا تھا مگر اپنی انفرادیت کی حفاظت ہر قیمت پر کر سکتا تھا۔

مومن کا انتقال ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ ان کی موت تک مغل سلطنت کا نشان باقی تھا' یہ الگ بات ہے کہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی حکومت ''از دلی تا پالم' باقی رہ گئی تھی۔ وہ بار بار غلامی کی شدت سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ غلامی کے بڑھتے ہوئے سیاہ بادلوں کو دیکھتے ہیں اور کڑھتے ہیں۔ وہ چمن والوں کو بار بار یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ یہ ایام خزاں ہیں اور کبھی ہم نفسوں میں شعور کی کمی سے غمگین ہو جاتے ہیں اور انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مقید ہیں اور قید بھی کیسی؟ قید تنہائی۔ ذرا ان تمام مرحلوں کا نظارہ اور مطالعہ مومن کی غزل کے آئینہ میں کیجیے۔

کتنا شعاع مہر نے حیراں کیا ہمیں تکتے ہیں کب سے روزنِ دیوار کی طرف

چمن کو جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے گویا　　کہ دیکھا کرتے ہیں داغوں کو سینہ چیر اکثر ہم

OOO

اب کیا کہیں تم سے اے ہمدردو! پوچھو مت مرغان چمن

کیونکر یاں ایام خزاں اور ہجر کے دن کٹ جاتے ہیں

کنجِ قفس میں بیٹھ کے گاہے، روتے ہیں تنہائی پر　　یادِ سیرِ موسمِ گل سے گاہے جی بہلاتے ہیں

OOO

نہ جاؤں کیونکہ سوئے دام آشیاں سے، جب　　خیالِ حسرتِ مرغانِ ہم قفس گزرے

OOO

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی　　آشیاں اپنا ہوا، برباد کیا؟

OOO

اس چمن زار کا حسرت سے نظارہ کر لے　　اے نگہ! دیدۂ ہر سو، نگراں ہونے تک

یہ اشعار غلامی کی مہیب تصویر کے مختلف تاریک گوشوں کو پیش کرتے ہیں بالخصوص پہلے شعر کی کیفیت کتنی دل سوز ہے۔

کتنا شعاعِ مہر نے حیران کیا ہمیں　　تکتے ہیں کب سے روزنِ دیوار کی طرف

قرینہ کہتا ہے کہ "شعاع مہر" سے مومن کی مراد "تحریک جہاد" ہے اور یہ "روزنِ دیوار" حصول آزادی و نظام ملّی کے امکان کا اشارہ ہے۔

مومن کی غزلوں میں غلامی کے ان مرحلوں کے علاوہ "صیاد" کا ایک ایسا تصور ملتا ہے جو ہمارے ذہن میں بدیسی حاکموں کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس صیاد میں تلخی اور ظلم اتنا نہیں ہے، جس قدر مکاری اور چالاکی ہے اور مکاری بھی ایسی جو "لطف" کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صیاد روایتی نہیں ہے، اور یہی صیاد ہمیں "کافر صنم" کے روپ میں بھی ملتا ہے۔

بندے ہیں ہم صیاد کے، کہتا ہے کس کس لطف سے

گر ہو سکے راہ چمن، اے بستگان دام! لو

ہر ستم صیاد کا کیا التفات آمیز تھا
بند کرنے کو قفس میں دام سے چھوڑا ہمیں

کمیں میں ہے مومن وہ کافر صنم بس اب پاسبائی دیں ہو چکی

اس ''صیاد'' نے اپنے ستم کو ابتدا میں التفات کے پردے میں چھپایا' کیونکہ یہی مصلحت کا تقاضا تھا کہ تجارت کے پردے میں تخت کی طرف قدم بڑھائے جائیں' لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد انگریز نے اپنے حقیقی عزائم پر پردہ ڈالے رکھنا ضروری نہ سمجھا' اور مومن کے الفاظ میں

چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب

مومن کی نگاہ اپنے عہد کی سیاست پر بہت گہری تھی۔ اپنی ذہنی اور دلی کیفیات کو بیان کرنا تو خیر ان کا فن ہے مگر وہ صیاد سے بھی خوب واقف ہیں۔ اس کے کردار کا ہر گوشہ ان کے سامنے ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مُرغانِ چمن میں سے کتنے ہی چمن کے خلاف سازش میں صیاد کے ساتھ شریک ہیں۔

اب قید سے امید رہائی نہیں رہی ہمدردِ پاسبان ہیں' زندانیوں میں ہم

ان تفصیلات کے علاوہ غزلیات مومن میں ایک ایسا اضطراب ملتا ہے جس کا علاقہ عشق سے نہیں بلکہ ماحول کو بدلنے کی آرزو سے ہے۔ مومن جہاں کو تہ و بالا دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ہر انقلاب کے ساتھ بہر حال اُمید تو وابستہ ہوتی ہے یا یوں سمجھیے کہ ممکن ہے کہ انقلاب سے پہلے انقلاب کے ذریعہ حالات میں کسی تبدیلی کا امکان نظر نہ آتا ہو' مگر ایسی صورت میں بھی تجربہ کرنے سے کیوں بھاگا جائے؟ مومن ہمہ وقت مضطر رہتے ہیں' کیونکہ وہ اُس عالم کو بدلنا چاہتے ہیں جس میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن قوت عملی کی کمی' اس ارادہ کو حقیقت سے ہمکنار نہیں ہونے دیتی۔ مومن حیرت کے عالم میں زندہ رہنے کے قائل نہیں۔ احتیاط اور مصلحت سے بھی وہ دامن بچا کر واضح اسلوب گفتار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

شام سے تا صبح مضطر' صبح سے تا شام ہم ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

اے حشر جلد کرتہ و بالا جہان کو یوں کچھ نہ ہو امید ابھی انقلاب میں [۱۲]

کہاں تک دم بخود رہیئے، نہ ہوں کیجئے نہ ہاں کیجیے بنا کر بات کیا کیجئے، جو کچھ ہو تو بیاں کیجیے

لیکن

ع آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

جو کچھ مومن نے سوچا وہ نہ ہوا۔ اس شکستِ آرزو نے مومن کے حوصلہ کو بھی پست کر دیا اور پھر محبان آزادی کی حالت (کچھ عرصہ) یہ رہی کہ واقعات و حالات انہیں یوں پراگندہ کر دیتے جیسے تیز ہوا میں پتے بکھر جائیں۔ اتنی سکت باقی نہ رہی کہ وہ خود فرنگیوں کے لیے زلزلہ بن سکتے بلکہ ہر واقعہ ان کے لیے زلزلہ بن گیا۔

جوں خفتگانِ خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی، کروٹ بدل گیا

مومن اور تحریک جہاد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس کی تائید مزید مومن کے فارسی دیوان سے ہوتی ہے، جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے، لیکن مومن کا فارسی کلام ہمارے دائرہ مطالعہ سے خارج ہے۔

شیخ محمد اکرام نے مومن کی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے موج کوثر میں بجا طور پر لکھا ہے:

"حالی کو بالعموم مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر یہ سوچا جائے کہ مولانا سید احمد بریلوی نے پہلی دفعہ مسلمانان ہند کو دوسری قوموں کے مقابلے میں من حیث الجماعت جمع کیا اور ان کے ایک طبقہ کو مذہبی آزادی دلانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تو یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانانِ ہند کی جداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے انہوں نے کیا۔ اس صورت میں مومن کو مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اس نے مولانا سید احمد کے خیالات کی ترجمانی اسی طرح کی جس طرح بعد میں علی گڑھ تحریک کی حالی نے"۔ [۱۳]

---

[۱۲] منظوماتِ مومن، مطبوعہ آزاد وطن پریس کان پور ۱۹۴۶ء

[۱۳] شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر، صفحہ ۲۴۳

انتزاعِ سلطنت اودھ اور اُردو شاعری

انتزاع سلطنت اودھ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جو خلا میں رونما ہوا ہو۔ انگریزوں کے تعلقات اُس ریاست کے ساتھ حد درجہ تاریک رہے ہیں جو بڑی حد تک ان کی تخلیق کردہ تھی۔ اودھ میں بادشاہت کے قیام اور پہلی تاج پوشی کے سلسلے میں کلکتہ گزٹ کا ایک اقتباس گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس اقتباس کا ایک جملہ یہ بھی ہے:

> "Reports had been in circulation for several months, that it was the intention of the Vazier to assume the title of King, provided the sanction of our Government could be obtained. ❶

اودھ کی یہ بادشاہت ابتدا ہی سے علامتی تھی اور اس کے قیام کا مقصد مغلیہ سلطنت کے اقتدار پر ضرب لگانا تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ہی سلطنت اودھ کو ضبط کیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی معزولی اور جلا وطنی کے ساتھ ضبطیٔ اودھ کا ادھورا کام مکمل کیا گیا۔ بکسر کی لڑائی سے انتزاعِ سلطنت تک کئی بار سلطنت اودھ کا نقشہ بدلا گیا۔ سب سے پہلے بنارس' غازی پور اور کانپور کو اودھ سے علیحدہ کیا گیا۔ ۱۷۸۷ء میں فتح گڑھ اور ۱۷۹۸ء میں الہ آباذ چنار کے بدلے انگریزوں کے دائرۂ مملکت میں شامل کیا گیا۔ پھر سعادت علی خان کی تخت نشینی کے موقع پر سلطنت اودھ کا تقریباً آدھا رقبہ انگریزوں نے قرضہ کی ادائیگی کے نام سے ہتھیا لیا۔

ایک طرف تو سلطنت اودھ کے حصے انگریزوں کے زیر تسلط آ رہے تھے اور دوسری طرف انگریز مختلف صورتوں سے ''وزیرانِ اودھ'' اور بعد ازاں ''شاہانِ اودھ''

---

❶ Selection from Calutta Gazettes, Vol. V, October 1869.

سے روپیہ وصول کر رہے تھے اور ریذیڈنٹ کے ذریعہ اودھ میں اپنی سیاسی شطرنج کے مہرے جما اور چلا رہے تھے۔ انگریز جو چاہتے تھے سو کرتے تھے اور اعمال کے نتائج کی ذمہ داری مجبور شاہ اودھ پر تھی۔ اودھ کے حکمرانوں میں اگر جرأت ہوتی تو وہ میر صاحب کے الفاظ میں انگریزوں سے یہ ضرور کہہ دیتے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

نصیر الدین حیدر کے ایک انگریز مصاحب نے ریذیڈنٹ کے اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میری تقریب بڑے صاحب سے ہوئی۔ یہ لندن میں ایک معمولی سی حیثیت کے آدمی تھے لیکن یہاں ان کے اختیارات ایک بادشاہ اور اس کی پچاس لاکھ رعایا پر ایسے لامحدود تھے جو یورپ میں کسی بادشاہ کو حاصل نہیں ہو سکتے"۔[۲]

ریذیڈنٹ ہر قسم کی سازشوں کا سربراہ ہوتا یا بلا واسطہ سلطنت کے معاملات میں دخل دیتا۔ وزیر علی کی نظر بندی اور تخت سے اترنا اس کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ سر جان شور نے صحیح کہا تھا کہ اس عہدے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اودھ پر قبضہ کرنے کے لیے بہانے اور تاویلیں گھڑی جا سکیں۔[۳]

ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہانِ اودھ سے متواتر کئی معاہدے کیے اور ان سب معاہدوں کا مقصد یہی تھا کہ انگریزی اثرات بڑھتے جائیں اور ریاست کی طاقت اور وسعت کم ہوتی جائے۔ اس بے جا مداخلت کا اعتراف خود انگریزوں نے کیا ہے۔ ہنری لارنس کمپنی کے مشہور رکن تھے۔ پنجاب اور اودھ میں ان کی اہم سیاسی خدمات اس عہد کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ہنری لارنس نے یہ بات واضح الفاظ میں بیان کی ہے کہ

۲۔ ولیم نائٹن (ترجمہ محمد احمد علی) شبابِ لکھنؤ ص ۳۷، لکھنؤ ۱۹۱۲ء

۳۔ سید محمد تقی احمد، مقالہ تاریخ اودھ (سہ ماہی ہندوستانی الہ آباد جنوری ۱۹۴۲ء)

ہندوستان کی کسی ریاست کے معاملات میں کمپنی نے اس تواتر اور تسلسل کے ساتھ مداخلت نہیں کی جس قدر اودھ کے معاملات میں۔ کمپنی کی مداخلت سے پیدا شدہ بدنظمی کو ہنری لارنس نے Blighting influence of interference کہا ہے۔[۴]

معاہدوں کے ذریعہ محض سلطنت اودھ کے حصے ہی چھینے نہیں گئے بلکہ بار بار "ٹیکس" وصول کیا گیا اور ریاستی فوج کی تعداد کم کی جاتی رہی جس کا اثر نظم ونسق پر بہت برا پڑا۔ انگریزوں نے بارہا اودھ کے حکمرانوں سے مال و دولت حاصل کر کے اپنی مالی دشواریوں پر قابو پایا۔ ہنری لارنس کے الفاظ میں اودھ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی مشکلات کو ختم کرنے کے لیے خزانہ کی تھیلی کی طرح استعمال کیا گیا۔[۵]

اودھ کے عمومی حالات اور اردو شاعری پر ان کے اثرات ایک باب میں پیش کیے جا چکے ہیں جن سے عہد واجد علی شاہ کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان تفصیلات سے قطع نظر ہمیں یہاں انتزاع سلطنت اودھ کے پس منظر اور اسباب تک اپنے مطالعہ کو محدود رکھنا ہے کیونکہ ہماری رائے میں یہ واقعہ "جنگ آزادی" کے محرکات میں سے ایک ہے' اور ہماری قومی تاریخ اور شاعری کے رجحانات پر اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔

بدنظمی' امور سلطنت سے بے توجہی اور عیش وعشرت' یہ ساری چیزیں واجد علی شاہ کو سلطنت اودھ کی طرح ورثہ میں ملیں۔ نوجوان شاہ نے آغاز حکومت میں حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ فوجوں کی پریڈ' دادخواہی' عدل وانصاف کے تقاضوں کو عملی شکل دینے کی سعی کی لیکن جلد ہی وہ ان معاملات کی وسعت اور مشکلات سے گھبرا کر قیصر باغ کے ہنگاموں اور رہس کی مجلسوں میں کھو گئے۔ واجد علی شاہ میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کی میراث سے اپنے آپ کو بچا سکتے۔ ہارڈنگ نے اگرچہ انہیں واضح الفاظ میں تنبیہ کی تھی لیکن واجد علی شاہ بقائے سلطنت کے لیے وفاداری کو کافی سمجھتے تھے

---

۴ حوالۂ بالا

۵ سید محمد تقی احمد' مقالہ تاریخ اودھ (سہ ماہی ہندوستانی الہ آباد جنوری ۱۹۴۲ء)

اور یوں ضبطئ سلطنت کے لیے اسباب مہیا ہوتے گئے۔

سلیمین کی رپورٹ جواس نے نومبر ۱۸۴۹ء سے مارچ ۱۸۵۰ء تک سلطنت کے دورہ کے بعد مرتب کی تھی تاریک اور سیاہ تھی۔ سلیمین (Sleeman) مداخلت کے حق میں نہ تھا لیکن اس کی رپورٹ میں ضبطئ اودھ کے امکانات کا سراغ موجود ہے۔ یہ تصور نیا نہیں تھا بلکہ اس کا امکان نصیر الدین حیدر کے عہد میں بھی اپنی جھلک دکھا چکا تھا۔ انگریزوں کا ذہن اس انداز سے سوچ رہا تھا۔ اودھ کے بارے میں کئی تجویزیں زیر غور آئیں اور ان میں سے ایک یہ تھی۔

"One plan was that the King's authority should be set aside"[٦]

''بفر اسٹیٹ'' کی حیثیت سے اودھ کی افادیت باقی نہ رہی تھی اور شاید لارڈ ڈلہوزی ۱۸۵۶ء سے پہلے ہی اودھ کی ریاست کو کمپنی بہادر کے زیر نگین لے آتا اگر وہ برما کی جنگ میں الجھا ہوا نہ ہوتا اور ایران سے الجھنے کی تیاریاں نہ کر رہا ہوتا۔ اودھ کی بدنظمی تسلیم' لیکن ضبطئ اودھ کا سبب یہ بدنظمی نہ تھی بلکہ انگریزوں کی مصلحتیں تھیں' ورنہ وہ اس بدنظمی کے اصل سبب کی طرف توجہ دیتے۔ اس اصل سبب کی نشاندہی سر ہنری لارنس نے کی تھی یعنی ''دوعملی''۔ اودھ پر شاہ اودھ اور ریذیڈنٹ دونوں فرمانروائی کر رہے تھے اور دونوں کے تصادم سے انتظامیہ کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ شاہ اودھ کو اپنی مملکت میں کیا اختیارات حاصل تھے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیجیے:

> ''ریذیڈنٹ کا رعب و داب تمام سلطنت پر بے حد چھایا ہوا تھا۔ بادشاہ سلامت ریذیڈنٹ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکتے تھے جس کا اندازہ بیان ذیل سے ہوسکتا ہے۔
>
> کتاب سیر المحتشم میں لکھا ہے کہ تخت مرصع لکھنؤ کہ غازی الدین حیدر نے کئی کروڑ روپے میں تیار کروایا تھا واجد علی شاہ نے چاہا کہ اس اورنگ

---

٦ سید محمد تقی احمد' مقالہ تاریخ اودھ (سہ ماہی ہندوستانی' جنوری ۱۹۴۲ء)

کو کوٹھی فرح بخش سے قیصر باغ میں لے آئیں۔ صاحب ریذیڈنٹ نے اس کی اجازت نہ دی''۔ ے

بہرحال جب سلطنت اودھ کی ضرورت انگریزوں کی نظر میں باقی نہ رہی تو ضبطئ سلطنت کے پرانے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا وقت ۱۸۵۶ء میں آ گیا۔ پہلے تو لارڈ ڈلہوزی نے کوشش یہ کی کہ واجد علی شاہ نام کے بادشاہ بنے رہیں اور مملکت کا مکمل انتظام کمپنی کے سپرد کر دیں اور سالانہ وظیفہ لیتے رہیں، لیکن یہ صورت ممکن نہ ہوئی۔ سلیمین اور اوٹرم کی رپورٹوں کی روشنی میں کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے یہ فیصلہ کیا کہ ''اودھ کو ممالک سرکار کمپنی میں داخل کر لیا جائے''۔

۴ فروری ۱۸۵۶ء کو اوٹرم نے بادشاہ سے ملاقات کی اور عہد نامہ پیش کیا۔ واجد علی شاہ نے اس پر دستخط نہ کیے۔ اوٹرم نے ضبطئ حکومت کا اشتہار چسپاں کر دیا جس کی رو سے ۱۸۰۱ء کا عہد نامہ ساقط ہو گیا۔ ۱۲ فروری ۱۸۵۶ء کو کانپور سے انگریزی فوج سلطنت اودھ کو کمپنی کے ''ممالک'' میں شامل کرنے کے لیے آ پہنچی۔ اوٹرم نے دربار منعقد کر کے ضبطئ سلطنت کا اعلان کر دیا۔ لکھنؤ کا ریذیڈنٹ چیف کمشنر بن گیا اور سلطنت اودھ کا چراغ گل ہو گیا۔

اُردو شاعری میں جس طرح انتزاع سلطنت سے پہلے لکھنؤ کے ہنگاموں، مجلسی رونقوں اور حسن و زیبائش کے زمزمے ملتے ہیں اسی طرح انتزاع سلطنت اودھ کے بے شمار نوحے بھی موجود ہیں۔ یہ نوحے آج ہمارے کلاسیکی ادب کا حصہ ہیں۔

واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی ''حزن اختر'' میں صرف مٹیا برج کے حالات ہی نظم نہیں کیے ہیں بلکہ انتزاع سلطنت کو بھی پسِ منظر کے طور پر شامل کیا ہے۔ یہ مثنوی واجد علی شاہ کی زندگی کے آخری ایام کی خود نوشت سوانح کا درجہ رکھتی ہے۔ حزن اختر پر مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

''بادشاہ ذی جاہ کا شمار چونکہ ان ادبی مذاق رکھنے والے تاجداروں میں ہے جنھوں نے اپنے حالات خود ہی لوح زمانہ پر لکھے ہیں لہٰذا قید خانے

ے نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ جلد ۵ صفحات ۱۹۱ لکھنؤ ۱۹۱۹ء

میں اپنے حالات اور مصائب و انقلاب عالم پر ایک مثنوی تحریر فرمائی جس کا نام ''حزن اختر'' رکھا۔ یوں تو یہ مثنوی ایک شاعرانہ کلام ہے مگر دراصل شاہ جنت آرام گاہ کی آٹوبیا گرافی یعنی خود اپنی سوانح عمری کا ایک دردناک ٹکڑا ہے۔[۸]

حزن اختر میں واجد علی ابنِ امجد علی شاہ نے انتزاع سلطنت کی داستان یوں شروع کی ہے۔

یہ واجد علی ابن امجد علی ۔۔۔ سناتا ہے اب دستاں رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے ۔۔۔ جو طالع تھے بیدار، سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر یہ یار ۔۔۔ کرو سلطنت کو خلا ایک بار

ooo

جفا کش کا شاہِ اودھ نام ہے ۔۔۔ حکومت کا آخر یہ انجام ہے
جو وہ لاٹ ڈلہوزی اس وقت تھے ۔۔۔ مضامین انہوں نے یہ خط میں لکھے
''رعایا بہت تم سے ناراض ہے ۔۔۔ تمہاری ریاست ہے بدنام شے
رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ ۔۔۔ فقط نام کے تم رہو بادشاہ
مہینہ ہر اک ماہ اک لاکھ کا ۔۔۔ ملے گا تمہیں کچھ نہیں شک ذرا''
ریزیڈنٹ جرنیل اوٹرم جو تھے ۔۔۔ گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
ہوا گھر میں کہرام سن کر یہ بات ۔۔۔ وہ دن دوپہر ہو گئی ساری رات
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج ۔۔۔ کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج
یہاں جزا طاعت نہ تھا دل میں شر ۔۔۔ نہ تھی ایسے دن کی تو ہرگز خبر

ooo

یہ جرنیل اوٹرم سے میں نے کہا ۔۔۔ ''میں جاؤں'' گا فریاد کو ہے خدا
رکھوں گا میں خود پیشِ ملکہ یہ تاج ۔۔۔ انہیں کا ہے بخشا ہوا مجھ کو راج''

---

۸ عبدالحلیم شرر، مقدمہ ''حزن اختر''، لکھنؤ ۱۹۲۲ء۔

مندرجۂ بالا اقتباس سے شاہ اودھ کی زبانی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ضبطیٔ سلطنت سے پہلے انہیں برائے نام بادشاہ بنے رہنے کی پیش کش کی گئی تھی اور آخری دو شعروں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معزول شاہ اودھ لندن جانے کے ارادے سے لکھنؤ سے نکلے تھے، پھر اپنی علالت کی وجہ سے میٹا برج میں ایک نئی تہذیبی مجلس آراستہ کی۔ مگر جیسا کہ انہوں نے ہمیں حزن اختر میں بتایا ہے ملکہ کی خدمت میں اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے انہوں نے سفیر بھیجے تھے۔ واجد علی شاہ کے عزمِ لندن سے لکھنؤ والے بھی واقف تھے۔ ناسخ کے شاگرد شہید نے یہ شعر اسی موقع پر کہا تھا:

لکھنؤ بیکس ہوا حضرت جو لندن کو گئے   ہم یہاں نالاں ہیں وہ فریاد دشمن کو گئے

لکھنؤ والے مدتوں حقائق سے نگاہیں چراتے رہے۔ وہاں کے مکانوں، چائے شانوں اور افیون خانوں میں مدتوں واجد علی شاہ کی واپسی کے امکانات پر بحثیں ہوتی رہیں۔

"لکھنؤ میں مدتوں تک ان کی واپسی کا انتظار ہوتا رہا۔ وہی شاعر (شہید) کس حسرت سے کہتا ہے۔

فصل گل کب آئے گی، کب ہوں گے آ کر نغمہ زن
ایک مدت ہو گئی مُرغانِ گلشن کو گئے

مگر لکھنؤ کے گلشن میں وہ بہار پھر نہ آئی اور مرغانِ گلشن کے وہ نغمے پھر سنائی نہ دیئے"[9]

۱۳ مارچ ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ لکھنؤ سے رخصت ہوئے۔ قیصر باغ کی ہوائیں نوحہ خوانی کر رہی تھیں۔ "رہس والیان" اور "جلسہ والیان" آنسو بہا رہی تھیں اور انگریزوں کو کوسنے دے رہی تھیں۔ لکھنؤ والوں پر پیا جان عالم کے رخصت ہوتے وقت کیا بیتی اُس کا ایک خاکہ چشم دید گواہوں کے اشعار کی مدد سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ہم واجد علی شاہ کی مثنوی حزن اختر کی مدد سے اس سفر کے مختلف مرحلوں اور

---

۹ مسعود حسن رضوی، اردو ڈراما اور اسٹیج، ابتدائی دور کی مفصل تاریخ، صفحہ ۱۶، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء

منزلوں کو دیکھیں گے۔ لکھنؤ سے روانگی اور کانپور پہنچنے اور وہاں اپنے قیام کا ذکر واجد علی شاہ یوں کرتے ہیں۔

رجب کی ہوئی پانچویں جبکہ یار ‏ ‏ شب پنجشنبہ ہوئی آشکار
کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر ‏ ‏ لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر
رجب بھر رہے کان پُر میں مقیم ‏ ‏ برنڈن کے بنگلے میں باخوف و بیم

کانپور سے الہٰ آباد ہوتے ہوئے واجد علی شاہ بنارس پہنچے۔ بنارس کے راجہ نے اس پر آشوب زمانے میں جبکہ معزولی کے بعد پروردگان دامن اور ''بیگمات'' نے آنکھیں پھیر لی تھیں وفاداری کی نادر مثال پیش کی۔

بنارس میں آ کر رہے چودہ روز ‏ ‏ وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز
بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ ‏ ‏ اتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ
وہ مصروف خاطر ہوا اس قدر ‏ ‏ فرشتہ بنا' کہنے کو تھا بشر

سات رمضان کو واجد علی شاہ کلکتہ پہنچے۔

دکھائی دیا جب کہ ماہ صیام ‏ ‏ تو کلکتہ میں آئے اے نیک نام
جو گنیے تو تاریخ تھی ساتویں ‏ ‏ کہ داخل ہوئے ہم ملول و حزیں

کلکتہ میں واجد علی شاہ بیمار پڑ گئے۔ معزول بادشاہ نے اپنے جسم و ذہن کو اتنا ناتواناں پایا کہ خود لندن نہ جا سکے اور ملکہ کے حضور اپنی والدہ' بھائی اور بیٹے کو بھیجا۔ ماہ شوال کی ۱۴ تاریخ کو یہ سفیر عازم لندن ہوئے۔

جو تاریخ اس کی ہوئی چودھویں ‏ ‏ کیا بیٹا' ماں' بھائی رخصت وہیں
کہ تم میری جانب سے لندن کو جاؤ ‏ ‏ جو گزری ہے مجھ پر مَلِک کو بتاؤ
روانہ ہوئے تینوں لندن کو جب ‏ ‏ اکیلا رہا میں یہاں با تعب

حزنِ اختر کے مندرجہ بالا اشعار میں واقعیت زیادہ ہے' جذبہ کی آنچ نہیں۔ اپنے زوال اور حکومت سے محرومی کا ذکر ایک معزول بادشاہ ایسے دھیمے دھیمے لہجے میں کرے؟ اس پر تعجب سا ہوتا ہے۔ حزن اختر میں جہاں واجد علی شاہ نے اپنی بیگمات کی

بے وفائی و بے اعتنائی کو پیش کیا ہے وہاں ایسا لگتا ہے جیسے ان کا سینہ آتش کدہ ہے اور منکوحہ و ممتوعہ عورتوں سے جدائی کا غم سلطنت سے محرومی کی نسبت زیادہ شدید ہے۔ اس کی وجہ واجد علی شاہ کی افتادِ طبع میں تلاش کی جا سکتی ہے یا پھر یہ ممکن ہے کہ قیدِ فرنگ کو انہوں نے نوشتۂ تقدیر سمجھ لیا ہو اور جب وہ قید بے وفائیوں کی وجہ سے زیادہ کٹھن ہو گئی تو وہ ضبط نہ کر سکے۔

حزنِ اختر کے علاوہ بیگمات کے نام واجد علی شاہ نے جو خطوط لکھے ان میں انہوں نے اپنے سفر کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے اس میں زیادہ اثر' جذبہ اور سوز و گداز ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مثنوی میں شاہ معزول نے شعوری طور پر نظم و ضبط سے کام لیا ہو۔ فن صرف اظہار سے عبارت نہیں ہے چھپانا بھی فن کا ایک روپ ہے۔ لیکن ذاتی خطوں میں ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ پھر خط بھی کن کے نام؟ ان کے نام جن کی جدائی دل کو جلا رہی ہو۔

عشق تو وہ چیز ہے بقول واجد علی شاہ۔

یہ وہ عشق ہے شمع میں گر سمائے   قیامت تلک محفلوں کو جلائے
یہ وہ عشق ہے گر بنے راہ زن   نہ چھوڑے کبھی مُردگاں کا کفن

حزن اختر میں کان پور میں برنڈن کے بنگلہ کے سلسلے میں وہ صرف یہ لکھتے ہیں۔

رہے جب بھر کان پُر میں مقیم   برنڈن کے بنگلے میں باخوف و بیم

لیکن کلکتہ سے ایک بیگم کے نام خط میں جب واجد علی شاہ اپنے قیام کانپور کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے لہجے میں زیادہ درد ہے' خوف و بیم کی تشریح ہے' ایک ایسی کسک ہے جس میں قیصر باغ کی فضاؤں کی یادیں چھپی ہوئی ہیں۔

لکھنؤ سے چلے جو ہم اے جاں   کانپور میں ملا غضب کا مکاں
وہ برنڈن کا ایک بنگلہ تھا   اپنی ٹوپی سے بھی تھا تنگ سوا (کذا)
رات دن سب کے دل میں خطرۂ جاں   پاؤں پھسلے تو پھر عدم کو رواں

الٰہ آباد سے بنارس جاتے ہوئے دریا کو پار کرتے ہی گاڑی کے پہیے ریت میں

دھنس گئے، جان عالم جن کے ہاتھوں میں ہمیشہ پھولوں کے گلدستے یا نازنینوں کی کلائیاں رہی تھیں، گاڑی کو ریت سے نکالنے کے لیے دھکے لگانے پر مجبور ہو گئے۔ کلکتہ پہنچ کر ملکہ سیم تن کے نام اپنے خط میں اس واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

چرخ گاڑی کا پھنس گیا گِل میں ساتھ دھچکا پہنچ گیا دل میں
جعفری بیگم اس میں تھیں ہمراہ دل یہ بولا ہوئے یہیں پہ تباہ
آخرش ہم اتر پڑے نیچے پہیئے گاڑی کے ہاتھ سے کھینچے

واجد علی شاہ کی معزولی اور انتزاع سلطنت اودھ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے اس عہد کے شاعروں کو بے حد متاثر کیا۔ جن فنکاروں نے قیصر باغ میں اندر کے اکھاڑے دیکھے تھے، پریوں کے حُسنِ و جمال کے ترانے گائے تھے، جنھوں نے لکھنؤ کی نازنینوں کے حسن کے سامنے حسن زلیخا کو افسانۂ کہن سمجھا تھا، جن کے لیے دربار واجدی دارالامن تھا وہ بھلا اس دربار کے اجڑنے سے متاثر کیسے نہ ہوتے۔ واجد علی شاہ فنونِ لطیفہ کے سرپرست تھے۔ شاعری، رقص و سرود، مطالعہ و کتب بینی کی ان کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔ اگر اُم الفنون یعنی عورت کا اضافہ اس فہرست میں کر دیا جائے تو ہم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی انہیں چیزوں سے عبارت تھی۔ واجد علی شاہ کے بیان کے مطابق ان کے دربار سے سترہ سو ادباء و شعراء وابستہ تھے۔ حزن اختر میں کہتے ہیں۔

فقط سترہ سو تھے اہلِ قلم طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم

صفیر لکھنوی واجد علی شاہ کے وفادار ساتھی اور مصاحب تھے۔ وہ ان وفاداروں میں تھے جنھوں نے اپنی زندگی اور مستقبل کو معزول شاہ اودھ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ وہ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ گئے تھے۔ انھوں نے اپنی طویل مثنوی میں واجد علی شاہ کے سفر کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ۱۳ مارچ ۱۸۵۶ء کو جب واجد علی شاہ نے وادیٔ غربت میں قدم رکھا تو لکھنؤ اور حرم پر کیا بیتی؟ اس کو صفیر نے یوں نظم کیا ہے۔

یہ سرکش دمِ گریہ نالے ہوئے کہ لبریز اشکوں کے تھالے ہوئے
درِ باغ تک آئے اہلِ حرم بہاتے ہوئے چشم سے اشکِ غم

دُعا شاہ کو کوئی دینے لگی بلائیں کوئی بڑھ کر لینے لگی

OOO

کئے تھی کوئی سایہ قرآن کا کہ اللہ حافظ رہے جان کا
کسی نے کہا خط تو لکھنا ہمیں کہ دے گا کچھ آرام نامہ ہمیں
چلے ہو دل عاشقاں توڑ کر نہ جاؤ ہمیں نیم جاں چھوڑ کر

OOO

ذرا شاہ ڈیوڑھی سے باہر کو جائیں کریں گے اکیلے مکاں سائیں سائیں
ہمیں اپنے سائے سے ہول آئیں گے اکیلے مکانوں میں ٹکرائیں گے
خدا کے لیے ساتھ لے لو ہمیں تڑپتا بلکتا نہ چھوڑو ہمیں
کہا شہ نے کس کس کو میں لے چلوں سفر کی درازی سے مجبور ہوں
نہ گھبراؤ میں پھر کے جلد آؤں گا اگر دیر ہو گی تو بلواؤں گا
غرض سب کو تسکین دیتے چلے چپ وراست تسلیم کرتے چلے

صفیر کا یہ بیان محض تخیلی نہیں اور نہ محض شاعرانہ مبالغہ سے انہوں نے کام لیا ہے۔ چمن سے بوئے گل نے رخت سفر باندھا تو چمن پر اُداسی چھا گئی۔ برطانوی استبداد کے اس دور میں بھی اخباروں نے اپنی رپورٹوں میں لکھنؤ کی بے رونقی و بربادی کو پیش کیا ہے مثلاً:

> ''لکھنؤ میں بسبب مہاجرت بادشاہ کے بڑی بے رونقی ہوگئی ہے جہاں بازار میں بادشاہی نقیب اور چوبدار اور اہلیانِ دربار نظر آتے تھے اب ان کی بجائے صاحبانِ انگریز نظر پڑتے ہیں۔ محل شاہی کہ جہاں تمام شہر سے زیادہ رونق رہتی تھی اور ہزار ہا آدمی باشان وشوکت موجود ہوتے تھے اب خالی نظر آتے ہیں۔ دروازے ان کے بند ہیں۔ سنسنان معلوم ہوتے ہیں۔''[10]

---

۱۰ اخبار کوہِ نور لاہور ۲۵ مارچ ۱۸۵۶ء (بحوالہ رئیس احمد جعفری' واجد علی شاہ اور ان کا عہد)

واجد علی شاہ جب بنارس پہنچے تو مہاراجہ بنارس پا پیادہ ان کی سواری کے ساتھ چلے اور ان کا استقبال یوں کیا جیسے کسی با اختیار بادشاہ کا کیا جاتا ہے۔ بنارس والوں نے بھی دیدہ و دل فرش راہ کیا۔ اہل بنارس واجد علی شاہ کی زیارت کے لیے بے قرار تھے مگر انہیں اپنی معزولی و بے چارگی کا بے حد احساس تھا اور وہ عوام کے سامنے بے چارگی کی تصویر بن کر نہ آنا چاہتے تھے۔ اس کیفیت کو بھی صفیر نے اپنی مثنوی میں پیش کیا ہے۔

ہزاروں تھے مشتاقِ دیدارِ شاہ   تمنا میں آتے تھے شام و پگاہ
مگر بادشاہ کو یہ منظور تھا   کہ بعدِ حصولِ دُرِ مدعا
اسی راستہ سے اگر آئیں گے   تو جاہ و حشم سب کو دکھلائیں گے

خواجہ ارشد علی خاں معروف بہ خواجہ اسد اللہ' مخاطب بہ آفتاب الدولہ' قلق تخلص نے ایک طویل سفر آشوب واجد علی شاہ کے سفر (لکھنؤ تا کلکتہ) کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ سفر آشوب مسدس کے فارم میں لکھا گیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی مرحوم کے پاس قلق کا ایک خودنوشت کلیات موجود تھا جس میں یہ سفر آشوب بھی تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے یہ سفر آشوب اُردوئے معلٰی سنہ ۱۹۰۲ء میں اپنے نوٹ کے شائع کیا تھا۔ اس سفر آشوب میں ۹۱ بند تھے جن میں سے چند بند مولانا نے شائع کرتے وقت حذف کر دیئے تھے اور اس کی وضاحت بھی کر دی تھی مثلاً سولہویں بند کے بعد انہوں نے یہ نوٹ لکھا ہے۔

"اس موقع پر شاعر نے نہایت سخت الفاظ میں انگریز منتظم اور مالک ہوٹل کی شکایت کی ہے جس نے بوقت رخصت کرائے کے لیے بادشاہ کی بگھی کو روکنے کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے اس قضیۂ ناگوار کے متعلق چند بند حذف کر دیئے ہیں۔"[1]

قلق کے اس شہر آشوب کا عنوان حسب ذیل ہے۔

"سفر آشوب متضمن کیفیت سفر سلطان عالم محمد واجد علی شاہ"

---

[1] مولانا حسرت موہانی' رسالہ اردوئے معلٰی علی گڑھ ۱۹۰۲ء

قلق کے اس سفر آشوب کا فنی درجہ مثنوی حزن اختر اور صفیر لکھنوی کی مثنوی سے مجموعی طور پر بلند تر ہے۔ قلق واجد علی شاہ اور صفیر لکھنوی سے زیادہ بلند مرتبہ شاعر تھے، ان کے دیوان میں "بامزہ" اشعار کافی ہیں۔

> "زمانہ شاہی کے دورِ آخر میں لکھنؤ کے دوم درجہ کے شاعروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور اپنے ماموں خواجہ وزیر کے اچھے شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے...... قلق کی مشاقی اور استادی میں کوئی شبہ نہیں"۔[۱۲]

> "بامزہ اشعار کی تعداد ان کے دیوان میں کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخیت کا اثر کچھ کم قبول کرتے ہیں"۔[۱۳]

قلق کے شہر آشوب کی تمہید بڑی جاندار ہے۔ دل کے درد کو لکھنؤ کی صناعی کے لباس میں پیش کیا ہے۔ واجد علی شاہ اور صفیر لکھنوی کی طرح قلق بھی مہاراجہ بنارس کے حُسنِ اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے اور سفر آشوب کے سات بندوں میں بنارس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد دریائی سفر اور طوفان کا ذکر ہے۔ کلکتہ میں واجد علی شاہ نے قید فرنگ میں اپنے ابتدائی دن جس طرح گزارے اس کو قلق نے بڑی تلخی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غریب واجد علی شاہ نے حزن اختر میں کرنیل کو نیا صاحب بہادر کی صفت میں کئی اشعار کہے ہیں، جن کی بدولت انہیں خس کی ٹٹی اور آٹھ سیر برف روزانہ نصیب ہوئی۔ کرنیل صاحب نے از راہِ کرم پنکھوں کا بندوبست بھی کر دیا تھا اور قلی بھی مہیا کر دیے تھے۔ دیکھیے سابق شاہ اودھ کس طرح ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

هوئیں ٹٹیاں خس کی مجھ کو نصیب — الٰہی جلیں غم سے اس کے رقیب
ملا کرتی ہے برف بھی آٹھ سیر — یہ کیا جان جو ہووے ذرا اس میں دیر
لگے ہیں کشادہ عجب بادکش — کہ دل جن کی جھالر پہ کرتا ہے غش
مہیّا قلی رات دن کام کو — خدا رکھے کرنیل کے نام کو

۱۲ حوالۂ بالا

۱۳ ابو اللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، صفحہ ۲۶۱، طبع دوم

لیکن قلق اس بات پر کڑھتے ہیں کہ جس کے حکم سے ہر سال سینکڑوں خس خانے تیار ہوتے تھے وہ آج ایک خس کی ٹٹی کے لیے حکام کا ممنونِ کرم ہوتا ہے، جس کے غلاموں کے گھر میں برف کے انبار لگے رہتے تھے، وہ آٹھ سیر برف کے لیے غیروں کا محتاج ہے۔

قلق کے شہر آشوب میں شعری لطافت کے ساتھ ساتھ ایسی تلخی بھی ہے جسے حسین الفاظ بھی چھپا نہیں سکے۔ انگریزوں کے اقتدار کے ''اس عہد زریں'' میں بھی قلق انہیں برا کہنے میں نہیں جھجکتے۔ ان کا ذہن اور قلم انگریزوں کے راج کو آئین تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ انگریز ان کے نزدیک ملک کے فرمانروا نہیں تھے بلکہ غیر تھے اور ان کی حکومت مداخلت غیر تھی اور واجد علی شاہ کی فرمانروائی سے علیحدگی ایک غیر آئینی قدم تھا۔ وہ لکھنؤ واپس آ کر بھی واجد علی شاہ سے یوں خطاب کرتے ہیں۔

اے مرے مجرم بے جرم و خطا میں صدقے

اس سفر آشوب کی روشنی میں قلق لکھنوی ہمیں واجد علی شاہ کے عاشق وشیدا اور وفاداری کا مجسمہ نظر آتے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ انہیں قید فرنگ میں چھوڑ کر لکھنؤ واپس چلے آئے اور ''وفاداری بشرط استواری'' کا ثبوت نہ دیا۔ ویسے لکھنؤ کی واپسی سے متعلق ان کے سفر آشوب میں جو بند ہیں ان میں بھی واجد علی شاہ سے گہری وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قلق کے اس سفر آشوب کے منتخب بند ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

تمہید

کیا کروں حال میں اظہار، نہ چھیڑو مجھ کو
درد فرقت کا ہوں بیمار، نہ چھیڑو مجھ کو
ہوں مصیبت کا گرفتار، نہ چھیڑو مجھ کو
پکّا پھوڑا ہے دلِ زار، نہ چھیڑو مجھ کو

میرا افسانہ ہو اظہار کے قابل تو کہوں
میرے قابو میں اگر ہووے مرا دل تو کہوں
شہر سے جبکہ مقدر نے نکالا ہم کو
سخت آفت، عجب اندوہ میں ڈالا ہم کو
کر دیا مثلِ زمانہ تہ و بالا ہم کو
یہی کہتا تھا ہر اک دیکھنے والا ہم کو
"بلبلِ ہند اب آوارہ وطن ہوتا ہے
حیف صد حیف کہ ویراں یہ چمن ہوتا ہے"
تالبِ گنگ جو وہ خسروِ یکتا جائے
تو تو ہمراہِ رکاب ایک زمانہ جائے
سفرِ وادئ اندوہ جو پیش آ جائے
ایک بگھی پہ وہی یکّہ و تنہا جائے
گھر سے باہر بھی جو اپنے نہ کبھی نکلا ہو
وہ گل حسن ہو اور منزلوں کا صحرا ہو

کانپور سے الٰہ آباد

چند دن بعد جو کمپو سے ہوئے شب کو سوار
ہو گیا کاٹنا رستے کا سحر تک دشوار
دن چڑھے پہنچے جو تربینی پر آ کر یک بار
دھوپ کی گرمی سے گلنار ہوئے تھے رخسار
فرط ایذا سے نہ ملنے کا تھا یارا اس وقت
تھام کر ہاتھوں کو بگھی سے اتارا اس وقت
اترے اس کوٹھی میں آ کر مع ساز و سامان
لکھی تھی جو برٹن نے کرائے کو وہاں

حال کچھ اس کی خرابی کا بھی کرتا ہوں بیاں
جو نجھ ابابیلوں کی اور چھت کے ٹپکنے کے نشاں
ڈھیر خاشاک کے تھے چاروں طرف جالے تھے
دھوپ چھنتی تھی، وہ ٹوٹے ہوئے پر نالے تھے

بنارس

چند دن بعد بنارس میں تو پائی راحت
واں کے راجہ نے بڑی ختم کی انسانیت
اپنے مالک کی ہر اک طرح ادا کی خدمت
شاہ کے آنے کی تھی دل میں جو اس کے حسرت
شادی و فرح سے پھولا نہ سماتا تھا وہ
اپنے جامے ہی سے باہر ہوا جاتا تھا وہ

کلکتہ۔قید فرنگ

اور اس چرخِ ستم گر کے سُنیے نیرنگ
شاہِ غربت زدہ پر دیکھیے بیداد کے ڈھنگ
ایسا پروردۂ ناز و نعم اور قیدِ فرنگ
بوئے گل سے بھی جو ہو جانِ نزاکت دل تنگ
مثل بلبل وہ گرفتار قفس میں ہو جائے
خود جو حاکم ہو وہ یوں غیر کے بس میں ہو جائے
ہر برس سینکڑوں خس خانے ہوں جس کے طیار
ایک ٹٹی کا وہ حکام سے ہو شکر گزار
برف کا جس کے غلاموں کے ہو گھر گھر انبار
آٹھ سیر اس کو کرے برف عنایت سرکار

کیا کہوں حال میں اس وقت کہ ہے کیا میرا
شق ہوا جاتا ہے اس غم سے کلیجا میرا

لکھنؤ کی نوابی یا بادشاہی ایک تہذیبی اشارہ بن چکی تھی۔ سلطنت اودھ کو مولانا عبدالحلیم شرر نے بجا طور پر ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' قرار دیا ہے' اس تمدن کا اندازہ مولانا شرر کی مفصل کتاب' فسانۂ عجائب کے دیباچہ' فسانۂ عبرت کے بیانات اور فسانۂ آزاد کی فضا سے ہو سکتا ہے۔ سلطنت اودھ کے سورج کے غروب ہو جانے کے بعد بھی افق پر جو سرخی عرصہ تک چھائی رہی اس میں بھی اس سورج کی تابانیوں کی دھندلی سی جھلک موجود تھی۔ وہ جھلک جو امراؤ جان ادا کی صورت میں مجسم ہو گئی ہے۔ اس تمدن کا خاکہ ادبی دستاویزوں کی مدد سے گزشتہ ابواب میں پیش کیا جا چکا ہے۔

چراغ بجھنے سے پہلے ایک بار ضرور بھڑکتا ہے اور اس کی روشنی فضا میں گویا نور کی محراب تخلیق کر دیتی ہے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ایک طرف تو ارباب کمال کا اجتماع تھا اور دوسری طرف اس تمدن اور اس کے مظاہر کی جلوہ گری عوام کی زندگی میں بھی نظر آتی تھی۔ قیصر باغ ہی میں نہیں بلکہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں دولتِ بیدار لٹ رہی تھی۔ پائلیں چھنک رہی تھیں اور رقص کے دائرے بن رہے تھے۔ دربار شاہی سے حکیم' ادیب' شاعر' موسیقار' رقاص' جلسے والیاں' خواجہ سرا اور بھانڈ ہی وابستہ نہ تھے بلکہ کبوتر باز' سائیس' کوچوان' فیل بان' بٹیر باز' داستان گو بھی اس دربار سے منسلک تھے۔ ہاتھی اور گھوڑوں کا ذکر چھوڑیے کبوتروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ ان جانوروں کے خادم تو مستقل ملازم تھے' ان کی تنخواہ کا حساب کون لگائے۔

جانوروں کی خوراک کے لیے بارہ سو روپے روزانہ خرچ ہوتے تھے۔ ان بازیوں کو چاہے شوق فضول قرار دیجیے یا زوال کی علامت' مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ جانوروں کے طفیل انسانوں کے پیٹ پل رہے تھے' کتنے ہی گھروں میں چولہے گرم تھے جن کا دھواں خوشحالی کی سانس معلوم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کمپنی بہادر کو ان بازیوں سے کیا دلچسپی تھی وہ تو ایک ہی بات کی قائل تھی یعنی توسیع حدود مملکت سے۔ واجد علی شاہ کی

معزولی کے ساتھ ہاتھی، گھوڑے، کبوتر، بٹیر وغیرہ بیچ دیے گئے۔ ملازمین علیحدہ کر دیے گئے۔ چولہوں کی آگ خاکستر بن گئی۔ بیکاری کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اخبار ''کوہ نور'' لاہور کے ایک ''کارسپانڈینٹ'' نے اپنے اخبار کو خبر بھیجی کہ

''میں نے تخمینہ کیا ہے کہ ضبطئی اودھ سے سات آٹھ لاکھ آدمی بے چارہ اور بے روزگار ہو گئے''۔[14]

یہ ہے وہ پس منظر جس سے یہ بات سمجھ آ سکتی ہے کہ واجد علی شاہ کے جانے کے بعد بھی ان کی یادوں کے کنول لکھنؤ والوں کے دلوں کی گہرائیوں میں کیوں تیرتے رہے۔ کتنے ہی لوگ ان کی واپسی کی توقع کے سہارے اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے اور حال کی تلخیوں کو کم کر رہے تھے۔ زندگی لاکھ سنگین حقیقت سہی لیکن ایسی ذہنی مفاہمتوں اور کبھی کبھی خود فریبی کے بغیر کٹتی بھی نہیں۔

''واجد علی شاہ تو چلے گئے مگر اُن کی یاد شہر کے ہر مرد و زن کے قلب و جگر پر تیر و خنجر کا کام کر رہی تھی۔ ان کے فراق پر غزلیں تصنیف ہو گئیں، گیت بنائے گئے۔ ڈنڈے والوں اور بھاٹوں نے اپنے مذاق کی نظمیں گلیوں گلیوں پھر کر سنانا شروع کیں اور کوئی گھر نہ تھا جس میں عورتیں یہ غزل نہ گا رہی ہوں، جس کا ایک شعر یہ تھا۔

واجد علی پیارا کلکتہ کو سدھارا
سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے[15]

لکھنؤ کے ادیب اور فنکار جب شاہی محلات اور عمارتوں کو دیکھتے تو انہیں دربار شاہی سے اپنا تعلق یاد آ جاتا اور آہیں شعر کے ڈھانچے میں ڈھل جاتیں۔ پھر کمپنی کے تسلط کے ساتھ زندگی کا انداز بدلنے لگا تھا۔ کل کے فنونِ لطیفہ تضیع اوقات و اسراف کا ذریعہ سمجھے جا رہے تھے۔ وہ لوگ جنہیں پرانی قدریں اور روایتیں عزیز تھیں بیتے ہوئے

---

[14] حوالہ رئیس احمد جعفری، واجد علی شاہ اور اُن کا عہد۔

[15] عبدالحلیم شرر، سلطان عالم واجد علی شاہ، صفحہ ۱۱، ادارہ فروغ اُردو لاہور

دنوں کو یاد کرتے رہتے۔ یہ سلسلہ ہمارے شعر و ادب کی دنیا میں برسوں جاری رہا۔

واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں اپنی ایک نئی چھوٹی سی دُنیا بنائی۔ وہ دنیا جس کے فیض کے طور پر بنگال میں اُردو شعر و ادب کا ذوق عام ہوا اور جو لکھنؤ کے بعد مختصر پیمانے پر ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' تھی۔

واجد علی شاہ کا ذوقِ شعر گوئی مٹیا برج میں بھی جاری رہا۔ ان کے آخری دور کے کلام میں ''یادِ ایام عشرت ماضی'' کے ساتھ ساتھ دردمندی جیسے آبلہ بن کر پھوٹ بہی ہے۔

زمانہ تھا پیا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پر اب ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے

چمن سے پھینک دیا میرا آشیاں کیا خوب   نہال مجھ کو کیا آ کے باغباں! کیا خوب

جس طرح لکھنؤ والے مدتوں ''واجد علی پیارے'' کے منتظر رہے اُسی طرح خود واجد علی شاہ بھی لکھنؤ کی واپسی کا خواب دیکھتے رہے۔

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں   لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

اور جب دوبارہ لکھنؤ دیکھنے کی یہ تمنا بھی ایک سراب معلوم ہونے لگی تو واجد علی شاہ دیارِ غیر میں اپنے پرانے احباب کی ملاقات ہی کو اپنی زندگی کی متاع سمجھنے لگے۔

وہ وطن یاد ہے غربت میں وہ سارے احباب
ہائے کب مجھ سے ملیں گے مرے پیارے احباب

حامد علی مرزا کوکب اودھ کے ولی عہد تھے اور ہنر کے شاگرد۔ مرزا کوکب نے نہ جانے اپنی بادشاہت کے کتنے خواب دیکھے ہوں گے' لیکن جس انجمن کا انہیں صدر نشین بننا تھا وہ اجڑ گئی۔ خود وہ ایسے آوارہ وطن ہوئے کہ انہیں اپنا ''نشان'' اور ''پتا'' بھی ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔ مٹیا برج میں وہ بھی شاعری کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے۔

نشان بھی اب نہیں چمن کا   نہ ذکر باقی ہے انجمن کا

ہم ایسے آوارۂ وطن کا نہ کچھ نشان ہے نہ کچھ پتا ہے

برقؔ لکھنوی کے بھتیجے صولتؔ کے کلام کو علامہ نظم طبا طبائی نے مرتب کیا تھا۔ صولت کے یہاں بھی لکھنؤ کی واپسی کا خواب الفاظ کے پیکر میں نظر آتا ہے۔ صولت کے نزدیک تو لکھنؤ واجد علی شاہ اختر کی ذات سے عبارت تھا۔ وہ پردیس میں لکھنؤ کو ''اختر نگر'' ہی کہتے ہیں اور اختر کے بغیر ''اختر نگر'' واپس لوٹنا انہیں بے معنی سا معلوم ہوتا تھا۔

یہ دل میں مانی ہے ہم نے منت وطن میں کس کو دکھائیں صورت
بغیر شاہ اودھ کے صولت کبھی نہ اختر نگر کو چلیے

انیس مدّاحِ اہل بیت تھے۔ مدحِ اہلِ بیت ان کے لیے سرمایہ دل و جان تھی۔ شاہِ اودھ اور نوابین اودھ ان کی کفش برداری کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے لیکن جب وہ سلطنت ہی نہ رہی تو انیس کی مجلس ہائے عزا بھی درہم برہم ہو گئیں۔ ان کے دل سے بے ساختہ اجڑی ہوئی سلطنت کی آبادی کی دعا نکلی۔

کیونکر دل غم زدہ نہ فریاد کرے جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ اب خداوندکریم اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

امیر مینائی واجد علی شاہ کے دربار سے چار سال وابستہ رہے تھے۔ شاہ مینا اور فرنگی محل سے وابستہ شاعر کی طبیعت میں تقویٰ تھا' رندی و ہوسنا کی نہ تھی' لیکن' واجد علی شاہ کے دربار میں متضاد طبائع کے افراد کے لیے گنجائش بھی تھی اور ان کا احترام بھی۔ امیر مینائی کو واجد علی شاہ کی ذات سے جو عقیدت اور وابستگی تھی اس میں شاہ اودھ کے حسن سلوک کا بھی دخل تھا۔

ہے اگر گردوں مخالف' غم نہیں مجھ کو امیر ہوں میں ظلِ دامنِ شاہِ ابوالمنصور میں

واجد علی شاہ کے بعد اور ان کے بغیر امیر کے نزدیک لکھنؤ ایک شہر نہ تھا' لفظ بے معنی تھا۔

ہے لکھنؤ کی جان تو کلکتہ میں امیر خاک آئے میری آنکھ کو اب لکھنؤ پسند

منیر شکوہ آبادی نے زندگی کے کتنے ہی ماہ و سال فرخ آباد' باندہ' الہ آباد' کلکتہ (بعد ازاں جزیرہ انڈمان اور رامپور) میں گزارے لیکن قیصر باغ کی ہوائیں انہیں ہمیشہ یاد آتی رہیں۔ ۱۸۵۶ء میں انتزاع سلطنت اودھ اور ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے واقعات کے درمیان زیادہ فصل نہیں ہے' اس عہد کی شاعری کے بعض حصوں کے پس منظر کو سمجھنے میں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے مثلاً دبیر کی کئی رباعیاں بظاہر انتزاع سلطنتِ اودھ سے متعلق معلوم ہوتی ہیں لیکن حیات دبیر کے مطالعہ کے بعد ان کا رشتہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے بعد دبیر کے مختلف سفروں سے قائم ہو جاتا ہے۔ ہم نے اسی لیے دبیر کی ان رباعیوں کو اس باب میں شامل نہیں کیا۔ وہ رباعیاں جن میں لکھنؤ سے وابستگی کا اظہار بھی ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد کی بے سرو سامانی اور انتشار کے نقشے بھی۔ اسی طرح امیر مینائی کے اس شعر کو ہم نے ان کے حالاتِ زندگی سے متعلق قوی شہادتوں کی بنا پر ۱۸۵۷ء سے متعلق جان کر اس باب میں پیش نہیں کیا ہے۔

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے

لیکن منیر شکوہ آبادی کے یہاں بیگمات اور شہزادیوں کی خانہ خرابی اور ''شاہانِ سلیمان منزلت'' کی بربادی کا تذکرہ انتزاعِ اودھ سے زیادہ متعلق معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ذیل کے شعر ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے گئے ہوں اور دونوں اثرات یکجا ہو گئے ہوں' مگر ان اشعار کے بنیادی اور مجموعی تاثرات کے پیش نظر انہیں ہم اس باب میں بھی پیش کرتے ہیں۔ اگلے باب میں بھی منیر کے دوسرے متعلقہ کلام کے ساتھ اس مسلسل غزل کے چند اشعار دہرائے گئے ہیں۔

ہو گئے برباد شاہانِ سلیماں منزلت
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا
بیگمیں' شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
اب چڑیلیں صاحبانِ قصر وایواں ہوں تو کیا
بجھ گئیں شمعیں' جلیں پروانے تو کیا فائدہ
اڑ گئے پروانے' شمعیں نور افشاں ہوں تو کیا

لکھنؤ کے کتنے ہی شعراء نے اپنی بزم کے اجڑنے کے ماتم کو شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس ماتم میں تہذیبی پہلو زیادہ نمایاں ہے' لیکن اسی کے ساتھ ساتھ خارجی تبدیلیوں اور تباہیوں کا بھی ذکر ہے۔ بعض شاعروں نے وضاحت کے ساتھ اس واقعہ کے تاثرات کو نظم کیا ہے اور بعض نے غزل کی ایمائیت اور اشاریت کے ساتھ "موسم گل" "آشیاں"، "آسماں"، "صیاد"، "بلبل" یہ سارے اشارے اس پس منظر میں واقعات بن جاتے ہیں۔ یہ صیاد روایتی نہیں ہے بلکہ

غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیاد

ظاہر ہے کہ یہ صیاد "انگریز" ہے۔

میاں امان علی سحر لکھنوی نے واقعاتی انداز اختیار کیا ہے اور میر یار علی رند لکھنوی نے غزل کی ایمائیت اور اشاریت کے سہارے اپنے چمن کے اجڑنے کا ماتم کیا ہے۔ دونوں کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

عجیب مجمعِ اہلِ کمال تھا افسوس — ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا
نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وردیاں نہ گجر — نہ توپ چلتی ہے اب' ہے غضب کا سناٹا

(میر امان علی سحر)

اجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا — الٰہی! ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
چمن میں رکھا نہ بلبل کا نام تک باقی — خدا کرے یوں ہی ہو جائے بے نشاں صیاد
مرے بیاں کو سن سن کے کانپ کانپ اٹھا — غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیاد

(میر یار علی رند)

رند کے یہاں جذبہ کتنا شدید ہے، "خدا کرے یونہی ہو جائے بے نشاں صیاد" اور ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ یہ دعا قبول ہو ہی گئی۔

لکھنؤ کے یہ ماتم گسار صرف لکھنؤ کے باشندے ہی نہ تھے۔ میرزا غالب جو اپنے اور انسان کے ماتم گسار تھے۔ جنہوں نے اپنے زمانہ' انسان اور دلی کے ماتم کی خاطر اس تمنا کا اظہار کیا تھا۔

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اس غالب کے یہاں ۱۸۵۶ء کے بہت بعد تک ''انتزاعِ سلطنت اودھ'' کا ذکر نظر آتا ہے۔ میاں داد خاں سیّاح کے نام ایک خط میں ۳ جون ۱۸۶۰ء کو لکھتے ہیں:

''لکھنؤ'' کا کیا کہنا ہے۔ وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہنچا امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصل خزاں ہے''۔ [۱۶]

اس باغ کی فصل خزاں کے جلو میں امیدِ بہاراں کو اپنے قلب ونظر میں پرورش کرنے والوں نے ہنگامۂ دار وگیر کو دعوت دی۔ وہ جانتے تھے کہ آزادی کی راہ میں دو ہی مقام آتے ہیں ''تخت'' یا ''تختہ''۔ آزادی کے اس عزم کے اظہار کو مدتوں غدر کہا گیا' لیکن جب ذہنوں میں آزادی کا شعور بیدار ہوا تو غدر کو خورشید آزادی کا مطلع اور جنگ آزادی قرار دیا گیا۔ اس مسئلہ پر اگلے باب میں گفتگو کی گئی ہے۔

انتزاع سلطنت اودھ جس طرح ہمارے شاعروں کے لیے ایک تحریک کا درجہ رکھتا ہے شاید مجموعی طور پر ہندوستان کی تاریخ میں اسے یہ درجہ نہ دیا جا سکے' کیونکہ یہ واقعہ ریاستوں کی ضبطی کے سلسلے میں ایک اہم کڑی تھا۔ ایسی کڑی جسے بعض مؤرخوں نے ''فیصلہ کن''، ''نتیجہ خیز'' اور ۵۷ء کی جنگ آزادی کے اسباب میں شامل کیا گیا ہے۔

---

۱۶ مرزا غالب' اُردوئے معلّٰی جلد اول ودوم' صفحہ ۱۹' آگرہ ۱۹۱۴ء

۱۸۵۷ء اور اردو شاعری

۱۸۵۷ء کے سال کو ہماری تاریخ میں ایک موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی سال نام کی جو مغلیہ حکومت باقی تھی ختم ہو گئی اور دوسری طرف ہنگامۂ ۵۷ کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور ختم ہوا اور برعظیم برطانوی تاج کا نگین بن گیا۔ اگرچہ شاہ عالم کے دور سے بہادر شاہ ظفر تک بابر و عالم گیر کے جانشینوں کا دائرہ اقتدار ''دِلی سے پالم'' تک اور بعد میں لال قلعہ تک محدود ہو گیا تھا' لیکن مسلمانوں کی سلطنت کو ایک تمدنی علامت کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۸۵۷ء میں یہ علامت ختم ہو گئی۔ سیاسی طور پر تو کمپنی کو جنگ پلاسی کے بعد عملی اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ ''مغل شہنشاہ'' اس کا پنشن خوار تھا' لیکن ۱۸۵۷ء نے ہماری زندگی' تمدن' تاریخ' ادبیات اور زندگی کے ہر شعبہ کو ایک نئے موڑ پر پہنچا دیا۔ ایک طرف تو ۱۸۵۷ء ہماری مکمل شکست کا باب ہے اور دوسری طرف اسی تاریک رات کے بطن سے ہماری نشاۃ الثانیہ کے سورج کی کرنیں طلوع ہوئیں۔ یہ کرنیں ہمہ جہتی تھیں۔ سر سید نے مغرب کی عقلیت پسندی کے تحفہ کے ساتھ ساتھ حقائق کے ادراک کی دولت ہمیں دی اور دوسری طرف شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا دار العلوم دیوبند ہمارے دینی استحکام کا مرکز بنا۔ یہ ایک مختلف داستان ہے جس کی تفصیلات کا ہمارے موضوع سے علاقہ نہیں۔ اُردو ادب پر اس انقلاب کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔ ایک طرف نئے اصناف ادب ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آئے اور دوسری طرف ۱۸۵۷ء کا ذکر ہماری شاعری اور نثر میں کئی انداز سے ملتا ہے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے مگر اس باب میں ہم ۱۸۵۷ء کے ذکر کو انہیں شاعروں کے کلام تک محدود رکھیں گے جو اس تجربہ سے ذاتی طور پر گزرے' خواہ اس کا اظہار انہوں نے بعد میں کیا ہو۔ اسی طرح اس عہد کی نثر میں بھی ۱۸۵۷ء کے خط و خال کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

۱۸۵۷ء کے ''ہنگامۂ آزادی'' کو ہماری تاریخ میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا

ہے۔ برطانوی مؤرخوں نے اسے ''سپاہیوں کی بغاوت'' یا ''غدر'' کا نام دیا۔ برعظیم کے مؤرخ بھی اسے ۱۹۴۷ء تک ''غدر'' کہتے رہے۔ سر سید احمد خاں نے اسے غدر نہیں بلکہ ''بغاوتِ ہند'' کا نام دیا تھا۔ اس دور کی شاعری میں' جیسا کہ ہم اس باب میں دیکھیں گے' ہمارے بہت سے شاعروں نے تلنگوں اور باغی سپاہ کے مظالم کا ذکر کیا ہے' مگر انگریزوں کے جرائم کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا' مگر ذاتی تحریروں (خطوط' روزنامچوں وغیرہ) میں انگریزوں کے مظالم کی تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس اعتبار سے مرزا غالب کے خطوط اور بعض دوسری ادبی تحریروں کو ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ نویسی پر فوقیت حاصل ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے ۱۸۵۷ء کو قومی جنگ آزادی قرار دیا جا رہا ہے۔ بعض مؤرخوں نے اسے ''پہلی قومی جنگ آزادی'' کہا ہے۔ دوسری طرف ایسے مؤرخ بھی ہیں جن کا خیال ہے:

> "It was neither 'first' nor 'national' nor a war of independence. ❶

ہمارے خیال میں سر سید احمد خاں نے اپنے ''رسالۂ بغاوت ہند'' میں اس ہنگامہ کے جو اسباب بیان کیے ہیں' وہ آج بھی اس کی نوعیت کا تعین کرنے کے سلسلے میں بہترین معاون ہیں اور سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کسی منظّم تحریک کے طور پر نہیں شروع ہوئی مگر انگریز کے خلاف اتنا مواد جمع ہو چکا تھا اور لوگوں کی تجارتی' صنعتی اور معاشی ابتری اور بدحالی نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ اس ''بغاوت'' سے وابستہ ہوتے چلے گئے اور اسے ایک عوامی تحریک کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس اعتبار سے اسے ''عوامی سطح پر جنگ آزادی'' قرار دیا جا سکتا ہے' اگرچہ یہ جنگ کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھی۔ غیر ملکی سامراج کے خلاف موقع پا کر اٹھ کھڑا ہونا اور ہتھیار سنبھال لینا عہد حاضر کی تاریخ میں کوئی انوکھی

---

❶ Majumdar, R.C., History of the freedom movement in India, Vol. I. p. xvii. Calcutta, 1963.

بات نہیں ہے۔ اس عام ہل چل میں گوجر اور جاٹ وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔ ذاتی مقاصد کی بنا پر زمیندار اور خاص طور پر اودھ کے تعلقہ دار بھی ۱۸۵۷ء کے ''مجاہدین'' کی صف میں شامل ہو گئے لیکن ان لوگوں کے ذہن میں کسی قومی تحریک یا جدوجہد کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسی طرح روہیل کھنڈ اور مختلف مقامات پر انگریزوں کے قتلِ عام نے عوام کو یقین دلایا کہ ان کی حکومت ختم ہوگئی اور یوں عام آدمی مہم جوئی کے جذبہ کے ساتھ اس ہنگامہ میں شریک ہوگیا۔

جہاں تک ''پہلی'' کا تعلق ہے ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے' کیونکہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف برعظیم کی تاریخ میں اس سے پہلے بھی تلوار اٹھائی گئی اور آزادی کے لیے منظّم کوششیں کی گئیں۔ انگریزوں کے خلاف ٹیپو سلطان کی جنگ محض ایک دیسی حکمران کی جنگ نہیں تھی۔ ٹیپو سلطان ہماری تاریخ کا پہلا آدمی ہے جس نے بین الاقوامی سیاست کو سمجھا اور انگریزوں کو برعظیم سے نکالنے کے لیے عالمی اتحاد اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے برعظیم کے سیاسی نقشہ کو بدلنے کی کوشش کی۔ ایک گزشتہ باب میں ہم اردو شاعری پر سید احمد شہید کی تحریک کے اثرات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ یہ تحریک باقاعدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ تھی اور اسے یقیناً ''جنگ آزادی'' قرار دیا جا سکتا ہے' اسی لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو ''پہلی جنگ'' آزادی قرار دینا تاریخی طور پر درست نہیں ہوگا۔ اگرچہ یہ جنگ کسی باضابطہ اور مرکزی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہ تھی لیکن جب علمائے کرام (جو حضرت شاہ ولی اللہ کے بتائے ہوئے انقلابی راستے پر چل رہے تھے اور اپنے اپنے حلقوں میں ''قوم کافر'' کے سیاسی تسلط کے خلاف کام کر رہے تھے) اس جنگ میں شریک ہوئے تو انہوں نے اسے ایک انقلابی تحریک بنانے کی ہر عملی ونظری کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں علمائے اسلام کا کردار نہایت تابناک رہا ہے۔ یہی وہ گروہ تھا جو وقتی' شخصی' علاقائی اور طبقاتی مفاد سے بالاتر تھا' محمد میاں نے ''۱۸۵۷ء اور جانبازانِ حریت'' کے عنوان سے یہ داستان لکھی ہے جو ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کی چوتھی جلد ہے۔

علماء نے آزادی کی اس جدوجہد کو جہاد قرار دیا اور اس باب میں اپنا فتویٰ بھی شائع کیا۔ علماء سے جب یہ سوال کیا گیا کہ ”دہلی پر انگریزوں کا حملہ جو اسلام کو ضرر پہنچانے کے لیے ہے اس کا مقابلہ کرنا اہل دہلی اور دہلی کے قرب و جوار کے رہنے والوں کے لیے جہاد ہے یا نہیں“ تو انہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ

> ”درصورت مرقومہ فرض عین ہے‘ اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقتِ مقابلہ اور لڑائی ہے......تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف واحوال کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے“۔

اس فتویٰ کے آخر میں مولانا نور جمال کا نام ہے اور ۳۳ دوسرے علماء کے دستخط اور مہریں ہیں۔ ان علما میں مفتی صدر الدین اور مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی بھی شامل ہیں[۱]

منشی ذکاء اللہ مرحوم نے تاریخ عروج عہد انگلیشیہ (حصہ تاریخ ہند) میں ”وہابی جہادیوں“ کا بار بار ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے جہادی دہلی میں بھی تھے اور بڑی تعداد میں دوسرے مقامات سے بھی آئے۔ اسی طرح وہابی مجاہدین نے بھی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ مجاہدین جنرل بخت خان کے ساتھی بھی تھے اور مشیر بھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے آغاز کے بعد جب بہادر شاہ ظفر حالات کے دباؤ کے تحت اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تو تحریک میں تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۲ مئی کو بہادر شاہ نے دہلی کے عمائدین کا ایک جلسہ طلب کیا اور ان لوگوں کو ایک انتظامی مجلس بنانے کی دعوت دی گئی۔ نتیجہ کے طور پر کورٹ آف ایڈمنسٹریشن وجود میں آیا۔ اس کورٹ کی اصل دستاویز حاصل ہوگئی ہے جسے اس مجلس کا آئین کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سین نے

---

[۱] بحوالہ محمد میاں علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم ۱۹۸ دہلی ۱۹۶۰ء

اس آئین کا عکس اپنی کتاب ۱۸۵۷ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس آئین کے مطابق اس کورٹ کا مقصد انتظام فوجی و ملکی کی برہمی کو رفع کرنا ہے۔ آئین کی بارہ دفعات ہیں اور اس کو بڑی حد تک ایک جمہوری آئین کہا جا سکتا ہے۔ اس کے خاص خاص نکات حسب ذیل ہیں۔ بڑی حد تک ہم نے آئین کے الفاظ کو خلاصہ میں برقرار رکھا ہے۔ یہ آئین یا دستور العمل اردو میں لکھا گیا ہے۔

۱ ایک کورٹ قائم کیا جائے اور اس کا نام کورٹ آف ایڈمنسٹریشن ہو۔ جلسہ کا انتظام فوجی و ملکی رکھا جائے۔ اس جلسہ میں دس آدمی مقرر کیے جائیں...... دو شخص پلٹن پیادگان سے اور دو شخص رسالہ ہائے سواران سے اور دو شخص سرشتہ توپ خانہ سے منتخب کیے جائیں اور چار شخص ملکی (شہری)۔

۲ ارکان میں ایک پریزڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور وائس پریزیڈنٹ چنا جائے گا۔

۳ ارکان میں بلا رُو رعایت اپنے فرائض کو کمال جانفشانی اور غور و فکر سے سر انجام کرنے کی صلاحیت ہو اور ان کا مقصد استحکامِ ریاست اور رفاہ و آسائشِ رعیت ہو۔

۴ خلاف دیانت و امانت اور جانبدارانہ طرز عمل پر کورٹ کا کوئی بھی رکن موقوف کر دیا جائے گا۔

۵ کورٹ کے ارکان کے علاوہ صاحب عالم بہادر (میرزا مغل) اور ظل سبحانی (شاہ ظفر) کو جلسہ میں شرکت کا اختیار ہوگا۔

۶ کورٹ کے ارکان اور سپہ سالار اعظم میرزا مغل کے درمیان اختلاف کی صورت میں معاملہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوگا اور ان کا فیصلہ آخری سمجھا جائے گا' ارکان کو اظہار رائے کی مکمل آزادی ہوگی۔[۳]

یہ دستور العمل جمہوری ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی اثرات کی شہادت بھی دیتا ہے۔ انگریزی الفاظ کا استعمال برطانوی دستوری اداروں کے اثرات کی گواہی ہے۔

---

۳ دستاویز، نیشنل آرکائیوز دہلی۔

اس مقالہ کے پہلے باب میں تاریخی واقعات کا جو خاکہ اور دوسرے باب میں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس سے ۱۸۵۷ء کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ برعظیم کی فضا ایسے ہنگامہ کے لیے ہموار تھی کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ادنیٰ بہانوں پر دیسی ریاستوں کے علاقوں کو ضبط کیا یا معاونت کے نام پر انہیں اپنا غلام بنایا۔

جن واقعات کا ذکر کیا جا چکا ہے' ان کے علاوہ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ خود کمپنی کی فوج کے سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کئی بار اپنے عزائمِ آزادی کا اظہار کیا۔

''۱۸۰۶ء میں ویلور احاطۂ مدراس میں کچھ سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ کہا تو یہ گیا کہ اس بغاوت میں سلطان ٹیپو شہید کے شہزادے معزالدین کا ہاتھ تھا لیکن دراصل سپاہیوں نے ہتک آمیز سلوک سے تنگ آ کر یہ اقدام کیا تھا...... ۱۸۲۲ء میں اراکاٹ کے رسالے کی بارک میں ایک اشتہار ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ انگریزوں کی نوکری اور غلامی قبول کرنے کی بدولت مسلمانوں پر لعنت اور مصیبت نازل ہوئی ہے۔ خدا ان کی نمازیں اور دعائیں قبول نہیں کرتا۔ اس لیے اراکاٹ سے لے کر دہلی تک جو بے شمار مسلمان آباد ہیں انہیں متحد ہو جانا چاہیے تا کہ انگریزوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کام کے لیے ۱۷ مارچ کا دن بھی مقرر کیا گیا۔[۴]

۱۸۲۴ء میں بنگال آرمی میں بغاوت کے پہلے آثار نمایاں ہوئے۔ ان حقائق اور تاریخی شہادتوں کی روشنی میں سر سید احمد خان کے ان الفاظ کی صداقت ابھرتی ہے کہ

> ''۱۸۵۷ء کی سرکشی میں بھی یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی''[۵]

اور

---

۴ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' مقدمۂ رسالۂ اسباب بغاوت ہند' ص ۲۸ کراچی' ۱۹۵۷ء

۵ سر سید احمد خاں' رسالۂ اسباب بغاوتِ ہند' ص ۹۷

''بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جمتے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ بہت کثرت سے جمع ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعۃً بہہ پڑے''[6]

سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کی ''بغاوت'' کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

۱۔ غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز کا۔
۲۔ ایسے آئین وضوابط کا اجراء جو ہندوستانیوں کے لیے مناسب نہ تھے۔
۳۔ حکومت۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی) کا رعایا کے اصلی حالات سے ناواقف رہنا۔
۴۔ ان امور کا ترک ہونا جس کا بجا لانا ہماری گورنمنٹ (کمپنی) پر ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔
۵۔ بدنظمی اور بے اہتمامی فوج کی۔

ان اسباب کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں ''عیسائیت کی تبلیغ'' کو بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے اسباب وعلل میں بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک طرف تو ۱۸۳۷ء کے ہولناک قحط سے انگریز مشنریوں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاوارث بچوں کو ''مسیح کے دین کی فصل'' بنا دیا۔

''ایسی فصل جو اپنے وقت پر کاٹی جا سکے گی'' اور دوسری طرف پادریوں نے اپنی تبلیغی تقریروں میں اسلام اور ہندومت پر تنقید کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو اپنی تنگ نظری کا ہدف بنانا چاہا۔ عیسائی پادری ''ایک حکومت'' کے ساتھ ساتھ ''ایک مذہب'' کا اعلان کرنے لگے تھے۔ پادریوں کے طرز عمل کو سرسید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۶۔ حوالۂ بالا، ص ۱۱۴

"پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سُننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دل میں بویا جاتا تھا"۔[۷]

سرسید احمد خاں نے ان سیاسی، فوجی، سماجی اور مذہبی اسباب کے ساتھ ساتھ معاشی اور اقتصادی عناصر کو بھی فراموش نہیں کیا۔ انہوں نے مسلمانوں پر نوکریوں کے دروازوں کے بند ہونے اور ان کی تنگی معاش اور مفلسی کا بھی ذکر کیا ہے۔[۸] کیفیت یہ تھی کہ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بہت سے لوگ آنہ ڈیڑھ آنہ یومیہ کے عوض یا سیر ڈیڑھ سیر اناج یومیہ کے لیے "باغی" سپاہ میں شامل ہو گئے۔[۹]

سرسید احمد خاں نے خاص طور پر مسلمانوں کی تنگیٔ معاش کا ذکر کر کے ایک طور پر دبے لفظوں میں ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی شرکت کو تسلیم کر لیا ہے، لیکن ان کا مقصد مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے مظالم سے اور سزا سے بچانا تھا۔ یہ رسالہ انہوں نے مسلمانوں کی بریّت کے لیے ہی لکھا تھا۔ اسی لیے انہوں نے انتزاع سلطنت اودھ کو ۱۸۵۷ء کے اسباب میں براہِ راست شامل نہیں کیا ہے، لیکن یہ ضرور کہہ دیا کہ اودھ کی ضبطی لوگوں کی ناراضگی کا سبب بنی۔

"اودھ کی ضبطی کو بھی ہم سبب اس سرکشی کا نہیں سمجھتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اودھ کی ضبطی سے سب لوگ ناراض ہوئے اور سب نے یقین کر لیا کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے خلاف عہد اور اقرار کے کیا"۔[۱۰]

سرسید کا نقطۂ نظر مندرجۂ بالا حوالہ سے آج پوری طرح ہمارے سامنے آ جاتا

---

۷ سرسید احمد خاں، رسالۂ اسباب بغاوت ہند، ص ۱۲۷

۸ حوالہ بالا، ص ۱۵۲

۹ حوالہ بالا، ص ۱۵۴

۱۰ حوالہ بالا، ص ۱۰۰

ہے۔ لیکن اس دور کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ سرسید بہت واضح الفاظ میں انتزاع اودھ اور ۱۸۵۷ء کا باہمی رشتہ نہ بیان کریں۔

سو سال کے بعد جب ہمیں آزادی حاصل ہوئی اور وقت کے گزرنے کے بعد ہم ۱۸۵۷ء کا معروضی طور پر مطالعہ کرنے کے قابل ہو سکے تو ہمارے مؤرخین نے اس واقعہ کے اسباب وعلل کا تجزیہ کیا۔ یہ تجزیے سرسید احمد خاں کی بصیرت کی شہادت دیتے ہیں۔ سرسید احمد خاں زمانی طور پر اس واقعہ سے بہت قریب تھے اور خود بھی اس کا حصہ تھے مگر ان کی قوتِ تجزیہ غیر معمولی تھی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ''تحریک آزادی کے اسباب'' کا جو جائزہ لیا ہے اسے ہم مختصراً یوں پیش کر سکتے ہیں۔

1. صرف مسلمانوں کی سیاسی شکست ہی اس کا سبب ہو سکتی تھی اور پھر عام مسلمان کو یہ امید تھی کہ وہ دوبارہ اپنے ہم مذہبوں کی حکومت دیکھ سکے گا۔
2. انگریزوں کے ذہنی تعصبات اور نسلی نفرت۔ وہ برعظیم کے عوام کو تمدن سے عاری جانتے تھے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم پر اپنی بدنام زمانہ رپورٹ میں میکالے نے ۲ فروری ۱۸۳۵ء کو کہا تھا کہ ایک انگریزی کتاب مشرقی کتابوں کے ایک پورے ذخیرہ سے بہتر ہے۔ مسلمانوں نے انگریزوں کے تمدنی غرور کا سبب اپنی سیاسی غلامی کو قرار دیا۔
3. اودھ کا الحاق
4. معاشی حالات کی ابتری۔ سپاہیوں اور انتظامیہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ اہل ہنر اور صاحبانِ فن کی بے روزگاری۔ صنعتوں اور تجارت کا زوال۔ زراعت میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ بے کار ہونے والے صناعوں کا سہارا بن سکتی۔
5. عیسائیت کی تبلیغ۔ صرف یہی نہیں بلکہ حکومت کی قانون سازی میں عیسائیت اور اس کی تبلیغ کے عناصر۔[۱۱]

ڈاکٹر قریشی نے ۱۸۵۷ء کے تمدنی عناصر کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ عبداللہ یوسف

---

[۱۱] Qureshi, I.H., A History of the Freedom Movement Vol. II part I, Chapter X, pp 231 to 269, Karachi, 1960.

علی نے بھی ''غدر'' کی تمدنی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے نزدیک ''تمدنی کشمکش'' غدر کا بنیادی سبب تھی۔ اس تمدنی کشمکش کی تشریح انہوں نے اس طرح کی ہے۔

> ''تمدنی کشمکش کا یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ اہل برطانیہ کی ذہنیت اور اہلِ ہند سے ان کے برتاؤ نے ہندوستانیوں کے دل میں اہل برطانیہ کے متعلق ایک قسم کی بیزاری پیدا کر دی (یا اگر ذرا مختلف نظر سے دیکھا جائے) ان کے مقاصد کے متعلق اہل ہند کے دل میں ایک طرح کا شک و شبہ پیدا ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ جن مقاصد کا اعلان کیا جاتا ہے وہ حقیقی مقاصد نہیں۔ نیز حقیقی مقاصد ناشائستہ ہیں جن کا اعلان نہیں کیا جا سکتا''۔[۱۲]

مسلمانوں کی سیاسی شکست اور دوبارہ حصول اقتدار کی خواہش کا ذکر، ظاہر ہے کہ سر سید احمد خاں اُس عہد میں نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن مجمدار نے ''علماء کے ذہن میں دوبارہ اسلامی مملکت کے خیال کو ۱۸۵۷ء کے اسباب میں شامل کیا ہے۔

اودھ کے الحاق کو عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر قریشی اور ڈاکٹر مجمدار نے اہمیت دی ہے۔ الحاق کی پالیسی پر ہم اس مقالہ کے آغاز میں بحث کر چکے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات سے اس امر کی تصدیق و تائید ہو جاتی ہے کہ ریاستوں کے الحاق کا ۱۸۵۷ء کے واقعات سے گہرا تعلق ہے۔ اگر انگریزوں نے ریاستوں کے معاملہ میں ناجائز دخل نہ دیا ہوتا تو شاید نانا صاحب اور رانی جھانسی، یہ دونوں شخصیتیں ہمیں میدان جنگ میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما نظر نہ آتیں۔

> ''سو سال سے زیادہ عرصہ تک اپنے علاقے میں اضافہ کرنے کے لیے انگریز ہر جائز اور ناجائز صورت سے فائدہ اٹھاتے رہے، سندھ کے آزاد اور خود مختار علاقے کو بغیر کسی معقول عذر کے محض الزام اور اتہام لگا کر فتح کر لیا۔ واجد علی شاہ پر نا اہلی اور عیاشی کی تہمت رکھ کر ۱۸۵۶ء میں اودھ

---

[۱۲] عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، صفحہ ۲۴۱، الٰہ آباد ۱۹۳۶ء

کو بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضہ علاقے میں شامل کر لیا۔ اب ہندوستانیوں کو یقین ہو گیا کہ جلد یا بہ دیر دیسی ریاستوں کا یہی انجام ہونے والا ہے۔ جو بیچارے کمزور تھے وہ صبر کر کے بیٹھ رہے اور جن کے دلوں میں جوش اور ولولہ تھا وہ نفرت اور انتقام کی آگ میں جلتے رہے...... اسی طرح کی ایک مثال جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی ہے...... ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں رانی نے کھلم کھلا انگریزوں کے خلاف جنگ میں شرکت کی۔ [۱۳]

لارڈ ڈلہوزی کی توسیع پسند پالیسی کی عام برطانوی مؤرخوں نے بڑی تعریف کی ہے، لیکن گہری نظر رکھنے والوں کا خیال یہ ہے کہ ''ڈلہوزی میں تخیل کی کمی تھی اور اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اس کے جانے کے پندرہ ماہ کے اندر اپنی پندرہ کروڑ رعایا پر ہمارا اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ مستقبل کی پریشانیاں دور دراز ایران کی پیدا کردہ ہوں گی۔ [۱۴]

سی ایوی لن وڈ نے ستارہ، ناگپور، جھانسی اور نانا صاحب کے بارے میں کمپنی کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ستارہ کو برطانوی علاقہ بنانے میں گورنر جنرل نے ایسی نرمی بھی نہیں برتی جو ایسے حالات اور معاملات میں مسلمان حکمران برتتے تھے۔ [۱۵]

تمام ریاستوں کے الحاق سے زیادہ انتزاع سلطنت اودھ نے' اودھ کے علاقہ میں ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ اور آزادی کے جذبہ کی آگ کو پھیلایا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ہمارے خیال میں سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ انتزاع سلطنت اودھ کا واقعہ ۱۸۵۶ء کا ہے اور اپنی نوعیت کے واقعات میں ۱۸۵۷ء سے سب سے قریب زمانے کا ہے۔ پھر اودھ کے عوام کو واجد علی شاہ سے جو جذباتی لگاؤ تھا اس کا اندازہ گزشتہ باب

---

۱۳ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' مقدمۂ اسباب بغاوت ہند' صفحہ ۲۔۲۱

۱۴ Wood, Sir Evelyn; The Revolt in Hindustan, p. 1, London, 1908.

۱۵ Wood, sir Erelyn: The Revoltin Hindustan, p.2.

''انتزاع اودھ اور اردو شاعری'' کے مطالعہ سے کسی حد تک ہو سکتا ہے۔ لوگ پیا جان عالم کی واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ شاہی محلات تباہ ہو چکے تھے۔ کمپنی نے شاہی خاندان کے افراد کی کوئی پروا نہیں کی۔ شہزادے لکھنؤ کی سڑکوں پر گداگری کر رہے تھے۔ نئے ٹیکس لگا دیئے گئے تھے۔

کسانوں کے لیے زمین کا لگان پہلے ہی زیادہ تھا' نئے ٹیکسوں نے بے چینی میں اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ اودھ کی سپاہ توڑ دی گئی تھی اور سپاہی بے روزگار تھے۔ یہ سپاہی عام آبادی کا حصہ تھے' اس لیے لوگوں کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ اس جائزہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اودھ میں ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا تھا اور واجد علی شاہ کی بد انتظامی کمپنی کی حکومت سے کہیں بہتر تھی۔ اسی پس منظر میں اودھ میں ۱۸۵۷ء کی سرگرمیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اودھ کی نسبتاً پُر سکون' پُر امن اور خاموش سرزمین اس دوران برعظیم کے دوسرے حصوں سے کہیں زیادہ فعال اور سرگرم و پُر جوش ثابت ہوئی۔ لکھنؤ میں سپاہیوں کی بغاوت آسانی سے کچل دی گئی تھی لیکن ۳۱ مئی کو پانچ چھ ہزار مسلمان شہریوں نے بغاوت کی کوشش کی۔ پھر ہر طرف سے باغی اودھ میں آتے رہے۔ لکھنؤ کے سقوط کے بعد مجاہدین آزادی چاروں طرف پھیل گئے اور انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ حضرت محل' مولوی احمد اللہ' گلاب سنگھ' فیروز شاہ وغیرہ عزم و ہمت کے پیکر تھے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کے درمیان گہرا عسکری رابطہ نہیں تھا لیکن اودھ میں جو کچھ ہوا Mujamdar کے الفاظ میں سنیے:

> In the course of ten or eleven days, English administration in Avadh had vanished like a dream, and not a single representative of the British Government was to be found at any of the stations in Avadh.[۱۶]

اودھ میں برطانوی اقتدار کی علامتیں دیکھتے ہی دیکھتے مٹا دی گئیں' اودھ کے باہر کسی اور جگہ سپاہیوں کی بغاوتیں نہ اتنی کامیاب تھیں اور نہ اتنی پھیلی ہوئی۔ سب سے

---

۱۶ Mujamdar, History of the freedom movement, Vol, 1, p 189.

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سپاہیوں کی بغاوتوں نے بہت بڑے پیمانے پر اودھ میں شہری آبادی کے بغاوت اور ہنگامۂ آزادی کو جنم دیا۔ [۱۷]

۱۸۵۷ء کے اس پس منظر اور اسباب کی روشنی میں اُس ادب اور شاعری کو سمجھا جا سکتا ہے جو اس انقلاب کی یادگار ہے۔ برطانوی سامراج کے استبداد، دستور زبان بندی اور اپنی حفاظت کے خیال نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے جذبات کے چھپانے پر مجبور کیا۔ فغان دہلی میں جن شعراء کا کلام شامل ہے ان میں سے بیشتر نے پوربیوں، تلنگوں اور دیسی سپاہیوں کو دہلی کی بدبختی کی وجہ قرار دیا ہے اور انہیں برا بھلا کہا ہے۔ لیکن ان شاعروں میں ایک بات قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے اور وہ ہے ان کی ''شاہ پرستی''۔ بہادر شاہ ظفر کو شاید کسی نے اس تحریک کے قائد کی حیثیت سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ ان کو مظلوم اور تلنگوں کا صید زبوں قرار دیتے ہوئے ان کی حکومت کے خاتمے اور جلا وطنی کا ماتم کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر ایک المیہ ڈرامے کے ہیرو کی طرح شاعری کے اس آئینے میں ہمارے سامنے آتے ہیں، مگر یہ المیہ ڈرامہ، مروجہ مفہوم میں المیہ ہے، ورنہ اس کے مرکزی کردار میں المیہ تمثیل کے ہیرو کی عظمت نہیں ہے۔ ان شاعروں میں سیاسی شعور اتنا بیدار نہیں ہے جس درجہ تمدنی احساس و شعور اور اپنے شہر کی محبت۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ایک طرف تو شہر آشوب کی روایت کو زندہ کیا اور دوسری طرف اس کے حدود میں تبدیلیاں بھی کیں۔ بعض شہر آشوب روایتی انداز میں مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کی تباہی، بربادی اور نکبت و افلاس کے مرقعے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ تمدنی شہر آشوب نے جنم لیا جس کی مثال حالی کا ''مرثیۂ دہلی'' ہے۔ اور پھر اسی زمین میں ظہیر دہلوی اور میر مہدی مجروح کے دہلی کے تمدنی و ثقافتی مرثیے۔ شہر آشوب کے ساتھ ساتھ غزل کے فارم میں شاعروں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے اثرات دل و ذہن پر اتنے گہرے مرتسم ہوئے تھے کہ شعراء اسی جذباتی صنف کا سہارا لے سکتے تھے۔ وہ خود اس واقعہ سے متاثر ہوئے، اسی لیے دلی کا ذکر

---

[۱۷] حوالۂ بالا، صفحہ ۱۸۸

انہوں نے دل کی زبان میں کیا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری بھی اس ''ہنگامہ'' سے متاثر ہوئی لیکن ۱۸۵۶ء میں انتزاع اودھ اور ۱۸۵۷ء میں ''ہنگامہ آزادی'' کے واقعات اتنے قریب کے ہیں کہ یقین کے ساتھ لکھنؤ کے ہر شاعر کے متعلقہ کلام کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ۱۸۵۶ء کے تاثرات کا نتیجہ ہے یا ۱۸۵۷ء کے تجربات کی پیداوار۔ گزشتہ باب میں ہم نے لکھنوی شعراء کے کلام کے انتخاب میں ممکنہ حد تک احتیاط سے کام لیا ہے۔ اس باب میں بھی یہی مشکل مرحلہ سامنے ہے۔ کوشش یہی کی گئی ہے کہ لکھنؤ کے شعراء کا وہی کلام اس باب میں شامل کیا جائے جو اپنی داخلی (وسعت۔ انداز بیان، واقعات کی طرف اشارات) اور خارجی شہادتوں کی بنا پر ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق ہو۔

برِعظیم کی آزادی کے بعد بہادر شاہ ظفر کو ''جنگ آزادی'' کا مرکزی کردار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اگر ایک طرف بہادر شاہ ظفر پر ڈاکٹر مہدی حسین کی انگریزی کتاب ''بہادر شاہ دوم'' سے ہوتا ہے تو دوسری طرف جنگ آزادی کے موضوع یا بہادر شاہ کے عہد پر اُردو کی حالیہ کتابوں سے۔

بہادر شاہ ظفر اس اعتبار سے ہنگامۂ آزادی کے مرکزی کردار تھے کہ سپاہیوں اور عوام میں شاہ پرستی رچی ہوئی تھی۔ پورب کے جو ہندو سپاہی دلی پہنچے وہ انہیں دھرم اوتار کہتے تھے۔[۱۸] اور ان سپاہیوں نے بہادر شاہ ظفر کو علامتی طور پر اپنا سربراہ چن لیا۔ لیکن یہ سپاہی مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے تھے، ان میں کوئی مرکزیت نہ تھی، ان کے باہمی تعلقات چنداں خوشگوار نہ تھے اور نہ ہی یہ سب شاہ ظفر کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ دوسری طرف بہادر شاہ ظفر کے دور اقتدار ہی میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ لال قلعہ انہیں کے دم تک مغلوں کے قبضہ میں رہے گا۔ اس کے بعد اولاد تیمور مہر دلی میں رہے گی۔ قلعہ معلی کی نگرانی کمپنی نے شروع کر دی تھی اور ۱۸۵۷ء میں ڈگلس یہ فرائض انجام دے رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی عمر ۸۲ سال کی تھی۔ ساری زندگی انہوں نے

---

۱۸ Mahdi Hussain, Bahadur Shah 11, p, 78 Delhi, 1958.

''زندان'' میں گزاری تھی۔ وہ فضائے پرواز کے بارے میں سوچنا بھی بھول چکے تھے۔ طبعاً نیک، صوفی منش اور اچھے آدمی تھے۔ باپ دادا کے بہت سے عیوب انہیں ورثے میں نہیں ملے تھے، لیکن ان کا تصوف حضرت مجدد الف ثانیؒ یا شاہ ولی اللہؒ کا ترکہ نہیں تھا جو شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلتا ہے بلکہ گوشہ نشینی اور مجبوری و بے کسی کی پیداوار تھا۔

اپنی کتاب کے دوسرے باب ''بہادر شاہ اور سپاہی'' میں ڈاکٹر مہدی حسین نے انہیں ''جنگِ آزادی'' کا سربراہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بابِ خود ان کے خیال کی تردید کرتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر مؤرخ ہیں۔ انہوں نے حقائق کو مسخ نہیں کیا ہے مگر نتائج اپنے نقطۂ نظر کے مطابق نکالنے چاہے ہیں اور اس میں ہماری رائے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ جب ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پوربیوں اور تلنگوں نے بہادر شاہ ظفر سے کہا ''او دھرم اوتار! آپ اپنا مہربان ہاتھ ہمارے سروں پر رکھ دیں۔ ہم ہندوستان کی حکومت آپ کے لیے حاصل کر کے رہیں گے'' تو بہادر شاہ نے جواب دیا' میں ایک فقیر ہوں۔ میرے پاس نہ خزانہ ہے، نہ فوج، لیکن تم لوگوں کے مفاد کے لیے اگر ضرورت پڑی تو میں اپنی جان کو بھی عزیز نہ رکھوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور اگر میں تمہاری طرف سے ریذیڈنٹ سے بات کروں تو شاید غلط فہمی دور ہو جائے۔ وہ آنے والے ہیں۔ ذرا میں ان سے اس ہنگامہ کے اسباب تو معلوم کر لوں۔ [19]

بہادر شاہ کے اس جواب پر ڈاکٹر صاحب کا یہ تبصرہ ''شاہ ظفر'' کے مرکزی کردار کے نظریے کو تقویت نہیں پہنچاتا کہ ''وہ اس وقت اس سے بہتر کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے''۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی جان کے اندیشہ سے یا سچ مچ اس خیال سے کہ انگریزوں کو شکست ہو جائے گی' سپاہیوں کی سربراہی قبول کر لی تھی۔ ویسے انہیں اس ہنگامہ کی خبر نہ تھی اور سپاہی جب ان کے پاس پہنچے تو سوائے ان کی بات مان لینے کے مجبور بہادر شاہ ظفر کے پاس کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔

---

۱۹ حوالۂ بالا صفحہ ۷۸-۷۹

"اصل حقیقت یہ ہے کہ غدر کے دن کی مجھے پہلے خبر نہ تھی۔ آٹھ بجے کے قریب باقی سوار دفعتہً آ گئے اور محل کی کھڑکیوں کے نیچے شور و غل مچانے لگے"۔ [۲۰]

یہ بہادر شاہ ظفر کے "جواب تحریری" کا اقتباس ہے۔ اس میں بہادر شاہ ظفر نے مسٹر فریزر (دہلی کے ریزیڈنٹ) کو بچانے کے لیے اپنی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک نیک جذبہ تھا' لیکن بہادر شاہ ظفر کی "قیادت" کی حقیقت ان کے اس بیان سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس طویل بیان کے اہم حصوں کو اختصار کے ساتھ مرتب کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

"باغی سپاہ دیوان خاص میں گھس آئی۔ عبادت خانے میں بھی ہر طرف پھیل گئی اور مجھے چاروں طرف سے گھیر کر پہرہ لگا دیا۔

"میں نے ان کا مطلب دریافت کیا اور چلے جانے کو کہا جس کے جواب میں انہوں نے خاموش کھڑے رہنے کو کہا اور کہا کہ جب انہوں نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا ہے تو اب اپنی طاقت کے موافق سب کچھ کر کے چھوڑیں گے۔ خوف کھا کر کہ کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں' میں نے منہ سے اُف تک نہ کی......

"میری مُہر کے ثبت شدہ اور دستخط کیے ہوئے احکام کی نسبت معاملہ کی اصل حالت یہ ہے کہ جس روز سے سپاہ آئی...... میں ان کے اختیار میں رہا...... بار ہا انہوں نے خالی لفافوں پر مُہر ثبت کرا لی ہے۔ نہیں معلوم ان میں انہوں نے کون سے کاغذات بھیجے اور کہاں بھیجے...... نیز انہوں نے کہا کہ وہ مجھے معزول کر کے میری جگہ مرزا مغل کو بادشاہ بنائیں گے...... اگر مجھے پوری طاقت یا اختیار ہوتا تو کیا میں حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں کو مقید ہونے دیتا؟ یا حکیم صاحب کے مکان کو لُٹتا ہوا دیکھتا؟...... میں ان کے قابو میں تھا اور کیا کر سکتا تھا۔ وہ اچانک آ پڑے

---

[۲۰] خواجہ حسن نظامی' بہادر شاہ کا مقدمہ (انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا چوتھا حصہ) صفحہ ۱۴۷' دہلی' ۱۹۲۰ء

اور مجھے قیدی بنالیا...... باغی فوج کی عادتوں کی نسبت معلوم ہو کہ انہوں نے کبھی مجھے سلام تک نہیں کیا...... [۲۱]

ان شہادتوں کے پیش نظر ہمارے خیال میں بہادر شاہ ظفر ''باغی فوج کے دباؤ کی وجہ سے ان کے سربراہ بننے پر مجبور ہو گئے ورنہ وہ تو قید حیات کو بھی قید فرنگ سمجھتے تھے۔ ظفر کی شاعری کبھی نزاع کا موضوع رہی ہے لیکن اپنی فضا' کیفیات اور موضوعات کی بنا پر اسے کسی اور کی دین قرار نہیں دیا جا سکتا ہے' کتنے شعر ایسے ہیں جن پر ان کے مزاج اور حالات کی مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ اشعار ہمیں ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ظفر ایک ایسے طائر اسیر تھے جو پرواز تو بڑی بات ہے فغاں بھی کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ ذرا اس مجبور بادشاہ اور خاندانِ مغلیہ کے آخری فرمانروا کی ذہنی زندگی اور کیفیات کو ان کی شاعری کے آئینے میں دیکھیے۔

کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے   جس میں نہ اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے

چاکِ قفس سے دیکھ رہا ہوں رُخِ چمن   صیادؔ ہے نہیں ہوسِ بال و پر مجھے

ہزار حیف کہ بلبل کا صحنِ گلشن میں   نہ چھوڑا ایک بھی صیاد نے نشانی' پر

ہوں میں وہ سنگ کہ دہقانِ فلک نے مجھ کو
گردشِ دہر کے گوپن میں پھرا کر پھینکا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا   یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ   ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

○○○

غنیمت جان جو دم گزرے کیفیت سے گلشن میں
دیئے جا ساقیٔ پیماں شکن بھر بھر کے پیمانہ

شاہ ظفر کی شاعری کا وہ حصہ جس کی بنا پر انہیں ہماری شاعری میں امتیاز حاصل

---

[۲۱] حوالہ بالا' صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۲

ہے گردش دہر کے ذکر سے عبارت ہے۔ وہ بڑے پُر گو شاعر تھے' اور انہوں نے پانچ دیوان مرتب کیے جن میں سے ایک ۱۸۵۷ء کی نذر ہو گیا۔ پہلا دیوان ۱۸۴۶' (م ۱۲۶۲ھ) میں مطبع سلطانی سے شائع ہوا۔[۲۲] رئیس احمد جعفری نے سال اشاعت ۱۲۶۱ھ لکھا ہے[۲۳] دوسرا دیوان ۱۲۶۶ھ میں شائع ہوا۔

باقی دو دیوان بھی ۱۸۵۷ء سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا پانچواں دیوان ہنگامہ کی نذر ہو گیا۔ ظفر نے ۱۸۵۷ء کے دوران مختلف روایات کے مطابق جو شعر کہے ان میں کہیں تو دبا دبا سا حوصلہ ہے اور کہیں شکست کا اعلان ہے۔ قیدِ رنگون کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر نے جو کچھ کہا ہو گا اس کے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بہت سے اشعار اور بعض غزلیں بہادر شاہ ظفر کے نام سے منسوب ہو گئیں۔ مثلاً یہ دو شعر مدتوں ان کے نام سے برعظیم کی فضا میں گونجے ہیں۔

غازیوں میں بُو رہے گی جب تلک ایمان کی
تب تلک لندن! چلے گی تیغ ہندستان کی
دمدمے میں دم نہیں ہے خیر مانو جان کی
اے ظفر ٹھنڈی ہوئی تلوار ہندستان کی[۲۴]

یہ دونوں شعر الگ الگ کیفیات کے حامل ہیں اور ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اس دور کے بعض دوسرے شاعروں کا کلام آج بھی علمی حلقوں میں ظفر کا کلام سمجھا جاتا ہے۔ مہدی حسین صاحب نے اپنی کتاب کے ضمیمہ Appendix C میں شاہ ظفر کی شاعری کا انتخاب دیا ہے۔ اس انتخاب کو انہوں نے دو حصوں تقسیم کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی شاعری اور ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے انتخاب کا آغاز اس مشہور غزل سے ہوا ہے۔

---

۲۲ مہدی حسین' بہادر شاہ دوم (انگریزی) ص ۴۴

۲۳ رئیس احمد جعفری' بہادر شاہ اور ان کا عہد' صفحہ ۱۱۷۴

۲۴ مہدی حسین' بہادر شاہ دوم' صفحہ ۴۵' ۴۶

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ کہ نہ دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، میرا غم سے سینہ فگار ہے[۲۵]

یہ غزل شاہ ظفر کی نہیں ہے بلکہ ایک اور شاعر حسامی کی ہے۔[۲۶]
اس شاعر کا ذکر اس باب میں آگے چل کر آئے گا۔

بہادر شاہ ظفر کی جو شاعری ہمارے سامنے ہے اور جس میں سے ایک مسدس شکوۂ روزگار، فغان دہلی میں شامل ہے، مختلف شہادتوں کی بنا پر ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے لیکن ان اشعار میں کہیں کہیں حقیقت کی ایسی جھلک ہے کہ یہ اشعار ۱۸۵۷ء کے واقعات پر گہرے تبصرے کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ مسدس کے دو بند پیش کیے جاتے ہیں۔

بادِ صبا اُڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک — مَلتے ہیں سر بہ سر کف افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک — کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں، گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خوار، نخلِ مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں — ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں — چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں
جو آ گیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

ظفر کی ایک مسلسل غزل میں دلی کی بربادی کا ماتم ہے۔ اگر یہ سارا کلام ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے، جیسا کہ مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے، تو ظفر کی خودنگری، معاملہ شناسی اور شعور و بصیرت کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہوگا۔ وہ اپنے اسلاف کی طرح اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیتے تھے حالانکہ انہیں ''شاہ عالم و عالمیان'' کہنے والے قصیدہ گو موجود تھے۔ ظفر کے اس کلام کو اس باب میں شامل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے ۵۷ء کے پس منظر کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

---

۲۵ حوالۂ بالا صفحہ ۴۶-۴۵

۲۶ فغان دہلی، کوکب، بمبئی ۱۳۰۰ھ

جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھریاں تھے
"شغال" اب ہیں جہاں، رہتے کبھی بستے بشر، یاں تھے
جہاں پھرتے بگولے ہیں، اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت، رقص کرتے سیم بر، یاں تھے
جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں، اور شور و شر، یاں تھے
جہاں اب خاک پر ہیں نقش پائے آ ہوئے صحرا
کبھی محوِ تماشا، دیدۂ اہل نظر یاں تھے
ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے، کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر، یاں تھے

بعض اشعار کے لہجہ میں آبلہ کے پھوٹ بہنے کی کیفیت ہے۔ نظر بہ بظاہر یہ شعر ۱۸۵۷ء کے بعد کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ اشعار ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہیں اور اس سے ظفر کے "المیہ" کی شدت بڑھ جاتی ہے۔

مرے پاس آتے تھے دمبدم، وہ جدا نہ ہوتے تھے ایکدم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم، وہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ پر ظفر کا یہ شعر کیسا جامع تبصرہ معلوم ہوتا ہے۔ ظفر جنہیں واقعہ کے ظہور سے پہلے غلامی کی جڑوں کے دور دور تک پیوست ہونے کا پورا اندازہ تھا۔

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا؟
(دیوان چہارم)

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ شاہ ظفر کی شاعری کو اس اہم تاریخی واقعہ کا پس منظر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظفر کا دور، شاعری کے اعتبار سے اردو کے نہایت درخشاں ادوار میں سے ہے۔ خاص طور پر یہ اردو غزل کا دوسرا عہد زریں ہے۔ میر، سودا اور درد کے بعد غالب و مومن و ذوق کا دور۔ مومن اور ذوق ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی سفر آخرت پر

روانہ ہو چکے تھے۔ ان میں سے صرف مرزا غالب دِلّی کا ماتم کرنے اور یہ کہنے کے لیے زندہ بچے تھے کہ

''میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں''۔ [۲۷]

غالب کے علاوہ ''غدر'' کی داستان بیان کرنے والوں میں ذوق کے شاگرد ظہیر دہلوی بھی شامل ہیں اور دلی کے نوحہ گروں میں حسامی' آزردہ' میر مہدی' مجروح' مرزا داغ' قربان علی بیگ سالک' مولانا حالی اور ان کے دوسرے ہم عصر شریک ہیں۔

غالب کے خطوط ۱۸۵۷ء کے واقعات کی مستند دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ آزادی سے پہلے اس ہنگامہ کی یک رخی تصویر پیش کی جاتی تھی۔ ایسی تصویر جس میں انگریز مؤرخوں نے ہندوستانیوں کے مظالم کی عکاسی کی ہے۔ غالب کے خطوط تصویر کے دوسرے رخ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خطوط وہ ذاتی تاثرات و مشاہدات ہیں جن میں غالب نے اپنے دوستوں کو شریک کیا ہے' لیکن ان میں سیاسی شعور بھی ہے۔ وہ سیاسی شعور جس کی بنا پر غالب نے اس ہنگامہ سے متاثر ہونے والوں میں تفریق و تمیز سے کام لیا ہے۔ غالب کا مسلک دوست نوازی تھا۔ وہ ذاتی تعلقات میں ہندو مسلم کا امتیاز نہیں برتتے تھے۔ منشی ہرگوپال (مرزا تفتہ) ان کی زندگی کے ایک گوشۂ منور کا درجہ رکھتے ہیں۔ غالب کو ان پر اس درجہ اعتماد ہے کہ انہیں جب خط میں دِلی کے حالات بتاتے ہیں تو انہیں مسلمانوں کے حالِ زار کو سمجھنے کا اہل سمجھتے ہیں۔

''شہر میں اہل اسلام کی آبادی کا حکم نہیں اور ان کے مکانات قرق ہیں۔ ضبط ہو گئے ہیں نہ واگزاشت کا حکم ہے''۔ [۲۸]

''واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر' کیا غریب' کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں...... مفصل حال لکھتے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز

---

۲۷ مرزا غالب' اردوئے معلٰی حصہ اول و دوم' ص ۱۰۵' آگرہ ۱۹۱۴ء۔

۲۸ مرزا غالب' اردوئے معلٰی' حصہ اول و دوم' ص ۲۹' آگرہ ۱۹۱۴ء

پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں“ [۲۹]

”رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آئے۔ شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں“۔ [۳۰]

۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کا قطعہ جو اب خاصا مقبول و مشہور ہو چکا ہے اور ان کے دیوان کے نئے ایڈیشنوں میں شامل کرلیا گیا ہے، ایک خط کا حصہ تھا۔

بسکہ فعالِ ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا

یہ قطعہ علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں مرزا نے لکھا بھیجا تھا۔ [۳۱] یہ ۵۸۔۱۸۵۷ء کی دلی کا نقشہ ہے، ایسا نقشہ جو اجمالی ہے، لیکن اپنے دامن میں کتنی ہی تفاصیل کو چھپائے ہوئے ہے۔ شہر کا ہر ذرہ مسلمان کے خون کا پیاسا تھا اور کوئی موضوع سخن سوائے اپنے مصائب کے نہیں رہ گیا تھا۔ اور یہی غالب جب اشاعت کے لیے ”روداد شہر اور اپنی سرگزشت کا حال نثر میں“ لکھتے ہیں اور اس التزام کے ساتھ کہ ”دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ [۳۲] تو تصویر بدل جاتی ہے۔ دستنبو کا مقصدِ تحریر ہی قاعدہ سے اپنی علیحدگی کا اظہار تھا۔ چنانچہ اس کے خاتمہ پر ملکۂ انگلستان وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ شامل ہے اور وہ بھی ”مشتمل بر تہنیت فتح ہندوستان“ ”دستنبو کے ترجمہ مخمور سعیدی کو جناب نعیم الرحمٰن نے

---

۲۹ حوالۂ بالا، صفحہ ۱۵۹ (یہ خط دسمبر ۱۸۵۷ء کا ہے)

۳۰ حوالہ بالا، صفحہ ۶۰

۳۱ خطوط غالب حصہ اول، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۱۶، لاہور

۳۲ [illegible]

اپنے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کا مخطوطہ ہمارے سامنے ہے۔ ابتدائی حصہ کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"اس سال کہ جس کا تاریخی شمار با قاعدہ تخرجہ "رستخیز بے جا" ہو گا۔ اور اگر صاف پوچھیے تو ۱۲۷۳ھ ۱۶ رمضان' پیر کے دن' دوپہر کے وقت' مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء۔ اچانک قلعے کے در و دیوار اور دہلی کی فصلیں لرز اُٹھیں اور یہ زلزلہ چاروں طرف پھیل گیا' اسی منحوس دن میرٹھ کی کینہ خواہ فوج کے چند بد بخت سر پھرے سپاہی شہر میں در آئے...... ان سرگران و سبک عنان سواروں اور تند خو تیز رفتار پیادوں نے جب دروازوں کو کھلا اور دربانوں کو مہماں نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جس کسی کو حکام میں سے دیکھا جب تک اسے بری طرح مار نہ ڈالا اور جہاں کہیں ان بڑے لوگوں کی آرام گاہیں نظر پڑیں جب تک جلا کر خاک نہ کر دیا۔ اس طرف سے منہ نہ موڑا۔"[۳۴]

دستنبو حاکموں کے حضور غالب کا تحفہ غلامی ہے اور خطوط و اشعار دل کی آواز۔

غالب کے علاوہ صرف دو اور شاعر ایسے ہیں جنھوں نے "دلکشوران انگلستان" کے ان مظالم کو اپنے اشعار کا بنیادی موضوع بنایا ہے جو مسلمانوں پر ڈھائے گئے۔ یہ شاعر ہیں حسامی اور ناصر۔ ان کے اشعار میں ملّی درد بھی ہے اور ایک سیاسی شعور بھی۔ بہادر شاہ کے سلسلہ میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ حسامی کی ایک غزل ان کے نام سے منسوب ہو گئی ہے۔ یہ غزل بہت مشہور ہے' اس لیے صرف دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ دونوں شعر انگریزوں کے مظالم کی شہادت ہیں۔ مرزا غالب نے چوک کو مقتل کہا تھا۔ حسامی نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ چاندنی چوک کا شاید ہی کوئی درخت ایسا ہو جس پر کسی مسلمان کو سولی نہ دی گئی ہو اور ان مظالم کے بعد بھی مسلمانوں کی طرف سے "ان کا" دل صاف نہیں ہوا تھا۔

---

۳۴ مخطوطہ ترجمہ دستنبو صفحہ ۲۔۱۱

۱۸۵۷ء کے بعد صورت حال یہ تھی کہ کانپور میں دو مسلمانوں کو عیسائیوں کو ''نصاریٰ'' کہنے پر پھانسی دی گئی اور سرسید احمد خان کو ''تحقیق لفظِ نصاریٰ'' کے باب میں رسالہ لکھنا پڑا۔

حسامی کے یہ اشعار اسی ظالمانہ طرزِ عمل کی دستاویز ہیں۔

کیا رعایائے ہند تباہ ہوئی، کہو ان پہ کیا یہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے، کہا ''یہ تو قابل دار ہے''
یہ ستم کسی نے بھی ہے سُنا، دیا پھانسی لاکھوں کو بے گناہ
و بے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی دل پر ان کے غبار ہے

زبان کے لحاظ سے اور فنی طور پر اس غزل میں کئی کمزوریاں ہیں، لیکن اس کی تاریخی اہمیت ہے اور شاعر کی جرأت قابل قدر ہے۔

ناصر دہلوی کا، قلمی دیوان جناب احمد سلیم اللہ کے ذاتی کتب خانے سے ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ اس میں تین غزلیں ۱۸۵۷ء سے متعلق ہیں۔ ناصر نے اپنے نثری دیباچے میں اپنے قیام لکھنؤ اور خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی کا ذکر بھی کیا ہے۔

''بندہ درزمانِ قیام خلد آثار دیار لکھنؤ از حضرت آتش مرحوم و مغفور فیض یاب شدم و نظرِ آنجناب ذرہ ہائے اشعار مرا سہا و ثریا کرد'' ۔[۳۴]

ناصر کو آتش سے جو عقیدت تھی اس کا اندازہ آتش کی تضمینوں سے ہوتا ہے۔ آتش کے کئی مصرعے ان کی غزلوں میں کسی نہ کسی عنوان سے ملتے ہیں۔ اس مخطوطہ کی تاریخ کتابت ۱۸۶۲ء ہے۔ شاعر کے بارے میں ہمیں کسی تذکرے میں کوئی مواد نہیں مل سکا۔ دیوان زادۂ حاتم کے بعد یہی ایسا مخطوطہ نظر سے گزرا جس کی ہر غزل پر تاریخ ڈالی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے متعلق دو غزلوں کے اشعار کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

نقش ہر منظر دیرینہ مٹا آنکھوں سے — چاندنی چوک میں وہ خون مسلماں دیکھا
ہر روش خونِ شہیداں سے ہوئی ہے رنگین — باغ میں بلبلِ بیتاب کو نالاں دیکھا

---

۳۴ ناصر دہلوی، مخطوطہ دیوانِ اردو، صفحہ ۶

لہو اس درجہ ارزاں ہو گیا مردِ مسلماں کا ''شہادت نامۂ بلبل ہے ہر پتہ گلستاں کا''
فرنگی کی نظر میں جرم ہے ایمان کی دولت کُھلا ہے آج اپنے واسطے دروازہ زنداں کا
جسے دلی کبھی کہتے تھے اب مقتل ہے یاروں کا
نظارہ کر لو اے ناصر اسی گنجِ شہیداں کا

نقطۂ نظر کے اشتراک کی بنا پر ہم نے غالب' حسامی اور ناصر کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔ ان کے بعد اس عہد کے دوسرے شاعروں کے ذکر سے پہلے' ظہیر دہلوی کا ذکر مناسب ہو گا' کیونکہ غالب کی طرح انہوں نے بھی نثر اور نظم دونوں میں اس واقعہ اور اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ غالب تو ۱۸۵۷ء کے بعد بھی دلی ہی میں رہے' مگر ظہیر کی زندگی پردیس میں گزری اور دلی کی یاد ان کے لیے ایک ایسی خلش بن گئی جو ہر دم دِل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔

ظہیر دہلوی کی کتاب ''داستان غدر'' چشم دید حالات پر مشتمل ہے اور اسی لیے اس کی دستاویزی اہمیت ہے۔ اس عہد میں جب لوگ محض نام کی بادشاہت کو اپنا قومی غلبہ سمجھتے تھے' ظہیر دہلوی اس محدود طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو سیاسی بصیرت رکھتا تھا۔ داستان غدر میں سلطنت دہلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہر چند سلطنت تو ڈیڑھ سو برس پیشتر خاندان عالی شان تیموریہ و دودمان اولوالعزم گورگانیہ کو ہذا فراق بيني وبينك' کہہ کر رخصت ہو چکی تھی۔ برائے نام بادشاہت رہ گئی تھی' کیونکہ ایک چھوٹی سے چھوٹی ریاست ہندوستانی کے برابر بھی بادشاہ دہلی کو وسعت' مقدرت و استطاعت نہ رہی تھی۔ بقول سودا
>
> کہ ایک شخص ہے بائیس صوبہ کا خاوند
> رہی نہ اس کے تصرف میں فوج داریٔ کول [۳۵]

ظہیر دہلوی بھی شعراء کے اس عام گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک طرف بہادر

---

[۳۵] ظہیر دہلوی' داستانِ غدر' صفحہ ۳۴' لاہور ۱۹۵۵ء

شاہ ظفر سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف ''باغیوں'' کو ہر فتنہ کا سبب جانتا ہے، حالانکہ بہادر شاہ ظفر نے ان کی طرف کبھی التفاتِ خاص نہیں برتا۔

وہ بدنصیب ہوں کہ دم پرورش ظہیر میرا خیال یاد سے شہ کی اتر گیا

ان کا مسدس جو فغان دہلی' میں' شامل کیا گیا ہے وہ بھی داستانِ غدر کا ہی ایک حصہ ہے۔

کہاں وہ خسر وِ عالی نظر بہادر شاہ کہاں وہ سرورِ نیکو سیر بہادر شاہ
کہاں وہ بادشہٗ دادگر' بہادر شاہ کہاں وہ داورِ والا گہر بہادر شاہ
کہاں سے باغی بے دین آ گئے' ہے ہے
کہ نام اس کا جہاں سے مٹا گئے' ہے ہے

یہ کیسی آتشِ فتنہ لگا گئے ظالم جہاں میں ایک قیامت مچا گئے ظالم
غرض کہ نام خلافت اٹھا گئے ظالم سبھوں کو مٹنے سے پہلے مٹا گئے ظالم
کسی پہ قہر خدا کا' نہ آفت آئی تھی
یہ خاندانِ تمر پر قیامت آئی تھی

ظہیر دہلوی نے ''باغیوں'' کو ''بے گناہ زن و بچہ'' کے قتل کا ذمہ دار گردانا ہے اور اس گروہ کو ''چراغِ بزمِ عدالت'' بجھانے کا مجرم قرار دیا ہے لیکن ان کی تحریروں میں دونوں پہلو ابھر ہی آتے ہیں۔ انگریزوں کی لوٹ مار کا ذکر بھی 'داستان غدر' میں موجود ہے۔ پہلے ہی باب میں ہمیں ان کے گھر کے لٹنے کا حال ملتا ہے۔

''بعد انفراغ 'شادی سب سامان جہیز کا کوٹھوں میں داخل کر کے قفل لگا دیے گئے۔ اپنے گھر کا سامان استعمال میں لایا گیا۔ بعد چار ماہ کے غدر صاحب نازل ہوئے۔ اس سامان میں سے ایک چھلا بکار آمد نہ ہوا۔ وہ سب سرکار انگریزی کے نذر ہوا۔ اس کے علاوہ چالیس ہزار روپیہ سے زاید کا اثاث البیت جو زمانۂ بزرگان سے اندوختہ چلا آتا تھا' وہ سب دست بردِ افواجِ انگریزی میں تاراج ہوا۔ ایسی ایسی نایاب چیزیں تلف

ہوئیں کہ جن کی نظیر ملنی محال ہے۔[۳۶]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دلی کی یاد ظہیر دہلوی کے دل کی خلش بن گئی تھی۔ دلی کی یاد، دلی کی بربادی کا ماتم، دلی والوں کا تذکرہ ان کی شاعری میں ہر پہلو اور ہر عنوان سے آیا ہے۔ "غدر" (ظہیر نے ہنگامہ آزادی کو غدر ہی کہا ہے) کے بعد کی اس شاعری کا ذکر اسی کے ذیل میں مناسب ہے۔ "سنبلستان عبرت" ظہیر کے دوسرے دیوان کا نام ہے۔ اس سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

بہہ گئے سیلِ فنا میں شہر والے اے ظہیر　　بے کسی آباد ہے اب تو جہاں آباد میں

○○○

پڑے ہیں وہ عشرت کدے آج ویراں　　جہاں یار لوگوں کے جلسے رہے ہیں

○○○

کرتے تھے جو کہ شاہی، دو گز زمیں نہ پائی　　محتاج ہیں لحد کو ہاتھی کے تھان والے

ظہیر کے تیسرے دیوان کا نام "دفتر خیال" ہے۔ اس میں بھی دلی کی یاد قدم قدم پر ملتی ہے۔

تھی جب آباد، تھی کبھی دہلی　　اب تو اجڑا مکان ہے گویا
اب نہ دیلی رہی، نہ وہ گفتار　　ایک باقی نشان ہے گویا
بزم ہستی سے اٹھ گئے وہ لوگ　　رہ گئی داستان ہے، گویا
ہم صفیرانِ وطن کو ہو مبارک اے ظہیر
رہنے والے تھے کبھی ہم بھی جہاں آباد کے

ظہیر دہلوی نے خاصی طویل عمر پائی۔ ان کا انتقال حیدر آباد دکن میں ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ وہ بیس سال جے پور میں رہے۔[۳۷] ٹونک میں بھی ان کی زندگی کے چند سال گزرے اور ان کا پہلا دیوان گلستان سخن زمانہ ملازمت ٹونک ہی میں شائع ہوا تھا۔[۳۸]

---

۳۶ ظہیر دہلوی، داستانِ غدر، ۳۱، ۳۲۔

۳۷ ظہیر دہلوی، داستان غدر ص ۳۱۲۔

۳۸ ظہیر دہلوی، داستانِ غدر ص ۳۱۲۔

داستان غدر کے اختتام تک ان کے دونوں مطبوعہ دیوان شائع نہیں ہوئے تھے اور چوتھا دیوان شاید کبھی شائع نہیں ہوا۔ ظہیر نے اس بارے میں خود لکھا ہے کہ "اب عنایتِ ایزدی سے تین دیوان کا ذخیرہ میرے پاس موجود ہے۔[۳۹] اس گفتگو سے ہماری مراد اس نکتہ کی وضاحت ہے کہ دہلی میں بیتے ہوئے دن ہمیشہ ان کی لوحِ ذہن پر متحرک تصویروں کی طرح حرکت کرتے رہے۔ حالی کی مشہور زمین میں انہوں نے بھی دلی کا مرثیہ لکھا ہے۔

ہم نشیں قصۂ دہلی نہ سنانا ہرگز زخمِ نَو داغِ کہن پر نہ لگانا ہرگز
ہم تو بھولے ہوئے بیٹھے ہیں کہانی اپنی پھر کہیں فتنِ خفتہ نہ جگانا ہرگز
اور ہیں گل کے رجھانے کو ترانے بلبل سرگزشتِ دل محزوں نہ سنانا ہرگز
آگ لگ جائے ترے شوق میں اے حبِ وطن مجھ کو نقشہ نہ مرے دل کا دکھانا ہرگز

ہم نے اس زمین کو حالی کی ملکیت میر مہدی مجروح کی شہادت کی بنا پر قرار دیا ہے۔ اسی زمین میں میر مہدی مجروح نے بھی دلی کا نوحہ لکھا ہے جو اسی باب میں کسی دوسرے مقام پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مقطع میں مجروح نے کہا ہے۔

قصرِ حالی کے حوالی میں ذرا تم مجروح اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بنانا ہرگز

ظہیر دہلوی کے بعد ان شاعروں کا تذکرہ مناسب ہوگا جو انہیں کی طرح باغیوں، "تلنگوں" اور "سپاہیوں" کو ہر فتنہ اور ہر تباہی کا سبب سمجھتے تھے۔ شاعروں کی بڑی تعداد کا اندازِ فکر یہی تھا۔ اپنی مناجات میں قاضی فضل حسین افسردہ کہتے ہیں۔

ہائے کیا دہلی پہ آفت آ گئی چین سے بیٹھے تھے شامت آ گئی
سر پہ عالم کے مصیبت آ گئی فوج کیا آئی قیامت آ گئی

وقتِ تنگ آمد ترحم یا رحیم!
لطف کن بر دردمندانِ سقیم

تشنہ دہلوی، شاگرد ذوق نے اپنے مسدس "شہر آشوب" میں یہی خیال پیش کیا ہے۔

---

۳۹ حوالۂ بالا، صفحہ ۳۱۲

تمام شہر تلنگوں نے آ کے لوٹ لیا　　مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آ کے لوٹ لیا

حکیم محمد تقی خاں سوزاں بھی ہندوستانی فوجیوں اور پوربیوں کے خلاف ہیں۔ ان سپاہیوں کے ساتھ دلی کے جو لوگ شامل ہو گئے' سوزاں نے انہیں اپنے مسدس میں ''اوباش'' کہا ہے اور یہ لوگ پوربیوں کے ساتھ مل کر

جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اس پہ چڑھ جاتے
''فرنگی اس میں ہیں'' یہ کہہ کہہ کے گھر وہ لٹواتے

مگر اپنے بیشتر ہم عصروں کی طرح سوزاں بھی شاہ پرست تھے۔ خاندان مغلیہ کے چراغ گل ہو جانے کا انہیں بہت رنج ہے۔ وہ ''دیوان خاص اور مہتاب باغ'' کی یاد میں نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ لیکن دلی کی تباہی کے بعد وہ انگریزوں کی فتح میں ان کے شریک ہیں اور اس نئے دور کو وہ بہار و شادمانی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔

ہزار شکر وہی آئے حاکمِ دوراں　　کہ جن کے عدل سے بیکار تیغ و تیغِ زباں
غریب آن بسے پھر وطن میں ہو شاداں　　خزاں میں از سرِ نو ہے بہار کا ساماں

فلک یہ عدل سدا ان کا پائیدار رکھے
قرار ایسا انہیں دے' نہ بیقرار رکھے

ان شعراء کے بعد شاعروں کا وہ گروہ مطالعہ کا مستحق ہے جس نے انگریزوں اور ''پوربیوں'' دونوں کے مظالم کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں غیر جانبداری ہے اور ان کی شاعری سے ان حالات کا اندازہ بھی ہوتا ہے جن سے دہلی اور دوسرے شہروں کے عوام دوچار ہوئے تھے۔ قربان علی بیگ خاں سالک اور مرزا داغ اس ''اندازِ فکر'' کے سب سے نمایاں شاعر ہیں۔

سالک کے مسدس کے دو بند پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے بند میں اگر ''فوج باغیہ'' کو ایسی بادِ تند قرار دیا گیا ہے جو خاشاک کی تمنائی تھی تو دوسرے بند میں "محبس" اور ''گولیاں'' انگریزوں کے مظالم کی نشاندہی کر رہی ہیں۔

چلی تھی دہر میں گویا ہوا یہ چوبائی   کہ فوجِ باغیہ چاروں طرف سے یاں آئی
تمام شہر کی خوب آ کے خاک اُڑوائی   یہ بادِ تند تھی خاشاک کی تمنائی
رہی نہ خاک بھی امن و امان کی صورت
کچھ اور ہو گئی سارے جہان کی صورت

وہ لوگ کھائیے جن کے نشاط کی قسمیں   ہوئے ہیں طالع ناساز گار کے بس میں
محل میں رہتے تھے یاب ہوئے ہیں محبس میں   نہ تاب دل میں ہے نہ طاقت جان بیکس میں
جو تشنہ لب ہوں تو آب دم سناں موجود
جو گر سنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود

اس دور میں انگریزوں کے مخبروں کا ایک جال دہلی اور سارے ملک میں پھیل گیا تھا۔ کتنے ہی مہم پسند اور مہم جو لوگ ''مستقبل کی تعمیر'' کی خاطر انگریزوں کے مخبر بن گئے تھے۔ ان کی ہر جھوٹی سچی رپورٹ پر لوگوں کو تعزیر کا مستحق گردانا جاتا' یا پھر لوگ انہیں خوف سے ''نذرانے'' پیش کرتے۔ سالک نے اس تاریخی تلخ حقیقت کو بھی پیش کیا ہے۔

جو نقد کچھ ہے تو مخبر کا قرضدار بنا   وگرنہ بے گنہی میں گناہ گار بنا

داغ نے پوربیوں کو'' خدا کا قہر'' کہا ہے مگر انگریزوں کے بارے میں ان کے بند میں زیادہ شدت' قوت اور خلوص ہے۔ داغ نے نکتہ دانوں اور خوش زبانوں کی پرسش اور سزا کے مناظر دیکھے تھے۔ صہبائی اور مولوی محمد باقر کی شہادت ان کے دل کا زخم تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد اہل کمال نانِ شبانہ کی خاطر در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ خود داغ نے رام پور سے دکن کا فاصلہ طے کیا۔

خدا پرستی کے بدلے جفا پرستی ہے   جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے
بجائے ابرِ کرم مفلسی برستی ہے   بہ تنگ جینے سے ہیں ایسی تنگدستی ہے
غضب میں آئی رعیت' بلا میں شہر آیا
پوربی نہیں آئے' خدا کا قہر آیا

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی تلاش بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی کہ حکم عام ہے' بھرتی ہے قید خانوں کی
یہ اہل سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ

کچھ شاعروں کے یہاں اس سے زیادہ حقیقت پسندی ہے مثلاً صدر الدین خاں آزردہ اس ''آفت'' کا سبب قلعہ کو قرار دیتے ہیں۔ قلعہ سے ان کی مراد زوال پذیر سلطنت مغلیہ ہے۔ اسی طرح غلام دستگیر مبین نے تمام مصیبتوں کا سبب ''اعمالوں'' کو قرار دیا ہے۔ ''اعمالوں'' کی اصطلاح بہت وسیع ہے۔ ہم سلطنت مغلیہ کے زوال کے سلسلہ میں کردار اور اخلاقی و دینی اقدار سے متعلق گفتگو کر چکے ہیں۔ سیاسی' معاشی اور معاشرتی اسباب کے ساتھ ساتھ اس پہلو کی اہمیت سے ایسے کسی مطالعہ میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آزردہ کے مسدس میں قلعہ کے اعمال' شب و روز اور میرٹھ کے ''کالوں'' کے ذکر کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی طرف بھی واضح اشارہ ''صہبائی کے قتل'' کے تذکرہ کی صورت میں موجود ہے۔ اس دور میں شاہ پرستی سے اس طرح شاید کسی کا دامنِ ذہن صاف نہیں ہے۔

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی واں کے اعمال سے دہلی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی ''کالے'' میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے' وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے' وہ آنکھوں دیکھا

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے سر ہے اور جوشِ جنوں' سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

غلام دستگیر مبین کے دو "مسدس شہر آشوب" "فغانِ دہلی" میں شامل ہیں۔ مبین کا شاعرانہ مرتبہ کچھ ایسا بلند نہیں' لیکن ان کی حقیقت پسندی متاثر کرتی ہے۔ وہ دلی کے محاورہ کو صحت پر ترجیح دیتے ہیں۔ "اعمال" کی جگہ "اعمالوں" کا استعمال ہمیں میرامن کی یاد دلاتا ہے۔ مبین کے یہاں ایسی خودنگری ہے جو اپنا احتساب کرتی ہے اور جو اقدار کا احساس وادراک بھی رکھتی ہے۔

دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے
شکرِ نعمت نہ کیا ہم سے بد اقبالوں نے
گھر سے بے گھر جو کیا ہے تو انہیں چالوں نے
پھینکا صحرائے پُر آفت میں انہیں حالوں نے
ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

بعض شاعروں کے یہاں کچھ اور عناصر بھی ملتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی مسلمانوں میں مِلّی اتحاد پیدا نہیں ہوا' حالانکہ مشترکہ دردوغم سے اتحاد و وحدت کا پیدا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ فرقہ واریت ہمیں اس عہد کی شاعری میں تبصرہ کے طور پر ملتی ہے۔ مثلاً جامع مسجد کے سلسلہ میں حکیم محمد محسن خاں کہتے ہیں۔

وہابی ہو گئے ہیں سارے ان دنوں باہم کسی کو رکھنے نہیں دیتے اس جگہ پہ قدم

کنور بشن پرشاد فرحت کے مخمس میں دوسروں کی نسبت "شہر آشوب" کے عناصر زیادہ نمایاں طور پر موجود ہیں۔ مختلف پیشہ وروں کی تباہی و بربادی کا ذکر' شہر کے لوگوں کی مفلسی' بے کسی اور سینہ فگاری کا ماتم۔

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حال سے خوار ہے
کوئی بے کسی میں اداس ہے' کوئی رنج کے تہ بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانہ میں وہ الم سے زار و نزار ہے

کوئی ہے قلق سے شکستہ دل' کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اُٹھائے لوگوں نے غم پہ غم' نہ حساب ہے نہ شمار ہے

''فغان دہلی'' میں دہلی کے شہر آشوبوں' مسدسوں اور مخمسوں کے بعد غزل کے انداز میں دہلی کے نوحے مرتب کیے گئے ہیں۔ ان مسلسل غزلوں کی ردیف ''دہلی'' ہے اور زیادہ تر غزلیں ہم قافیہ بھی ہیں۔ مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ان غزلوں میں تاثراتی اور جذباتی رنگ ہے' ماضی کی یادیں ہیں' ذکرِ حریفانِ بادہ پیما ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی کے یہاں تہذیبی و ادبی رنگ نمایاں ہے (سالک) کسی کے یہاں شاہ پرستی کا جلوہ ہے (رام پرشاد ظاہر) کسی کے یہاں انگریزوں کے مظالم کی طرف اشارے ہیں (صغیر و مہدی) اور کہیں کہیں انگریز پرستی کی جھلک بھی ہے (تجمل)

قربان علی بیگ سالک:

حسرتوں کا ہے مکینوں کی عجب ہنگامہ ۔۔۔ رہے آباد اجڑ کر بھی مکانِ دہلی
غالب و نیرو ثاقب سے بنا ہے گویا ۔۔۔ بلی ماروں کا محلّہ' صفہانِ دہلی
سُن کے ہر شعر پہ آنکھیں نہ ہوں کیونکر نمناک ۔۔۔ سالکِ غم زدہ ہے مرثیہ خوانِ دہلی

ممتاز حسن بجنوری احقر:

کون سا غنچۂ دل ہے کہ نہ پژمردہ ہوا ۔۔۔ ہند میں ایسی چلی بادِ خزانِ دہلی

حکیم تجمل رسول خاں تجمل (شاگرد حکیم آغا جان عیش):

ہائے اے حسرت دیدار کہ خارج شدگاں ۔۔۔ گھڑیاں سر پہ ہیں اور ہیں نگران دہلی
شکر صد شکر کہ حکامِ عدالت گستر ۔۔۔ باعثِ امن ہوئے آ کے میانِ دہلی

مرزا مصطفٰی بیگ ضمیر:

کس کے آگے میں کروں آہ بیانِ دہلی ۔۔۔ چڑھ گئے دار پہ سب پیرو جوان دہلی

سید مہدی حسین مہدی:

بعض مقتول ہوئے بعضوں نے پھانسی پائی ۔۔۔ نام کو بھی نہ رہے' پیرو جوانِ دہلی

رام پرشاد ظاہر:

بارِ منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا؟ کس کے سر پر نہیں احسانِ شہانِ دہلی
کوئی ظاہر میں نہ تھا اپنی خرابی کا سبب اپنے اعمال ہوئے آفتِ جانِ دہلی

سید حسن علی خاں عابد:

فاقہ مستی اسے کہتے ہیں کہ غارت ہو کر پھر اسی رنگ میں ہیں پیرو جوانِ دہلی
غالب و شیفتہ و نیر و سالک' ثاقب جسم دہلی ہے تو یہ لوگ ہیں جانِ دہلی

اس باب کے ابتدائی حصہ میں مولانا الطاف حسین حالی کے تہذیبی مرثیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ اپنے ادبی مرتبہ کی بنا پر بھی یادگار ہے اور اس اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے کہ ظہیر دہلوی اور میر مہدی مجروح جیسے شاعروں نے اسی زمین کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے چنا۔

ویسے حالی پانی پت کے باشندے تھے لیکن ان کا ذہنی وطن دہلی ہی تھا۔ اسی وطن میں انہوں نے شیفتہ سے سخن میں استفادہ کیا اور غالب کے حضور زانوئے ادب تہ کیا۔ ان کی ایک قدیم غزل میں دہلی کے بارے میں ہمیں ان کا یہ شعر ملتا ہے۔

حالی بس اب یقین ہے' دلّی کے ہو رہے ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

اور جب حالی کو دلی سے نکلنا پڑا تو ان کے دل کی کیفیت یہ تھی۔

ڈلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

دل ہو گیا ہے لذت غربت سے آشنا اب ہم کہاں' ہوائے نشاط چمن کہاں

حالی کے یہ جذبات "تذکرۂ دہلی مرحوم" یوں ڈھل گئے ہیں جیسے انسانی تمنائیں اس کے آنسوؤں کے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ۔۔۔ نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالیؔ

یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

حالیؔ کا یہ نوحہ ۱۸۵۷ء کے خاصے عرصہ بعد لکھا گیا، جس کی داخلی شہادت انہیں اشعار سے مل جاتی ہے۔ لیکن یہ اشعار بنیادی طور پر ۱۸۵۷ء میں دلی کی بربادی کا نو ہیں۔ حالیؔ، مجروحؔ، سالکؔ اور داغؔ اس قافلہ کے پس ماندگان میں سے ہیں جو ۱۸۵۷ سے پہلے دلّی میں وقت کی گزرگاہ پر رواں دواں تھا۔ وہ قافلہ تو شاہراہ وقت سے گز گیا۔ یہ چند نغمہ خواں پیچھے رہ گئے مگر اس احساس تنہائی کے ساتھ جس کا اظہار میر مہد مجروحؔ نے اس طرح کیا ہے

گرد دیتی ہے کارواں کا پتا ۔۔۔ یادگارِ گزشتگاں ہوں میں

حالیؔ کی زمین میں ان کے "ذکر بربادیٔ دہلی" میں بھی یہی احساس تنہائی بہ نمایاں ہے۔ ان کے نزدیک دلی، اپنے مکینوں سے عبارت تھی۔ وہ مکین جوان کی زندگ حصہ تھے۔

ذکر بربادیٔ دہلی کا سنا کر ہمدم ۔۔۔ نیشتر زخم کہن پر نہ لگانا ہرگز

وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد ۔۔۔ دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز

گیتی افروز اگر حضرت نیّر رکھتے ۔۔۔ اتنا تاریک تو ہوتا نہ زمانا ہرگز

تو تو ہے انورؔ و میکشؔ کی جدائی کا نشاں ۔۔۔ دلِ پُر درد سے اے داغؔ نہ جانا ہرگز

میں ہوں اک مجمعِ احباب کا بچھڑا گل چیں ۔۔۔ مجھ کو گلدستۂ رنگیں نہ دکھانا ہرگز

جمع ہے مجمع احباب فضا میں تیری ۔۔۔ اے تصور! یہ مرقع نہ ہٹانا ہرگز

قصرِ حالی کے حوالی میں ذرا تم مجروحؔ ۔۔۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بنانا ہرگز

ان شعراء کے علاوہ دہلی کے جو شاعر ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے متاثر ہوئے، ان کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن جو کچھ پیش کیا جا چکا ہے اس سے اس شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ شاعر دلی سے باہر نکلے، مگر پردیس میں بھی یاد دلی سے انہیں کہیں نجات

نہیں ملی۔ انور ہم نوایانِ دہلی کی یاد سے جے پور میں بھی فارغ نہیں رہے۔

لوٹنا کیا ہم نوایانِ سفر کی یاد کا　　خیر ہے انور یہ کچھ دلی نہیں' جے پور ہے

زکی دہلوی کے تین شعر پیش کرتے ہوئے ہم شعرائے دہلی کے تذکرے کو ختم کرتے ہیں۔

نہ رہی باغ میں وہ آب و ہوا　　ہم بھی اب آشیاں اٹھاتے ہیں

نہ پوچھ اے دل کہ روح پرور ہوئی ہے کیا کچھ بہارِ دہلی
دمِ مسیحا' نسیم جنت بنا ہے' اُڑ کر غبار دہلی

وہ کیونکر آرام سے رہے گا' جناں میں کیا خاک جی لگے گا
نظر میں جس کی سمائی ہو گی بہارِ نقش و نگار دہلی

دہلی کے علاوہ لکھنؤ کی شاعری بھی ۱۸۵۷ء سے بہت متاثر ہوئی۔ اس کی پہلی وجہ تو یہی ہے کہ خود اودھ اس ''ہنگامے'' میں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ قوت کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ اس کے اسباب پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس باب کے ابتدائی حصہ میں مجمدار کے حوالہ سے یہ حقیقت پیش کی گئی ہے کہ دس یا گیارہ دنوں کے عرصہ میں انگریزوں کا انتظامی عمل دخل اودھ میں ایک خواب کی طرح ختم ہو گیا۔ آزادی کے یہ شعلے اودھ میں عرصہ تک فضا کو روشن اور گرم بناتے رہے۔ اس روشنی اور گرمی کے پیچھے جو شخصیتیں تھیں ان میں مولوی احمد اللہ شاہ کا اسم گرامی بہت ممتاز ہے۔ احمد شاہ ایک غیبی اشارہ کی طرح اودھ میں آئے اور اس ''کاروان آزادی'' کے سالار بن گئے۔ انگریزی حکومت انہیں اپنے لیے اس درجہ خطرناک سمجھتی تھی کہ ۱۸۵۸ء کے آغاز میں اُن کی گرفتاری کے لیے پچاس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا گیا۔

احمد اللہ شاہ کے کارناموں کو محمد تائبؔ لکھنوی نے مثنوی کی صورت میں نظم کیا ہے۔ اس مثنوی کا نام ''تواریخ احمدیہ'' ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی میں احمد اللہ شاہ کے اہم کردار اور کارناموں کی وجہ سے یہ مثنوی ۱۸۵۷ء کے واقعات کی ایک اہم شعری و تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔

مولانا احمد اللہ شاہ نے مضافاتِ لکھنؤ میں کمپنی کی فوجوں کو شکست دی اور جولائی ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کی ریزیڈنسی پر حملہ کیا۔ اسی معرکہ میں ہنری لارنس زخمی ہو کر مرا تھا۔ خود شاہ صاحب بھی اسی جھڑپ میں زخمی ہوئے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مجاہدین کی سربراہی کرتے رہے۔ تائب لکھنوی نے اس واقعہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

روایت ہے یہ بھی کہ وقتِ مصاف لگی گولی اس شیر کے زیرِ ناف
نہ مرہم کو تا زخم جانے دیا نہ دل پر کبھی میل آنے دیا

اس مثنوی میں شاعرانہ حسن کے فقدان کے باوجود واقعات کے بیان میں روانی اور تسلسل ہے۔

۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کے خاتمے کا ماتم ابھی زبانِ قلم پر تھا کہ یہ نیا انقلاب رونما ہوا اور شعرائے لکھنؤ تو اپنے دیار کے ماتم گسار تھے ہی، لکھنؤ کے المیہ نے دلی کے شاعروں کو بھی متاثر کیا۔ فغان دہلی میں حکیم آغا جان عیش کا جو کلام شامل ہے، وہ اس کی شہادت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ہو گیا ویران دہلی و دیار لکھنؤ اب کہاں وہ لطف دہلی و بہار لکھنؤ

انیس کی مشہور رباعی

کیونکر دل غمزدہ نہ فریاد کرے

یقیناً اودھ کی ضبطی سے متعلق ہے۔ لیکن مجموعۂ رباعیات انیس میں کئی رباعیاں ایسی ہیں جن کا حلقہ اودھ سے زیادہ وسیع معلوم ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں رباعی ۲۸۲ کا عنوان ہی "انقلاب ہند" لکھا گیا ہے۔[۷۸] ..... رباعی یہ ہے:

افسوس زمانہ کا عجب طور ہوا
کیوں چرخِ کہن آہ "نیا دور" ہوا
اب یاں سے کہیں اور چلو جلد انیسؔ
اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

---

[۷۸] مجموعۂ رباعیات میر انیس مرحوم، مرتبہ سید محمد عباس، صفحہ ۲۴۰، لکھنؤ ۱۹۴۸ء

''یاں'' کے ٹکڑے کی تاویل یقیناً مختلف انداز سے کی جا سکتی ہے۔ اسے اودھ بھی قرار دیا جا سکتا ہے ''ہندوستان'' بھی۔ ''ہندوستان'' اس بنیاد پر کہ یہ انقلاب عظیم مذہب پرست شاعر کو ترک وطن یا ہجرت کی دعوت دے رہا ہے۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں تنگ آ کر دیار رسول اللہ ﷺ یا کسی زیارت گاہ (کربلا، نجف اشرف وغیرہ) میں زندگی کے باقی دن گزارنے کی تمنا کا اظہار کلاسیکی اردو شاعری میں عام بات ہے۔

مجموعۂ رباعیات انیس کے ضمیمہ میں وہ رباعیات ہیں جو سید محمد عباس نے محمد امیر حیدر خاں ''مہاراجکمار'' محمود آباد اور سید محمد اطہر زائر سیتا پوری کے مجموعوں سے حاصل کی ہیں۔ ضمیمہ کی رباعی ۱۸۵۷ء سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔

پوچھو نہ خبر کہ بے خبر ہیں اب تو　　آوارہ وطن خاک بسر ہیں اب تو
مانند نگیں خاک نشیں تھے آگے　　حلقے کی طرح سے دربدر ہیں اب تو

سحر لکھنوی کا قصیدہ ''شہر آشوب'' ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے خیال کے مطابق ۱۸۵۷ء سے متعلق ہے۔[۱۴۱] یہ قصیدہ شہر آشوب کی روایات کے مطابق ہے کیونکہ اس میں مختلف پیشوں کے افراد کی بے قدری کا حال پیش کیا گیا ہے۔

ہیں عطارد کی طرح اہل قلم چکر میں
صورتِ بدر ہیں گردش میں تمام اہل کمال
نیستی پھیلی ہے اب شہروں میں کنگلوں کی طرح
لوگ واقف نہیں دینے سے بجز حرفِ سوال
مدتوں سے نہیں دیکھی ہے روپے کی صورت
لوگ سب بھول گئے سبز تھی رنگت یا لال

منیر شکوہ آبادی کے بارے میں سکسینہ اور بعض دوسرے مؤرخوں نے تو یہ لکھا ہے کہ ''بعد غدر ایک رنڈی مسمات نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی۔[۱۴۲] لیکن یہ روایت چنداں قابل اعتبار نہیں ہے۔

---

[۱۴۱] لکھنؤ اور جنگ آزادی مطبوعہ ادبی اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۵۷ء (مقالہ نور الحسن ہاشمی)

[۱۴۲] بحوالہ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صفحہ [illegible]

انگریزوں نے اگر ایک طرف انصاف کے ہر تقاضے کو ٹھکراتے ہوئے ۵۷ء کے بعد مظالم کی انتہا کر دی تو دوسری طرف اپنے اسیروں کو ناوک دشنام و تہمت سے بھی گھائل کیا۔ منیر کی پوری زندگی اور خاص طور پر ایام اسیری پر نظر ڈالتے ہوئے اس الزام کے حق میں ہمیں کوئی دلیل نہیں ملتی۔ دوسری طرف بعض شہادتوں اور قرینوں سے ان کے سیاسی قیدی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً شہید مالٹا حکیم سید نصرت حسین صاحب کے بارے میں ان کے بیٹے صدیق حسن (کوڑہ جہاں آباد) نے قلم اٹھاتے ہوئے منیر کا ذکر بھی ضمنی طور پر کیا ہے۔

> ''میرے والد اسیران مالٹا کی جماعت کے پہلے شہید ہیں مگر ان سے پہلے ایک اور پاک روح نے انڈیمان میں اپنی جان، جان آفریں کے حوالہ کی تھی۔ یعنی مولانا فضل حق خیر آبادی نے، جو منیر شکوہ آبادی کے ساتھ سرکار انگلشیہ سے بغاوت کے الزام میں گرفتار کیے گئے اور یہاں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ کو انتقال فرمایا۔ اسیران مالٹا پر وہابی ہونے کی تہمت لگی اور غریب ''منیر پر طوائف کشی کی''۔[۴۳]

مُنیر شکوہ آبادی نے مولانا فضل حق خیر آبادی کا جو مرثیہ لکھا ہے، اسے بھی ۱۸۵۷ء سے متعلق شاعری میں شامل کرنا مناسب ہے۔ مولانا خیر آبادی انگریزوں کے قبضۂ دلی کے بعد کئی دن گھر میں بھوکے پیاسے رہے۔ پھر عام معافی کے اعلان کے باوجود گرفتار کیے گئے، جائیداد ضبط کی گئی اور کالے پانی کی سزا دی گئی۔ منیر کے مرثیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان دنوں کو ایک ساتھ سزا دی گئی تھی اور کالے پانی میں بھی ساتھ ساتھ رکھے گئے تھے، جہاں دونوں کا ادبی کام جاری رہا۔ مولانا خیر آبادی نے ''الثورۃ الہندیہ'' کے عنوان سے انڈمان میں ۱۸۵۷ء کے واقعات عربی میں لکھے تھے۔ اس کے علاوہ عربی میں قصیدے بھی تحریر کیے تھے۔ ''رسالہ الثورۃ الہندیہ'' کا ترجمہ ''باغی ہندوستان'' کے نام سے اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ عربی متن بھی دستیاب ہے۔ منیر ان

---

۴۳ خط بنام راقم الحروف مکتوبہ ۱۲ نومبر ۱۹۶۴ء (حکیم نصرت حسین راقم الحروف کے پھوپھا تھے)۔

کے متعلق لکھتے ہیں:

مولوی بے نظیر فضل حق اسم شریف دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم ختم ہوا جب تھے وہ ہمدم گور و کفن

انڈیمان بھیجنے سے پہلے منیر کو باندہ میں قیدی کی حیثیت سے رکھا گیا تھا۔ وہ والئ باندہ کی ملازمت میں تھے۔ باندہ میں منیر کو جو اذیتیں پہنچیں وہ اتنی شدید تھیں کہ وہاں سے کالے پانی پہنچنے کو انہوں نے خانۂ زنجیر سے نکلنے سے تعبیر کیا ہے۔

کوٹھری تاریک پائی مثل قبر تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
بول و غایط کی جگہ بستر کے پاس تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں نانِ گندم تھی سوا اکسیر سے
بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی سخت دانۂ دانۂ انجیر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک کٹ گئی قید ستم، تقدیر سے

یہ کہی تاریخ ہم نے اے "منیر"
"صاف نکلے خانۂ زنجیر سے"

(۱۲۷۷ھ)

منیر ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء کے واقعات سے جس طرح متاثر ہوئے تھے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔ "شاہان سلیمان منزلت" کی ترکیب محض "برائے بیت گفتن" نہیں معلوم ہوتی بلکہ لکھنؤ و دہلی کے فرماں رواؤں کی طرف اشارہ ہے۔ منیر قلعوں کے کھدنے اور محلوں کے تباہ ہونے کے ساتھ ساتھ عام آدمی کے دکھ درد اور مسجدوں کی ویرانی کے نوحہ گر بھی ہیں۔ وہ ایسا "دلِ سوزاں" رکھتے تھے اور ایسی مذہبی افتادِ طبع کے مالک تھے کہ ان کی شاعری کے آئینے میں جو ذہنی شخصیت ابھرتی ہے، وہ طوائف کے قتل پر مائل نظر نہیں آتی۔

ہو گئے برباد شاہانِ سلیماں منزلت
اب بلا کہیں ہوں گی تو کیا ادنیٰ اس کے ...

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومعے ویران ہیں
یادِ حق میں ایک دو دلہائے سوزاں ہوں تو کیا
مٹ گئے قصرِ معلّٰی کھد گئے زریں محل
رنج سے معمور گر دل ہائے ویراں ہوں تو کیا

میر سادات حسین (آغا جو) شرف کی مثنوی فسانۂ لکھنؤ میں لکھنؤ کے انتزاع کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کا بڑی تفصیل اور جزئیات کے بیان کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ شرف واجد علی شاہ کے سمدھی تھے۔ یہ مثنوی ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں بمقام مٹیا برج کلکتہ لکھی گئی''۔[۴۴] اس مثنوی میں واقعاتی انداز پوری طرح موجود ہے۔ جب آزادی کے لیے لڑنے والے سپاہیوں نے برجیس قدر کو اودھ کا بادشاہ بنانے کی تجویز پیش کی۔ اسے شرف نے یوں نظم کیا ہے۔

وہاں محمود خاں کا تھا کُل اختیار لگے کہنے ان سے تلنگی سوار
اگر آپ شہزادے تک لے چلیں تو ہم ان کے قدموں سے آنکھیں ملیں
یہاں سے چلیں، چل کے لیں تخت و تاج ہم ان پر تصدق ہوں، راجیں وہ راج
خدا نے بڑھایا ہے اقبال و جاہ یہاں غیب سے بھیج دی ہے سپاہ

۱۸۵۷ء کے بارے میں لکھنؤ کے ادب اور شاعری کا سلسلہ بہت عرصے تک جاری رہا۔ جس طرح دلی میں دلی کا یہ دور بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی تک کئی ادیبوں کا خاص موضوع رہا۔ (راشد الخیری، ناصر نذیر فراق۔ خواجہ حسن نظامی۔ خواجہ محمد شفیع۔ اشرف صبوحی وغیرہ) ایسی تحریروں میں فسانۂ دلفریب خاصا اہم ہے، جس کے ساتھ ایک طویل مسدس شامل ہے۔ غالباً یہ نام رجب علی بیگ سرور کے ''فسانۂ عبرت'' سے متاثر ہو کر رکھا گیا ہے۔ فسانۂ عبرت انتزاع سلطنت اودھ تک کی تاریخ ہے اور فسانۂ دلفریب میں ''غدر'' کا تفصیلی حال ہے۔ مسدس بھی ۵۷ء سے متعلق ہے۔ یہ منشی فدا علی عرف اچھے صاحب عیش کی تصنیف ہے اور سال تصنیف ۱۸۹۲ء ہے۔

۴۴۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ لکھنؤ اور جنگ آزادی، صفحہ ۱۱۳

اچھے صاحب عیش سے لکھنؤ کی داستان غدر سنیے۔

"بے انتظامی کی تہمت' غفلت کی بدنامی واجد علی شاہ کے سر دھری۔ لارڈ ڈلہوزی کی رائے سے انگریزوں نے خلافت لے لی...... ابھی یہ زخم آئے تھے کہ میرٹھ میں فساد ہوا۔ کارتوسوں نے تمام عالم میں آگ لگا دی۔"

تلنگوں کی محسن کشی' مظلوموں کی فریاد نے پانسہ پلٹ دیا۔ انگریزوں نے تھوڑی سی فوج فراہم کر کے ہر جگہ اپنا عمل کر لیا۔ لکھنؤ میں ہزاروں بم کے گولے اتارے۔ آگ برسا دی' معاذ اللہ شہر میں چل پوں مچل گئی۔ یہ حال ہوا' صدہا مکان ٹوٹے' سینکڑوں کا انتقال ہوا' ان سے جو بچے انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ کچھ اسباب لیا' کچھ نہ لیا۔ شہر کے تین ناکے بند تھے...... ایک ناکہ کھلا تھا۔ بھاگنے کا وہی راستہ تھا...... جب لکھنؤ رعایا سے خالی ہوا' مکانوں کے کھدنے کا حکم ملا۔ لاکھوں گھر کھد کر زمین کے برابر ہو گئے۔ آبادی کا نشان کیسا نام تک نہ رہا۔ لکھنؤ سنسان ہو کا مکان ہو گیا...... اگر یہ داستان بھی تحریر کروں تو ایک طومار ہو جائے۔ پڑھنے والوں کو دشوار ہو جائے فقط ایک مسدس مسمی بہ انقلاب لکھنؤ پر اکتفا کرتا ہوں"۔ [۴۵]

اس مسدس کے تین بند ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

اب تو مدت سے ہے یہ موردِ آفات و بلا ۔۔۔ کون سا غم ہے جس کا نہیں ہم کو شکوہ
رہ گیا رنج' ہوا نام مسرت' عنقا ۔۔۔ جب ہو ناراض خدا' کون سُنے حال اپنا
ساقیِ مرگ لیے موت کا جام آتا ہے
روز اک تازہ مصیبت کا پیام آتا ہے

اب کہاں اس کی وہ رونق وہ شکوہ اور وہ شان ۔۔۔ اگلی باتوں کا نہیں خواب میں بھی نام و نشاں
نہ وہ پوشاک نہ وہ لوگ' نہ وہ لُطفِ زبان ۔۔۔ دیکھ لیں آنکھوں سے احباب' عیاں راچہ بیاں

۴۵ بحوالہ لکھنؤ اور جنگ آزادی صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۹

اب یہ تہذیب ہے یوں چال بشر چلتے ہیں
سیٹیاں منہ سے بجاتے ہیں' جدھر چلتے ہیں

مرثیہ غدر کا لکھنا نہیں مجھ کو منظور ایک دفتر ہو' اگر حال کروں سب مسطور
اس لیے شان سے تاریخ کے اجمال ہے دور شکلِ آبادی و ویرانی دکھانا ہے ضرور

گھر ہیں ویران' نئی چرخ کی بیدادی ہے
نام کو چند محلوں میں کچھ آبادی ہے

فسانۂ دلفریب میں ''صدہا مکان'' ٹوٹنے کے بیان سے بڑی حد تک یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امیر مینائی کی مشہور رباعی ۱۸۵۶ء میں انتزاع اودھ سے متعلق نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے انہیں واقعات سے تعلق رکھتی ہے اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا یہ بیان درست ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تباہی میں امیر لکھنؤ میں ہی موجود تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے مصائب کا ذکر ایک رباعی میں کیا ہے۔[۴۶] ان شاعروں اور خاص طور پر فسانۂ دلفریب کے ذکر کے بعد امیر مینائی کے تذکرہ سے ہماری غرض اسی نکتہ کی وضاحت ہے کہ ان کی یہ رباعی اور بعد کا کلام ۱۸۵۷ء سے متعلق ہے' کیونکہ وہ اسی ''ہنگامہ'' کے بعد لکھنؤ سے نکلے تھے۔ امیر کی رباعی درج ذیل ہے۔

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے ہیں گھر سے رخصت ہو کر یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

امیر لکھنؤ سے نکلے۔ چندے کاکوری میں محسن کاکوروی کے ساتھ رہے پھر دربار رام پور سے وابستہ ہوئے۔ وہاں ایک طویل مدت گزار کر آخر میں حیدر آباد دکن گئے اور ۱۹۰۰ء میں وہیں کی خاک کا حصہ ہو گئے۔ جس طرح ظہیر زندگی بھر دِلی کے نوحہ گر رہے' اسی طرح امیر لکھنؤ کے غم میں آنسو بہاتے رہے۔

مراۃ الغیب ان کے مطبوعہ دواوین میں سب سے پہلا دیوان ہے۔[۴۷]

---

۴۶ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی' لکھنؤ کا دبستان شاعری' صفحہ ۴۰۱ طبع اول ۱۹۴۴ء

۴۷ حوالۂ بالا صفحہ ۴۰۲

اس میں غریب الوطنی' وادیٔ غربت' یاد وطن و اہل وطن' ہر شہر میں فتنۂ آسمان کا ذکر کم وبیش ہر غزل میں موجود ہے۔ لکھنؤ کی بزم میں ابھی جام عیش ان کے ہاتھوں میں آیا ہی تھا کہ شربت عیش زہر میں بدل گیا' بہار خزاں بن گئی' وہ ہنگامۂ عشرت ختم ہوا اور بلبلیں چمن سے منتشر ہو گئیں۔ ۱۸۵۷ء کے پس منظر ہی میں امیر کے ایسے اشعار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غزل گو شاعر خارجی واقعات اور سانحات کو دل کی زبان میں کس طرح بیان کرتا ہے اور زمانے کے ذکر کو اپنی حدیث دل کیسے بناتا ہے؟ اس حقیقت کا اظہار امیر کے ایسے اشعار سے ہوتا ہے۔

اب بلبلیں چمن میں کہاں؟ آ گئی خزاں   تھی دھوم چار دن کی' وہ ہنگامہ ہو گیا

○○○

عمر گزری ہے مری وادیٔ غربت میں مگر   اب تلک یاد ہے کچھ کچھ مجھے گھر کی صورت

○○○

گریہ بے سود ہے' نالے دل ناشاد عبث   داد رس کوئی نہیں' شکوۂ صیاد عبث

○○○

سارے عالم میں پھرے ہم نہ ملی امن کی جا   پہنچے جس شہر میں دیکھا کہ قضا ہے سر پر

○○○

غربت نے نام اہل وطن کے بھلا دیے   بھیجوں کسے میں لکھ کے الٰہی سفر سے خط

○○○

وطن کی یاد ہے لیل و نہار غربت میں   یہی ہے ایک بڑی غمگسار غربت میں
کبھی کبھی تو لکھو نامہ کوئی اہل وطن   کہ بڑھ کے موت سے ہے انتظار غربت میں

○○○

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں کی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

○○○

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں
پھرتے تھے یونہی ہم بھی، خوش خوش کبھی وطن میں

OOO

کیا گرم ہیں کہ کہتے ہیں خوبان لکھنؤ لندن کو جائیں وہ جو فرنگن کے یار ہیں

OOO

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

امیر کی غزلوں سے جو چند اشعار پیش کیے گئے، ان سے ایک طرف تو غزل کے آئینہ میں ملکی و سیاسی مسائل کی تصویر دیکھنے کی تربیت ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ امیر محض روایتی شاعر نہیں تھے۔ شعر کی وادیوں میں ان کی ''حدیث عمر گزراں'' بکھری ہوئی ہے۔ ''بلبل''، ''چمن''، ''وادیٔ غربت''، ''گریہ''، ''باغبان'' ان سب اشاروں سے ہمارے شاعروں نے ہر دور میں اپنے دور کے کوائف کا اظہار کیا ہے اور اسی لیے فارسی سے مستعار لیے ہوئے ان اشاروں کو اردو غزل کے ہر عہد میں نئی معنویت حاصل ہوتی رہی۔

دہلی اور لکھنؤ ہنگامۂ آزادی کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کے مرکز بھی تھے، لیکن یہ آگ کم وبیش سارے شمالی ہند اور خاص طور پر صوبۂ متحدہ میں پھیل گئی تھی۔ اس عہد کے دوسرے مقامات اور مراکز کے شاعروں کے یہاں بھی اس واقعہ کی عکاسی اور اس پر تبصرہ ملتا ہے۔ وحید کڑوی، اکبر الٰہ آبادی کے استاد تھے۔ کڑا جو عہدِ سلاطین سے عہدِ مغلیہ تک ایک نہایت اہم مقام رہا ہے، رفتہ رفتہ اس درجہ غیر اہم اور غیر معروف بن گیا کہ آج وحید کڑوی کو وحید الٰہ آبادی کہا جاتا ہے۔ اُن کے دیوان کا انتخاب (مرتبہ علی حسنین زیبا ردولوی) انجمن ترقی اُردو ہند شائع کر چکی ہے۔ وحید کا مکمل قلمی دیوان جناب عادل عثمانی ڈپٹی لائبریرین جامعۂ کراچی کے پاس موجود ہے۔ یہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں کئی ایسی غزلیں اور اشعار موجود ہیں جو ۱۸۵۷ء سے متعلق ہیں۔

لالۂ خوش رنگ تھا، جانِ چمن کیا ہو گیا　　جلوۂ شمعِ شبستانِ چمن کیا ہو گیا
اپنے موقع پر نظر آتا نہیں کوئی نہال　　انتظام نخل بندانِ چمن کیا ہو گیا
جس کو دیکھو بے اجازت اب وہ رکھتا ہے قدم　　اہتمام اہل کارانِ چمن کیا ہو گیا
آب و تابِ چہرۂ گلہائے خنداں کیا ہوئی　　جلوۂ روئے حسینانِ چمن کیا ہو گیا

غنچہ و گل، یارو ساقی، شیشہ و جامِ شراب
اے وحید اپنا وہ سامانِ چمن کیا ہو گیا

۱۸۵۷ء سے متعلق ایک نہایت طویل مثنوی ہے جس میں محض یو۔ پی کے اضلاع مشرقی اور خاص طور پر گورکھپور کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ''کشف البغاوت گورکھپور'' ہے اور سید احمد علی شاہ ''رئیس اعظم'' گورکھپور کی تصنیف ہے۔ ۱۸۶۰ء مطابق ۱۲۷۶ھ میں یہ کتاب مطبع حیدری آگرہ سے شائع ہوئی۔ ان کا شعری مرتبہ بلند نہیں، لیکن واقعاتی اعتبار سے مزے کی چیز ہے۔ مصنف حد درجہ انگریز پرست ہے۔ واقعات پر تبصرہ اسی نقطۂ نظر سے کرتا ہے، لیکن اس کتاب سے گورکھپور اور مشرقی اضلاع میں ۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات بڑی تفصیل سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ عہدہ داروں ''اور باغیوں'' کے ناموں کی فہرست بھی اس مثنوی میں کافی طویل ہے۔ اس کے واقعاتی پھیلاؤ اور تفاصیل کا اندازہ اس کے چند عنوانوں سے ہو سکے گا۔ ''خبر ضلع اعظم گڑھ موقوعہ تاریخ سوم ماہ جون ۱۸۵۷ء حکایت ضلع گورکھ پور'' حکایت بربادئ محی الدین پور'' ''کیفیت رؤسائے شہر'' ''حکایات ظفریابئ سرکار و ابتری باغیان'' ''کیفیت شاہِ دہلی'' ''الطاف سرکار'' ''ترجمہ اشتہار ملکۂ معظّمہ مشتمل بر عفوِ تقصیر باغیاں'' وغیرہ۔

سید احمد علی شاہ محض ذہنی طور پر انگریز پرست نہیں تھے بلکہ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے پوری طرح انگریزوں کا ساتھ دیا۔ نیپال کی فوجیں جب انگریزوں کی مدد کے لیے آئیں تو اس مثنوی کا مصنف ان کے لیے سامان رسد فراہم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ ''حکایت افواج نیپال'' کے ذیل میں سید احمد علی شاہ لکھتے ہیں:

اعانت طلب جب ہوئی کمپنی　　تو افواج راجہ وہاں سے چلی

چلی فوج نیپال بے حد و کد — تو پہنچا مرے پاس حکمِ رسد
رسد کے لیے ایک شقہ لکھا — جو کچھ تھا ضروری سو میں نے دیا
ہوا جب کہ بھرائچ میں آ مقام — بخوبی رسد کا کیا انتظام
طلب گاڑیوں کو بھی مجھ سے کیا — اور شقہ میں مضمون ایسا لکھا
جو ممکن ہو گاڑی علاقے سے دو — کہ اس وقت سرکار کا کام ہو
کیا میں نے گاڑی کا بھی انتظام — بخوبی کیا اس کا بھی انصرام

۱۸۵۷ء کے پسِ منظر' اسباب اور اردو شاعری پر ۱۸۵۷ء کے اثرات پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی گئی۔ یہ شاعری تاریخی طور پر ہمیشہ مطالعہ کی مستحق رہے گی اور اس کا ایک حصہ ادبی طور پر بھی زندہ رہے گا۔ ۱۸۵۷ء نے بعد کے شعراء کو بھی آزادی کے حصول تک متاثر کیا۔ ظفر علی خان' جوش ملیح آبادی اور دوسرے انقلابی شاعروں کے کلام میں ۱۸۵۷ء کے نعرۂ بغاوت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے مظالم ہیں۔ جب جنرل (Neil) کلکتہ سے بنارس اور الٰہ آباد کی طرف بڑھا تو اس نے میجر رینالڈ (Renalled) کو تحریری حکم دیا تھا کہ ''راستہ میں ہر مقام اور ہر چیز کو تباہ کر دو''، جلے ہوئے مکانات اور درختوں سے لٹکی ہوئی لاشیں اس راستے میں ہر جگہ نظر آتی تھیں۔ کیئی (Kaye) نے بھی ان مظالم کا اعتراف کیا ہے۔ ''تاریخ محاصرۂ دہلی'' ایک ایسے برطانوی افسر کی تحریر ہے جو اس محاصرہ میں شریک تھا۔ اس نے اس دور کی برطانوی ذہنیت اور جذبۂ انتقام کو یوں پیش کیا ہے۔

Officers now went to courts-martial declaring that they would hang prisoners whether guilty or innocent.[۴۸]

شاعری کے اس مطالعہ سے ہمارے سامنے دوسری حقیقت یہ آتی ہے کہ ہندو شاعروں (اور مجموعی طور پر دوسرے اہل قلم) نے اس تحریک یا ہنگامہ سے اپنے آپ کو اسی طرح الگ رکھا' جس طرح عام ہندوؤں نے۔ اس بنیاد پر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کے لیے ہمیشہ مسلمانوں کو ذمہ دار سمجھا۔ ''تاریخ محاصرہ دہلی'' کے برطانوی

---

۴۸ بحوالہ مجمدار ''تاریخ تحریک آزادیٔ ہند (انگریزی) جلد اول صفحہ ۲۲۵

افسر اور مؤرخ کے الفاظ میں ''مسلمان عام طور پر ہمارے شدید مخالف تھے' جب کہ ہندوؤں کا برتاؤ اتنا مخالفانہ نہیں تھا''۔ [۴۹]

آخر میں یہ عرض کر دینا غیر مناسب اور بے موقع نہ ہوگا کہ ۱۸۵۷ء نے صرف اردو شاعری اور برعظیم کی تاریخ ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ایشیا کی سیاست پر بھی اثر ڈالا۔ پنڈت سندر لال نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ

> ''جس انگریزی فوج کی مدد سے لارڈ کیننگ نے ہندوستان کو پھر سے فتح کیا' اس میں سے زیادہ تر چین پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو چکی تھی اور لارڈ کیننگ نے ہندوستان کی آفت کو دیکھ کر اسے بیچ ہی میں روک لیا''۔ [۵۰]

اسی طرح ہندوستان کی ناکام ''جنگ آزادی'' سے سبق لیتے ہوئے جاپانیوں نے اپنی ۲۷۳ ریاستوں کو ملا کر ایک مرکزی حکومت قائم کی۔ ہربرٹ اسپنسر نے بھی جاپانیوں کو ہندوستان کے واقعات ۵۷ء سے سبق لینے کے لیے خط لکھا۔ [۵۱] یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ منظم قیادت اور منصوبہ بندی کے بغیر یہ تحریک برعظیم میں تو وقتی طور پر ناکام رہی' لیکن اس کے اثرات اگر ایک طرف ہمارے سیاسی مستقبل پر پڑے تو دوسری طرف ایشیاء کے ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے اور اس کے تمدنی اثرات تو اتنے گہرے ہیں جن پر گفتگو کا حق اس محقق یا لکھنے والے کو حاصل ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد کی زندگی کے مطالعہ کو اپنا موضوع بنائے۔

---

۴۹ بحوالہ مجمدار ''تاریخ تحریک آزادی ہند'' (انگریزی) جلد اول صفحہ ۲۷۴

۵۰ پنڈت سندر لال۔ سن ستاون۔ صفحہ ۲۵۵' انجمن ترقی اردو ہند' ۱۹۵۷ء

۵۱ حوالۂ بالا

۵۱ حوالۂ بالا

اس عہد کی شاعری کا
فنی، لسانی، فکری اور تمدنی تجزیہ

اس عہد کی شاعری کا
فنی' لسانی' فکری اور تمدنی تجزیہ

گزشتہ ابواب میں اردو شاعری کے آئینے میں تاریخی واقعات اور تحریکوں کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی حقیقت کا دوسرا پہلو تاریخی واقعات و تحریکات کی روشنی میں اردو شاعری کا مطالعہ ہے۔ ہم نے دونوں پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی اردو شاعری واقعات کی ترجمانی کی منزل سے گزر کر آزادی کے احساسات و جذبات بلکہ تحریک آزادی کی نقیب بن گئی تھی۔ اس طرح مختلف مقامات پر بعض دوسرے مباحث پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً اُردو شاعری کے موضوعات کا تنوع' اردو شاعری کی علامتیں اور شاعری میں مقامی عناصر' تہذیبی محرکات' فارسی کے اثرات' تصوف اور شاعری وغیرہ۔ اس جائزہ کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری شاعری نے ایک زندہ اور نامیاتی وجود کی طرح حقائق اور گرد و پیش کی زندگی سے اثر قبول کیا ہے اور اسے متاثر بھی کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء کا نقاد یہ کہنے پر مجبور تھا کہ "یہ صدائیں عام ہوگئیں کہ قدیم رنگ کی اردو شاعری میں سوائے گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کے مضامین کے کیا رکھا ہے"[۱] آج کلاسیکی ادب و شعر کے مطالعہ کے بعد اتنی قطعیت کے ساتھ تو اردو شاعری پر ایسا حملہ نہیں کیا جاتا لیکن کلاسیکی شاعری کے معاشرتی' سیاسی اور تہذیبی پہلوؤں کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

اس باب کا مقصد واقعاتی تفاصیل سے دامن بچا کر اس عہد کی شاعری کا مختصر فنی' لسانی' فکری اور تمدنی تجزیہ پیش کرنا ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ

۱۔ چکبست' رسالہ صبحِ امید لکھنؤ' نومبر ۱۹۱۸ء (عنوان مقالہ' اردو شاعری)

ہم نے بعض اہم لیکن ایسے پہلوؤں پر محض اشاروں کو کافی سمجھا ہے جن پر دوسرے اہل قلم تفصیل سے یوں لکھ چکے ہیں کہ موضوع کا حق بڑی حد تک ادا ہو گیا۔ مثلاً دکنی کلچر (اس کلچر کے مظاہر) پر نصیر الدین ہاشمی کی تفصیلی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اسی طرح ''لکھنویت'' اور ''دہلویت'' کے فکری، فنی اور ثقافتی گوشوں کی نشاندہی ادبی اور علمی سطح پر اکثر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کر چکے ہیں۔ اُردو پر فارسی کے اثرات کا ذکر تو عام طور پر کیا جاتا ہے، ہمارے نزدیک اس کا دوسرا رُخ یعنی فارسی پر اردو کا اثر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں قلم اٹھا چکے ہیں۔ ہم نے ایسے موضوعات کو نظر انداز نہیں کیا لیکن تفصیلات سے گریز کیا ہے۔ مجموعی طور پر کوشش یہی رہی ہے کہ اس تجزیہ میں اہم پہلو سامنے آ جائیں۔

قدیم اردو شاعری کے مطالعہ کی طرف گزشتہ پندرہ بیس سال میں خاصی توجہ کی گئی ہے، لیکن ابھی بعض مسائل پر ہم شرماتے ہوئے تاویل کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات تو مختلف مقالوں میں پیش کی گئی ہے کہ اردو شاعری میں ''مقامی عناصر اور مقامی رنگ'' ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس حقیقت کو بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہمارے نقادوں نے شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنا شروع کیا لیکن اس حقیقت کے دوسرے پہلو پر خاموش رہا جاتا ہے اور وہ دوسرا پہلو ہے ''اردو شاعری میں غیر ملکی (عربی، بالخصوص ایرانی) تلمیحات، مقامات اور اشیا کا ذکر۔ اس بات کو برعظیم میں مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کے مطالعہ کی مدد ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے شہنشاہ اکبر کو ایک نئی ہندوستانی قومیت کا بانی قرار دیا ہے:

> ''اس نئی ہندوستانی قومیت کی جو اکبر نے تعمیر کی، سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا مرکز مذہب نہیں ریاست تھی''۔[۲]

''قومیت'' کی تعمیر یوں نہیں ہوتی۔ قومیت کی تعمیر ایک طویل اور تدریجی مرحلہ ہے۔ اس کے ماسوا اسلام ہر ملک اور ہر دور میں ''مسلمانوں کی قومیت اور اس کی

۲؎ ڈاکٹر عابد حسین، قومی تہذیب کا [illegible]، ص ۱۲۵، علی گڑھ ۱۹۵۵ء

اساس'' رہا ہے' یہ ضرور ہے کہ مختلف ادوار اور ممالک کے مخصوص تقاضوں کے پیش نظر اس کے ڈھانچے اور خارجی مظاہر مختلف رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ہر ملک اور اپنی تاریخ کے ہر دور میں اُن مقامی عناصر کو اپنے نظام فکر اور زندگی میں جگہ دی جن کا ان کے دین سے ٹکراؤ نہ ہو۔ بہت واضح مثال کے طور پر ہم برعظیم میں مسلمانوں کے فن تعمیر کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ فن تعمیر اگر ایک طرف مسلمانوں کے دینی تقاضوں (روح القدس کا ذوق جمال) کی تکمیل کرتا ہے تو دوسری طرف اس میں ''عجم کے حسن طبیعت'' اور ''عرب کے سوز دروں'' کے ساتھ ساتھ برعظیم کے اثرات بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ فن تعمیر میں ہندو مسلم عناصر کی ترکیب و امتزاج کا عمل سلطنت دہلی کے زمانے ہی میں شروع ہو چکا تھا''[۳]

مسلمانوں نے ایرانی اور ہندوستانی عناصر کو اپنے دینی' اجتماعی اور تمدنی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فن تعمیر میں یکجا کر دیا اور اس طرح کہ یہ دونوں عناصر ''وحدت کے سانچے میں ڈھل گئے''۔ یہی عمل ہمیں برعظیم کے دوسرے فنون لطیفہ میں بھی نظر آتا ہے۔ مختلف فنون میں تو' ہم متضاد اور مختلف عناصر کی یکجائی کو ایک تہذیبی کارنامہ قرار دیتے ہیں' مگر اُردو شاعری کے سلسلہ میں اسی بات کو فراموش کر جاتے ہیں اور ''کوہ طور'' ''فاران'' ''جیحون'' اور ''دجلہ'' وغیرہ کی موجودگی ہمیں اس بات کا ثبوت معلوم ہوتی ہے کہ ہماری شاعری کا گرد و پیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو ایک کمزور سا رشتہ۔

یہ درست ہے کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید کی۔ اس کا اظہار اسالیب بیان اور اصنافِ سخن دونوں سے ہوتا ہے' لیکن ہم ایک زیادہ واضح بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں یعنی اس عہد کے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کا باہمی رابطہ اور رشتہ۔ مسلمانوں کی برادری سارے ایشیا میں پھیلی ہوئی تھی' جس کو اپنی مشترک روایات و اقدار عزیز تھیں۔ تاریخ کے اولین ادوار میں ہر قوم اپنی ایک ''دیو مالا'' مرتب کر لیتی تھی تا کہ

---

[۳] ڈاکٹر عابد حسین' قومی تہذیب کا مسئلہ' ص ۱۳۸' ۱۳۷

اس دیو مالا کو اپنی وحدت کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسلمانوں کو صنمیات اور دیو مالا کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ تو تاریخ کا عہد نو ہیں۔ ان کی تاریخ اور روایات و اقدار نے صنمیات کی جگہ لے لی۔ یہ اقدار و تصورات عربی سے فارسی میں منتقل ہوئے اور فارسی کے وسیلے سے اُردو تک پہنچے۔ ویسے یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ہر جگہ یہ "وسیلہ" بھی موجود نہیں ہے۔ اردو پر عربی کا راست اور بلاواسطہ اثر بھی پڑا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اپنے ایک طویل مقالے ثقافتی اردو (مطبوعہ نیا دور کراچی ۱۹۶۰ء) میں ہماری زبان کے اس پہلو کا جامع جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ اردو کے اکابر شعراء کے یہاں قرآنی آیات، احادیث، عربی مقولے، عربی کے ٹکڑے اور عربی اشعار کے ترجمے کثرت سے ملتے ہیں مثلاً:

رات کو آوں اگر تیری گلی میں اے حبیب — زیرِ لب ذکر سبحان الذی اسریٰ کروں

(ولی دکنی)

اے عشق مجھے شاہد اصلی کو دکھالا — قم خذ بیدی وقفک اللہ تعالیٰ

(انشاء اللہ خاں انشا)

اردو شاعری نے تو عربی ادبیات سے جو رشتہ قائم کیا وہ عہد جاہلیت تک پہنچتا ہے۔ خیالات اور اسالیب کی ہم آہنگی کا یہ سفر صدیوں کے دوران پر محیط ہے۔

تُضِیْئُ الظَّلَامَ بِالْعَشِیِّ کَاَنَّهَا — مَنَارَۃُ مُمْسٰی رَاهِبٍ مُتَبَتِّلِ

(امرأ القیس)

یہی خیال انشاؔ کے یہاں ان الفاظ میں نظر آتا ہے ؎

اے آتش فراق ترا بل بے سوزِ داغ — جھلکے ہے دل میں دُور سے جو دیر کا چراغ ؎

اقبال نے تو "دَیر کے چراغ" کی جگہ "قندیل رہبانی" ہی کا ٹکڑا رکھا ہے۔

گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

اُردو شاعری کے اسالیب، لسانی خودمختاری، فارسی کے اثرات اور مقامی عناصر پر گفتگو آئندہ سطور میں کی جائے گی۔ یہاں مراد صرف عرض کرنا ہے کہ

تلمیحات واستعارات کا مسئلہ محض لسانی نہیں بلکہ تمدنی اور ثقافتی ہے۔ مسلمانوں کا یہ تمدن بین الاقوامی تھا جس نے صرف مسلمانوں ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ساری دنیا کی ادبیات پر اثر ڈالا ہے۔ اسپین کے ذریعے مسلمانوں کا فنِ قصہ گوئی اٹلی پہنچا اور وہاں سے انگلستان تک کا سفر کرتے ہوئے ناول کے قالب میں ڈھل گیا۔ اسی طرح چین کی لوک کہانیوں اور بالخصوص لغور کی لوک کہانیوں پر الف لیلہ ولیلہ کی گہری چھاپ ہے۔ بعض کہانیاں تو بنیادی طور پر الف لیلہ سے ماخوذ ہیں۔ اور تو اور ملا نصیر الدین کا کردار ''آ ہوتی'' کے ٹکڑے کے اضافہ کے ساتھ چینی ادب کا حصہ بن گیا ہے۔[5]

اردو شاعر کے دکنی دور کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو اسے شمالی ہند میں اردو شاعری کے اولین دور سے مختلف حیثیت عطا کرتی ہیں اور بعض خصوصیات شمالی ہند نے شروع ہی سے اپنا لیں۔ ان دونوں ادوار کے سلسلہ میں جس درجہ اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے وہ درست نہیں۔

دکن میں مثنوی نے بڑی ترقی کی اور اس میں بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ فارسی کے ترجمے پر مبنی مثنویاں، مذہبی، عشقیہ اور رزمیہ مثنویاں۔ ان عشقیہ اور رزمیہ مثنویوں میں سے کئی ایسی ہیں جو اسی عہد کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح موضوعات اور اسالیب زبان، تشبیہات واستعارات میں مقامی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ دکنی ادب کے سلسلہ میں ایک باب میں مثالیں پیش کی جا چکی ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہوار، موسم، عقائد، زیور، تعمیرات ہر موضوع پر دکنی شاعروں نے اپنے مشاہدات اور جذبات واحساسات کو پیش کیا ہے۔ ''شہادت نامے'' دکنی شاعری کی ایک نمایاں صنف معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں شمالی ہند کے مرثیوں کا پیش رَو قرار دینا مناسب ہوگا۔ شہادت ناموں کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اکثر سلاطینِ دکن شیعہ مذہب کے پیرو تھے، اسی لیے ان کے یہاں مجالس عزا کا خاص دستور تھا۔[6]

---

[5] چین کی لوک کہانیاں (انگریزی)، پیکنگ، ۱۹۶۱ء

[6] نصیر الدین ہاشمی، دکھنی کے چند تحقیقی مضامین، ص ۱۲

جدید اردو شاعری کے سلسلہ میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ نظم نگاری کی روایت کو مغربی اثرات نے ۱۸۵۷ء کے بعد جنم دیا۔ دکن کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اس مفروضے کی تردید کرتا ہے۔ قلی قطب شاہ اور دوسرے شاعروں نے مختلف موضوعات پر بہت سی مختصر نظمیں لکھی ہیں (شمالی ہند میں نظیر اکبر آبادی نے اس روایت کو آگے بڑھایا)

دکنی شاعری کے سلسلہ میں عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ فارسی سے دامن بچایا گیا، لیکن ہم مولانا عبد السلام ندوی کی رائے کو قرین صحت اور تنقیدی و تاریخی طور پر درست سمجھتے ہیں کہ دکن کے شاعروں نے فارسی اور ہندی دونوں سرچشموں سے اپنے ذہن و دل کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کی آبیاری کی۔

> ''دکن کے شعرا کے سامنے دو نمونے تھے۔ بھاکا (ہندی) اور فارسی شاعری کے۔ دکن والوں نے دونوں کی تقلید کی۔ بحر و قافیہ اور مضامین پر بھی ہندی کے اثرات ہیں۔''

پیا بن میری تیئں بیراگ بھایا ہے، جو ہوتی ہے سو ہونے دو
بھبھوت اب جوگیوں کا رنگ لایا ہے، جو ہوتی ہے سو ہونے دو۔ [۱]

فارسی کے اثر سے تراش خراش پیدا ہوئی اور فارسی اشعار کے ترجمے کیے گئے۔

دنیا کا حکمت نا بوجھیں ہرگز حکیماں علم سوں
گا ترانہ عیش کا، سن دن پیا کے نام پر

حدیث از مطرب و مے گو دراز دہر کم جو   کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا
(حافظ)

OOO

سلطان قلی قطب شاہ نے تو حافظ کی مشہور غزل

ع یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور

---

[۱] عبد السلام ندوی، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جون تا اگست ۱۹۵۳ء
مقالہ ''اردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا''۔

کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے شاعرانہ شعور نے اس غزل کی ردیف کے تسلسل کو پوری طرح سمجھ لیا اور یہ نکتہ بھی اس پر واضح تھا کہ اس غزل میں ایک جذباتی تسلسل اور فضا ہے۔ غزل کا مطلع یہ ہے:

یوسف گم گشتہ سو پھر آ گا اب بہ کنعان غم نہ کھا
گھر ترا امید کا ہو گا گلستاں غم نہ کھا

ہندی اور فارسی اثرات کے علاوہ دکنی شاعروں نے اپنے ماحول اور چاروں طرف کی زندگی اور سیاسی واقعات کی بنا پر نئے اسالیب، تشبیہوں اور استعاروں کی تخلیق کا کام شروع کر دیا تھا۔ ہم شمالی ہند کے سلسلہ میں آگے چل کر اس بات کا جائزہ لیں گے کہ سیاسی واقعات نے اسالیب پر کیا اثرات مرتب کیے۔ داؤد اورنگ آبادی (سنہ وفات ۱۱۶۸ھ م ۱۷۵۵ء) کا شعر ہے۔

محمد مصطفیٰؐ کی یاد سیتی مرا دل قلعۂ احمد نگر ہے

شمالی ہند میں دہلی اُردو شاعری کا پہلا مرکز بنی۔ دلی کی تہذیبی زندگی اور مزاج کے ساتھ ساتھ سیاسی پس منظر کو پہلے دو ابواب کے علاوہ دہلی کی شاعری کے جائزہ میں پیش کیا جا چکا ہے۔ سیاسی انتشار اور تعیش کے پھیلاؤ سے انکار نہیں، لیکن تصوف نے اس عہد کی دہلی میں اخلاقی اور انسانی اقدار کے پرچم کو مکمل طور پر سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ تصوف نے ایک طرف تو اُردو کے شاعروں کو اعلیٰ اقدارِ حیات سے وابستہ رکھا اور دوسری طرف نیم مذہبی تقریبات کی مدد سے لوگوں کو شاہد بازی اور ایسے ہی دوسرے مشاغل سے باز رکھا۔ خانقاہیں اگر ایک طرف تربیتی کیمپ کا درجہ رکھتی تھیں (جیسے حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی خانقاہ) تو دوسری طرف یہ ارباب اقتدار کے خلاف صوفیوں کے ردِعمل کی علامت بھی تھیں۔ صوفی جو حکومت کا آلۂ کار بننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ تصورِ حیات کے سلسلہ میں آگے چل کر اس سلسلہ میں کچھ دوسرے نکات سامنے آئیں گے۔ اس عہد میں دہلی کی تہذیبی زندگی کے بعض پہلوؤں پر بحث کرنے سے پہلے زبان کے مسئلہ پر گفتگو مناسب رہے گی۔

اُردو کے ادبی ذریعۂ اظہار بننے سے مدتوں پہلے ہی شمالی ہند میں لسانی تبدیلیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ لسانی رابطہ اور لین دین یک طرفہ معاملہ نہیں ہے۔ اُردو نے اگر فارسی کی مدد سے اپنی شاعری کی عمارت بلند کی تو خود فارسی میں اُردو کے الفاظ دخل پانے لگے تھے۔ داستان امیر حمزہ جو آٹھویں صدی ہجری کی یادگار معلوم ہوتی ہے اس میں مقامی الفاظ اور محاورے دونوں موجود ہیں۔

''از ہیبتِ آں سرش بگشت

''......در دریا آمدند جنکھا کشیدند''[۸]

خسرو کے یہاں ''ازگرہ گرہ رفتن'' موجود ہے[۹] اور عرفی نے ''جھگڑ'' اور ''خواص'' (اردو کے خصوص معانی میں) کے لفظ استعمال کیے ہیں۔[۱۰] ''سربگشت'' سر میں چکر آنے کا ترجمہ ہے۔ جنک کشتی کو کہتے ہیں۔ ازگرہ رفتن گرہ سے چلے جانے کا ترجمہ ہے۔

شمالی ہند میں صوفیا نے عوام سے قریب ہونے کے لیے اور ان کی ہدایت کے لیے مقامی زبانوں کو اپنایا۔ اس حقیقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی سطح پر فارسی اپنا اقتدار کھو رہی تھی۔ فضلی نے دہ مجلس کے آغاز میں روضۃ الشہداء کے ترجمہ کا سبب یہی لکھا ہے کہ عورتیں بھی سمجھ لیں جو لغاتِ فارسی سے بیگانہ ہو گئی ہیں۔ اس عہد میں مختلف پیشوں کے فروغ نے زبان کے میدان میں نئی وسعتیں پیدا کر دی تھیں۔ برعظیم کے شاعروں میں بھی اپنی ''لسانی جلاوطنی'' کا احساس پیدا ہو گیا تھا' خان آرزو اس احساس کے سب سے اہم ترجمان ہیں۔ ایرانیوں کا جو رویہ فارسی شاعروں کے شعر و سخن کے بارے میں تھا' اس نے ان لوگوں کو اپنی زبان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ ولی گجراتی (دکنی کے اثرات سے ہمیں انکار نہیں جنہیں شاہ حاتم نے اپنا استادِ ریختہ اور میر

---

۸ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں' فارسی پر اردو کا اثر' صفحہ ۲۹۔ بارِ اول' ۱۹۵۲ء

۹ حوالۂ بالا' صفحہ ۴۸

۱۰ حوالہ بالا۔ صفحہ ۴۳

نے اپنا ادبی ''معشوق'' قرار دیا ہے' لیکن ہماری رائے میں شمالی ہند میں ریختہ کا دور ولی کے اثرات کے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ولی کی شخصیت اور فن نے اس کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ شمالی ہند کے شاعر اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے کہ احساسات و جذبات کا اظہار اپنی زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ ''ایک غیر زبان میں سوچنا اس میں محسوس کرنے سے آسان تر ہے''۔ دہلی کے شاعر اس تنقیدی حقیقت تک ایلیٹ سے کس قدر پہلے پہنچ گئے تھے۔ اس احساس نے مشاعرہ کی جگہ مراختہ کو دی حالانکہ مشاعرہ کا لفظ اتنی عمومیت رکھتا ہے کہ اس میں زبان کی قید نہیں' لیکن ''مراختہ'' کی ترکیب وضع کر کے ان لوگوں نے اپنی لسانی خودمختاری کا اعلان کیا۔ میر کے تذکرۂ نکات الشعرا میں ہمیں کئی مراختوں کا ذکر ملتا ہے۔

خواجہ میر درد کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر راست واللہ بذاتِ ہمیں بزرگ است' زیرا کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر بود''[12]

محمد شاہی دور کے شاعر جعفر علی زکی کے سلسلہ میں میر صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کے گھر میں بھی مجمع یاران ریختہ مقرر تھا۔[13]

کمترین کے ذکر میں انہوں نے اس لفظ پر بھی گفتگو کی ہے۔

''گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ ایں لفظ بوزن مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود''۔[14]

''مجلس ریختہ'' مراختہ اور ''مجلس مراختہ'' کے ساتھ ساتھ میر صاحب نے ''مجمع یاران ریختہ'' کی ترکیب میں اردو کی لسانی خودمختاری اور وجۂ اشتراک و محبت کی دنیا سمودی ہے۔ ان یاروں کی محبت کی بنیادی زبان ریختہ یعنی اُردو تھی۔

---

[11] بحوالہ ابوالخیر کشفی' اردو ادب پر ایلیٹ کے اثرات (انگریزی) مقالہ برائے ایلیٹ سیمینار ۱۹۶۵ء

[12] میر تقی میر' نکات الشعراء' صفحہ ۵۰' طبع ثانی' ۱۹۳۵ء

[13] حوالۂ بالا

[14] حوالۂ بالا

اردو کی یہ لسانی خودمختاری انارکی یا انتشار پسندی کے عناصر سے پاک تھی۔ اس میں کوئی تعصب بھی نہیں تھا۔ وہ تعصب جس کی علامت ''فردوسی'' کا نام بن چکا ہے۔ اردو کے شاعروں نے فارسی غزل کی روایت کو اردو میں بڑی تیزی کے ساتھ منتقل کیا۔ اس کا سبب ان کا یہ جذبہ تھا کہ ان کی زبان فارسی کی صدیوں سال پرانی ادبی روایات کی وارث بن جائے۔ اس سے کچھ نقصانات بھی ہوئے۔ بسا اوقات اس عہد کی غزل کے مطالعہ کے دوران یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بچہ بالغوں کی زبان بول رہا ہو' مگر جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے اردو اس مرحلے سے بہت جلد نکل گئی۔ میرؔ' سوداؔ اور دردؔ کے ہاں فارسی اشعار کے لفظی ترجمے بھی ہیں' مگر انہیں بزرگوں نے اردو غزل کو وہ خصوصیات بھی عطا کیں جن کی بنا پر اُردو غزل کی مجموعی فضا فارسی غزل سے مختلف ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اردو غزل نے کوئی حافظ نہیں پیدا کیا تو فارسی غزل بھی کوئی میر پیدا نہیں کرسکی۔

روایتوں کے مطابق شمالی ہند میں فارسی کے ادبی اثرات کا آغاز ولیؔ سے ہوا اور وہ بھی حضرت شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورہ سے۔

> ''می گویند کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود۔ بخدمت میاں گلشن صاحب رفت واز اشعار خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمود ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار ببر''۔[۱۵]

ہم دکنی دور کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں کہ ''مضامین فارسی'' کو ریختہ میں کام میں لانے کا کام شروع ہو چکا تھا' اسی لیے شاہ سعد اللہ گلشن کے اس بیان میں ''بیکار افتادہ اند'' کا ٹکڑا زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فارسی سرکاری اور درباری زبان ہونے کے باوجود عوامی زندگی کی سطح پر اپنی جنگ ہار چکی تھی۔

تذکرۂ قدرت میں شاہ سعد اللہ گلشن کے الفاظ مختلف ہیں:

> ''شما زبانِ دکھنی را گزاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلی شاہجہاں آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت ورواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی

---

۱۵ میر تقی میر' نکات الشعراء' ص ۵۰' طبع ثانی ۱۹۳۵ء

مزاج گرد"۔ [۱۶]

یہ الفاظ تاریخی پس منظر سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں' لیکن اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ اس عہد میں فارسی اشعار اور فارسی غزل کی روایت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اس ضمن میں بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بات محض مضامین تک محدود نہ تھی بلکہ فارسی زمینوں اور تراکیب وغیرہ کو بھی اردو میں منتقل کیا گیا۔

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز دردہا دادی و درمانی ہنوز

(خسرو)

تو ہے رشکِ ماہِ کنعانی ہنوز تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

(ولی)

عام حکمِ شراب می خواہم محتسب را کباب می خواہم

(خسرو)

عام حکمِ شراب کرتا ہوں محتسب کو کباب کرتا ہوں

(میر تقی میر)

سودا کے یہاں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین کے ایک مطلع کو کسی مجلس میں کسی شخص نے مرزا رفیع سودا کے مطلع کا چربہ قرار دیا۔ دونوں مطلع یہ ہیں۔

کس مست کی نگہ کی یہ بدشرابیاں ہیں اوندھے پڑے ہیں ساغر' ٹوٹی گلابیاں ہیں

(رنگین)

ساقی چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرابیاں ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں

(سودا)

اس پر رنگین نے جو جواب دیا وہ پیش کیا جاتا ہے۔

"گفتم سوائے قافیہ مضمون دیگر نیست و بر قافیہ حکومتِ کسے پیش نمی رود۔

---

[۱۶] بحوالہ شعر الہند' حصہ اوّل' ص ۲۶' اعظم گڑھ' ۱۹۴۹ء

وسرقہ ایں رامی گویند کہ حضرت مرزا رفیع فرمودہ اند۔ شعر فارسی از کدام استاد ایں بود

بہار بے سپرِ جامِ یار می گزرد
نسیم ہم چو خدنگ از کنار می گزرد

آن را اوشاں ایں قسم فرمودہ اند

بہار بے سپرِ جامِ یار گزرے ہے
نسیم تیری چھاتی کے پار گزرے ہے

و شعر دیگر از کدام استاد ایں بود

آلودہ زقطراتِ عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

آں را اوشان ایں طور فرمودہ اند

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو[۱۷]

یہ بھی حقیقت ہے کہ فارسی غزل کو معیار سمجھا جاتا تھا مگر اس کی وجہ ہمارے نزدیک اردو غزل کو فارسی غزل کی سطح تک پہنچانے کی کوشش تھی۔ ''المیہ'' کے سلسلہ میں یونانی ڈرامہ اور تنقید کو اسی طرح مدتوں معیار سمجھا گیا۔ اردو کے شاعروں پر تنقید کرتے ہوئے ہمارے تذکرہ نگار اُن کے انداز کا مقابلہ فارسی کے شاعروں سے کرتے تھے۔ مثلاً میر حسن نے طرز میر کو طرز شفائی کے مماثل قرار دیا ہے۔ فارسی کے اثرات کی گہرائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فارسی شاعروں کا کلام اور ان کا تخلص تشبیہ و استعارہ کی بنیاد بن گیا۔ آج بھی ہمارے شاعر اور ادیب اپنے محبوب کو حافظ کی غزل یا خیام کی رباعی کہتے ہیں اور یوں حُسن کے پیکر کو اختصار کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ یہ رجحان نیا نہیں ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں اس کے بہترین نمائندے ''ولی'' ہیں۔

۱۷؎ سعادت یار خاں رنگیں، مجالسِ رنگیں (مرتبہ مسعود حسن رضوی) صفحہ ۸ اور ۹ لکھنؤ، ۱۹۲۹ء۔

تو سرسوں قدم تلک جھلک میں گویا ہے قصیدی انوری کا
ترا مکھ ''مشرقی'' حسن ''انوری'' جلوہ ''جمالی'' ہے
نین ''جامی'' جبیں ''فردوسی'' و ابرو ''ہلالی'' ہے

فارسی کے ان اثرات کو تفصیل سے اس لیے پیش کیا گیا تا کہ ان کوششوں کی اہمیت کو سمجھا جا سکے جو اردو شاعری کے انفرادی لہجہ اور اسالیب کی تخلیق کے سلسلہ میں کی گئیں۔ نظیری اور میر کے سلسلہ میں ہمیں شعرالہند میں یہ بیان ملتا ہے۔

نظیری کا ایک مشہور شعر ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اور میر صاحب نے اس کی صورت اس طرح بدل دی ہے۔

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر ہو [۱۸]

میر صاحب کا یہ شعر ان کے دیوان کے ایک مخطوطہ میں یوں نظر سے گزرا ہے۔

جس جائے سراپے پہ نظر پڑتی ہے اس کے جی میں یہی آتا ہے یہیں عمر بسر ہو

ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ میر صاحب نے ''نظیری کے شعر کی صورت'' نہیں بدلی ہے بلکہ میر صاحب کا یہ شعر ''اردو کی ادبی اور شعری خود مختاری'' کے اعلان ناموں میں سے ایک اہم اعلان نامہ ہے۔ ایسا اعلان نامہ جس کی ایک دفعہ ''لسانی خود مختاری اور انفرادیت'' بھی ہے۔ نظیری کے یہاں ''زفرق تا بہ قدم'' ہر جگہ کرشمہ اور دعوت نظارہ ہے...... مگر یہ کرشمہ ایسا ہے کہ نگاہیں ''زفرق تا بہ قدم'' سفر کرتی ہیں اور بس۔ میر کے یہاں محبوب کا پیکر ایک ''براعظم'' کی طرح وسیع معلوم ہوتا ہے۔ ایسا براعظم جس پر نگاہوں کے مسافروں کا قافلہ پہلی بار اُترا ہو اور جس کے نت نئے نظاروں کے دیکھنے میں عمر بیت جائے۔ ''کرشمہ دامن دل می کشد'' کا ٹکڑا ''عمر بسر ہو'' کے سامنے کشکولِ

---

[۱۸] عبدالسلام ندوی، شعرالہند، حصہ اول، صفحہ ۴۴۔

گدائی معلوم ہوتا ہے۔ مضمون میں اشتراک کے باوصف دونوں کے تجربات کی شدت اور کیفیت بالکل مختلف ہے۔

اردو کے شاعر میر کے عہد میں اور اس کے بعد بھی فارسی روایت سے استفادہ کرتے رہے لیکن خلاقانہ طور پر۔ سودا کا مشہور شعر ہے۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

یہ شعر عبدالسلام ندوی کی طرح ہمیں بھی نظیری کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے۔

بوئے یارمن ازیں سمت وفامی آید ساغر از دست بگیر ید' من از کارشدم

مگر ساتھ ہی ساتھ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ نظیری اور سودا کے پہلے مصرعوں کی فضا الگ ہے اور سودا کے دوسرے مصرع میں ''کہ چلا میں'' کہ ٹکڑے میں جس طرح ایک تجربہ گرفت میں آ گیا ہے ''از کارشدم'' میں نہیں آ سکا۔ مضامین کا اشتراک یا کسی مضمون کے کسی پہلو کا ایک ہونا ادبیات کی دنیا میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اسے ''سرقہ'' یا ماخوذ شعر' کہنے سے ہر جگہ بات نہیں بنتی۔ اشتراک کی ایک وجہ انسان کے جذبات واحساسات کا مشترک ہونا ہے۔ انسان کے بنیادی جذبات وقت اور مقام کی قید سے بلندتر ہیں۔ راسخ عظیم آبادی کا مشہور شعر ہے۔

اُس بن جینا کہ جان دینا کہو راسخ کیا قرار پایا

کیا ہم اسے شیکسپیئر کے مشہور الفاظ کا سرقہ قرار دے سکتے ہیں؟ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ راسخ نے شیکسپیئر کے یہاں سے یہ مضمون لیا ہے کہ

To be or not be, That's the question.

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے محاسن کلام غالب میں کتنے ہی جرمن اور انگریزی زبان کے شاعروں کا کلام غالب کے اشعار کے مقابلہ میں پیش کیا ہے۔ غالب نے ان میں سے کسی شاعر کو نہیں پڑھا تھا' اشتراک تو ام الکتاب یعنی زندگی کا عطا کردہ ہے۔ اسے ادبی اصطلاح میں متوازی مضامین یا ''متوازی اندازفکر'' (Parallelism) کہتے ہیں۔

اردو شاعری (بالخصوص اُردو غزل) اس کی زبان اور فضا کو فارسی کی گرفت سے نجات دلانے میں کئی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان میں سے دو عناصر زیادہ اہم ہیں، ایک تو ہندی اثرات اور دوسرے برعظیم کے سیاسی و تاریخی واقعات کا اثر زبان، تشبیہات، علائم اور اشارات پر۔

ہندی اثرات کو ان کی وسعت کی بنا پر کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف تو یہ اثرات موسم، تہواروں، رسوم وغیرہ کے تذکرہ کی صورت میں سامنے آئے اور دوسری طرف زبان و بیان میں ہندی عناصر نے جگہ بنائی۔ اس وقت یہی لسانی پہلو ہمارا موضوع ہے۔ دوسرے پہلوؤں کا ذکر بعد میں ملکی سرمایۂ موضوعات اور تہذیبی پس منظر کے تحت کیا جائے گا۔

ہندو مذہب کی اصطلاحیں اول اول اردو میں فارسی کے وسیلہ سے آئیں جیسے دیر، بتکدہ، برہمن وغیرہ لیکن بعد میں اردو کے شاعروں نے اپنے مشاہدہ اور ہندوؤں سے قربت کی بنا پر ہندو مذہب کی اصطلاحوں کو اپنا لیا۔ مذہبی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق الفاظ بھی ہندی ذریعوں سے اردو میں آئے۔ برعظیم کی زندگی کو ہندی الفاظ کے ذریعہ پیش کر کے ہمارے شاعروں نے ایک مخصوص انفرادی فضا قائم کر دی جس میں راجپوتوں کی برچھیوں کی چمک ہے، دل کے داغ پر کنول پر بیٹھے ہوئے بھنورے کا گمان ہوتا ہے اور زلف جمنا کی موج نظر آتی ہے۔ عاشق جوگی بن کر ساجن کے دوارے دھونی رُماتا ہے۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندو دیو مالا کے کرداروں نے بھی شاعری میں جگہ پائی اور تشبیہ و استعارہ میں بھی ہندوستان کی مٹی کندن بن کر چمک اُٹھی۔ ہندی کے اثر سے نئی بحریں بھی ایجاد ہوئیں اور قدیم بحروں میں تصرفات بھی ہوئے۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا، چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

دسے شوخی سے تجھ انکھیاں کے یودھج　　　کہ برچھی کون پکڑ نکلے ہیں رجپوت

(ولی)

زلف ہے تیری موج گنگا کی   تل نزیک اس کے اک سناسی ہے
(ولی)

ترچھی نظروں سے دیکھنا ہنس ہنس   مور سے چال تجھ نیاری ہے
(فائز)

کب تلک دھونی جمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا
(میر)

رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا
(میر)

خون جگر سے مژگاں یوں سرخ ہو رہے ہیں   جنگل میں جیسے یارو! پھولا ہوا ڈھاکا
(محمد امان نثار)

ہندی بحور کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ

"ہندی کے اثرات سے کچھ اور بحریں بھی ایجاد ہوئیں۔ دکنی شعرا کا کلام ہندی سے قریب تر ہے...... خالص اُردو شاعری کے دور کے اساتذہ نے بھی ہندی بحروں میں اشعار کہے ہیں، قدیم بحروں میں تصرفات کیے ہیں اور نئی بحریں ایجاد کی ہیں۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

OOO

پلکیں بھری ہیں، کھنچی بھنویں ہیں، ترچھی تیکھی نگاہیں
اس اوباش کی سادگی دیکھو شوخی ہی ہم چاہے ہیں[19]

سلیم جعفر مرحوم کی رائے یہ ہے کہ قدما نے بحروں میں تصرف تو کیا لیکن ان میں

---

[19] عبدالسلام ندوی، سہ ماہی ہندوستانی الہ آباد، جنوری ۱۹۳۹ء (مقالہ "اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات")

سے کوئی بحر ہندی کی نہیں ہے اور صرف نظیر اکبر آبادی کے یہاں ہندی پنگل کا جلوہ نظر آتا ہے۔

شمالی ہند کے ان شعراء نے ہندی زبان کے عناصر کو اُردو کے مزاج کے مطابق اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان کو فارسی اور ہندی کے مقابلے میں اردو کے جداگانہ وجود کا پوری طرح احساس تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں میر کے تذکرۂ نکات الشعراء سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے ریختہ کی قسمیں بیان کی ہیں۔ ریختہ کی یہ قسمیں محض تقسیم اور گروہ بندی ہی نہیں بلکہ غزل اور زبان کے ارتقا کو بھی پیش کرتی ہیں۔ پہلے تو ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا اُردو یا ہندی کا ہوتا تھا۔ پھر آدھا مصرعہ فارسی کا اور آدھا اردو کا۔ آگے چل کر میر صاحب نے فارسی حروف وافعال کے استعمال کو ''قبیح'' قرار دیا ہے۔ اس سے ان کے اور ان کے عہد کے تصورِ زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب اور اقبال جیسے عظیم شاعروں نے کہیں کہیں اس اصول کو توڑا ہے' مگر ان کے ایسے اشعار ہماری زبان کے باغ میں کسی اور دیس کے درختوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ فارسی ترکیبوں کے سلسلہ میں میر صاحب کی رائے بڑی مستحکم ہے یعنی انہیں ترکیبوں کا صَرف جائز ہے جو زبانِ اُردو سے ہم آہنگ ہوں۔ اسی کو انہوں نے اپنا مسلک بنایا ہے کہ اگر فارسی ترکیب محاورۂ ریختہ کے موافق ہے تو اسے استعمال کیا جائے۔ میر صاحب نے ''ایہام'' کی مخالفت بھی کی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو کی لسانی خودمختاری کی بنیاد رکھنے والوں کے ذہن میں لفظوں کو بتوں کی طرح پوجنے کا تصور نہ تھا۔ وہ لفظوں کو ابلاغ کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ زبان اور بیان کے مکمل امتزاج کو انہوں نے ''انداز'' کی اصطلاح عطا کی ہے۔ غالب نے اسی کو ''شیوہ'' کہا تھا اور اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ فارسی میں اکابر شعرا اپنا شیوہ رکھتے ہیں' ہاں اُردو میں یہ دولت خال خال شاعروں کو ملی ہے۔ ایسے شاعروں میں انہوں نے میر' سودا اور قائم کے اشعار نمونہ کے طور پر پیش کیے تھے۔ میر صاحب نے انداز کو تمام صنائع پر محیط قرار دیا ہے۔ ''تجنیس' ترصیع' تشبیہ' گفتگو کی صفائی'

فصاحت' بلاغت' ادابندی' خیال وغیرہ اسی ضمن میں آتے ہیں''۔[۲۰]

شعر وسخن کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کا آغاز میر سے پہلے ہو چکا تھا۔ فائز نے اپنے کلیات کے خطبہ میں شاعری کے معنوی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ لفظی پہلو پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک کلام میں الفاظ شیریں ہوں' بیان میں تکلّف نہ ہو' سمجھنے میں زحمت نہ ہو' حروف زوائد سے پاک ہو اور شاعر ''مجہول اشاروں' ناپسندیدہ ایہاموں' نادرست محاوروں اور نامطبوع تکلفوں سے پرہیز کرے''[۲۱]

زبان میں ہندی عناصر کو موضوعات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو کے شاعر ہمیشہ سے ''زمین'' سے قریب رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے دور اور اس کی زندگی کے متنوع پہلوؤں سے کبھی آنکھیں نہیں چرائیں۔ زبان اور اسالیب بیان پر سیاسی و تاریخی واقعات کے اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ مناسب ہو گا کہ اردو شاعری کے موضوعات میں ہندی عناصر اور ملکی سرمایہ کی طرف چند اشارے کر دیے جائیں۔ ویسے دکنی شاعری کے ذکر میں اور پھر فائز دہلوی و شاہ حاتم کے دور سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے شاعروں کے کلام کے جائزے میں مناسب مقامات پر ان عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اُردو شاعری میں برعظیم کا موسم' جغرافیائی کیفیات' مذہب' سماج' رسم و رواج' موسیقی' دیو مالا' تہوار...... سب ہی چیزیں موجود ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے منظوم تراجم پیش کیے گئے۔ ان کے تصور حیات کو غزل کے موضوعات میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ ''زندگی کو ہندوؤں نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے' بچپن اور تعلیم' شادی آبادی میں رہ کر عبادت اور بیراگ' یہ چوتھا حصہ یعنی بیراگ خصوصیت کے ساتھ اُردو شاعری کا موضوع ہے۔[۲۲]

۲۰۔ نکات الشعراء (نیز اثر لکھنوی' مقدمہ مزامیر حصہ اول' صفحہ ۸ تا ۱۰' دہلی ۱۹۴۷ء)

۲۱۔ مسعود حسن رضوی' مقدمہ دیوانِ فائز' صفحہ ۷۳

۲۲۔ سید وقار عظیم' ماہنامہ ہمایوں لاہور' اگست اور ستمبر ۱۹۳۶ء (مقالہ ''اردو شاعری میں مقامی مذہب اور عقائد

اور تو اور اسلامی اور مسلمانوں کی زندگی سے متعلق موضوعات میں بھی ہندوستانیت کے عناصر نظر آتے ہیں مثلاً مرثیہ میں ہمیں اودھ کی رسمیں، زندگی کے عمومی اور لسانی زندگی کے خصوصی مرقعے ملتے ہیں۔ ''کردار اگرچہ عربی ہیں لیکن ان کی نقش گری اِسی ماحول کے رنگوں سے کی گئی ہے۔[۲۳]

ثبوت کے طور پر انیس کا یہ بند کافی ہے۔

غم تھا کہ کوئی دم میں یہ مسند ہوئی خالی   اب سر پہ رنڈاپے کی بلا چرخ نے ڈالی
کچھ منہ سے نہ کہہ سکتی تھی وہ ناز کی پالی   پہ ہونٹ چبائے کہ اُڑی پان کی لالی
آ پڑتے تھے اشک آنکھوں سے رخسار پہ ڈھل کر
رہ جاتی تھی وہ مہندی لگے ہاتھوں کو مل کر

فائز کی مختصر نظموں اور مثنویوں کو ان سے متعلق باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جوگن، بھنگیڑ خانہ، تبولن، پنگھٹ، ہولی، بھتے کا میلا اور نہان نگنبود...... یہ سب نظمیں اپنے موضوع اور زبان کے اعتبار سے ہندی عناصر کی بہترین ترجمانی کرتی ہیں۔ جوگن کے بارے میں یہ دو شعر دیکھیے:

نہیں چُھپا تن بھبھوت میں سارا   راکھ میں حُسن کا ہے انگارا
جوڑا نہیں گیند ہے کنہیا کی   یا سہس ناگنی ہے دریا کی

نگنبود کے گھاٹ پر اشنان کے منظر کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

کرے دل کو پانی ہر اک ہُندنی   نظر پڑتی پانی اپر چندنی
ہے اندر کی، مانوٗ سبھا جلوہ گر   کہ ہر نار دستی ہے رمبھا سوں در
ہر اک نار سورج سی سوبھا دھرے   کھڑی ہو سورج کی تپیا کرے

ان مثالوں سے ہندی عناصر کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان عناصر کی وسعت اور پھیلاؤ بھی ایسا ہے کہ کلاسیکی شاعری کا کوئی سنجیدہ طالب علم اس سے آسان نہیں گزر سکتا۔ ہند و دیو مالا اور برعظیم کے عشقیہ قصے علامتوں، استعاروں اور

[۲۳] محمد حسین ادیب، ہمایوں لاہور، جنوری ۱۹۳۲ء (مقالہ ''اردو شاعری اور ملکی سرمایہ'')

تلمیحوں کے قالب میں ڈھل گئے۔ بہار کی جلوہ سامانی کے ساتھ ساتھ برسات کی پھوار بھی ہمارے ذہن پر پڑنے لگتی ہے۔ ہولی اور بسنت کے رنگوں کے ساتھ ساتھ مجالسِ رقص ونغمہ، باغ، جلوس، آرائش مکان وغیرہ کے سلسلہ میں ساری تفصیلات ''ہندوستانی ہیں''۔ مثال کے طور پر صرف مثنوی سحر البیان کا ذکر کافی ہوگا۔ جلوس کے منظر کی ایک جھلک یہ ہے۔

ہزاروں ہی اطراف میں پالکی   چھلا بور کی جگمگی نالکی
کہاروں کی زربفت کی کُرتیاں   اور ان کے دبے پاؤں کی پُھرتیاں

مثنوی کی ان خارجی تفاصیل سے قطع نظر بلا کسی تبصرہ کے غزلوں کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ دکنی دور کو ہم نے اس لیے شامل نہیں کیا کہ اس پر ایک جداگانہ باب ہے۔ غزلوں کے اشعار کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہمارے شاعروں نے ان عناصر کو اپنے جذبات و احساسات کی دنیا کا حصہ بنا دیا تھا۔

تجھ نیہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت   یک بار اسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا
(ولی)

ہولی کے اب بہانے چھڑکا ہے رنگ کس نے؟   نام خدا تجھ اوپر اس آن عجب سماں ہے
(شاہ حاتم)

کوئل نیں آ کے کوک سنائی بسنت رت   بورائے عام خواص کہ آئی بسنت رت
(شاہ آبرو)

بوندوں کی جٹا کھولے آتی ہے گھٹا کالی   لا ساغر مئے، ساقی! بدلی بھی ہے متوالی
(محمد امان نثار)

مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا تیر مارا
(سودا)

رانجھا کے تصور سے بھی سوئی نہ لپٹ کر   تو نے ہوسِ دل نہ کچھ اے ہیر نکالی
(مصحفی)

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر	اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
(انشا)

ہجوم رکھتے ہیں جاں بازیوں ترے آگے	جواڑیوں کا دوانی میں جیسے جھمگٹ ہو
(ناسخ)

زبان اور موضوعات کے ہندی عناصر کے مطالعہ کے بعد ہم اُردو شاعری کے عہدِ پیشِ نظر کے ایک دوسرے لسانی اور ادبی پہلو کے تجزیہ کے مرحلہ تک آ گئے ہیں۔ ''زبان اور اسلوبِ بیان پر سیاسی اور تاریخی واقعات کا اثر'' جیسا کہ عرض کیا گیا ہے انہیں دونوں عناصر نے مجموعی طور پر ہماری شاعری اور غزل کو فارسی شاعری سے ممتاز و ممیّز کر دیا ہے۔ ان عناصر نے ہماری شاعری کو اس کا انفرادی لہجہ اور ایک جداگانہ فضا عطا کی ہے۔

شاہ حاتم کے عہد سے انگریز اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کا احساس ہمارے شاعروں کو ہو چلا تھا۔ غزل اشاریت کا فن ہے۔ غزل کی اشاریت اور ایمائیت کے ضمن میں اس باب میں میر تقی میر کے سلسلہ میں ہم اپنے خیالات پیش کریں گے۔ بہر حال غزل کے فن کو غالب نے نہایت خلاّقی کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام	چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر

دشنۂ و خنجر کی علامتیں ناز و غمزہ کے لیے آج بھی ہماری غزل میں استعمال ہوتی ہیں لیکن شاہ حاتم کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کی کاٹ اور بُرش میں کمی آ گئی ہو۔ اسی لیے ''نگاہِ ناز'' کی فتنہ سامانی کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور علامت ان کے ذہن میں آئی۔

شہر میں چرچا ہے اب تیری نگاہِ ناز کا	دور کرے ہے دل کے تئیں یہ نیچا انگریز کا

سیاسی اور تاریخی واقعات عشقیہ شاعری کے لہجہ اور اسلوب کو جس طرح متاثر کرتے ہیں اس کا اندازہ درج بالا شعر سے ہو سکتا ہے۔ حاتم کی ایک اور غزل کا شعر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ غزل ۱۱۳۵ھ کی ہے۔

سانولے رخسار اوپر کھول کر زلفوں کے تئیں	ہند میں کافر نے عالم کو کیا قیدِ فرنگ

میر صاحب کی شاعری میں ''شہر'' اور ''نگر'' کی علامت کی تکرار کثرت سے ملتی ہے۔ اور ''نگر'' ان کے یہاں اجڑنے کے لیے بستا ہے اور پھر بس کر اجڑتا ہے۔ دل کی تباہی پر انہیں نگر کے اجڑنے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ مماثلت ان کے فکر اور مشاہدہ کا بنیادی حصہ بن گئی۔ اُردو کے بعض دوسرے شاعروں نے بعد میں اس اسلوب کی تقلید کی مگر وہ اس علامت کے تمام گوشوں کو سمجھ نہ سکے۔ میر صاحب کے یہاں اس اشارے کی گہرائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے دہلی کو اجڑتے ہوئے دیکھا۔ دلی جسے انہوں نے اکبر آباد چھوڑ کر اپنا ذہنی وطن بنایا تھا' دلی جو اُن کی محبتوں' نفرتوں' رقابتوں' کامیابیوں اور ناکامیوں کا مرکز تھی۔ یہیں انہوں نے ایسی ہنگامہ خیز جوانی گزاری تھی کہ جب گلیوں سے گزرتے تو

ع ساتھ ''ان'' کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

یہ دلی انہیں جذباتی طور پر اُکساتی اور ذاتی بیزاری کے عنصر پر غالب آ جاتی ہے۔ میر کے ہاں حُسن کا جو گہرا مشاہدہ اور احترام ہے' بہار کی آمد کے ساتھ چمن کو چلنے کا جو جذبہ ہے' کم کم بادو باراں میں بھیگنے کی جو تمنا ہے وہ اس دلی کی دین ہے جس کے بارے میں انہوں نے کہا تھا۔

دِلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے ‏ ‏ ‏ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اور جب یہ دلی صیدِ حوادث بنی' روزگار کی صورت بگڑی تو میر صاحب کے لیے ایک علامت بن گئی۔ پھر اس میں عمومیت پیدا ہوئی اور دلی ایک اجڑا ہوا نگر بن گئی۔ یہ اجڑا ہوا نگر دل بن گیا۔ یہ حقیقت زندگی اور حقائق کے بارے میں غزل گو کے فنی برتاؤ کو بھی پیش کرتی ہے۔ غزل گو تو ایک ظالم اور جابر حکومت کے مظالم کو جفائے محبوب بنا لیتا ہے۔ میر صاحب کے یہاں اس علامت میں کتنی تہ داری اور وسعت ہے' اس کا اندازہ ذیل کے دو اشعار سے ہو سکتا ہے۔

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے ‏ ‏ ‏ جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا

OOO

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے پچھتاؤ گے' سنو ہو' یہ بستی اجاڑ کے

میر صاحب کے یہ اشعار ہمیں رمزیت پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ نگر اور ایسی ہی دوسری علامتیں جو سیاسی اور خارجی حالات کی پیداوار ہیں' اُردو کے غزل گو شاعر کے ہاتھوں ''دروں بینی'' کی دولت سے ہمکنار ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُردو غزل کو اس کی انفرادیت مل گئی۔ فرانسیسی ادب کی تحریکِ رمزیت کے ایک بڑے فنکار ملارمے نے الفاظ کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''لفظوں کو ان کے عام معانی میں استعمال کرنا ایک پیش پا افتادہ بات ہے' اور اسی لیے شاعر کو یہ عامیانہ نقطۂ نظر نہیں قبول کرنا چاہیے''۔[۲۴]

ملارمے سے بہت پہلے میر صاحب اور اردو کے شاعر اس حقیقت کو جان چکے تھے' اس لیے انہوں نے خارجی حالات کی گرفت کے باوجود اپنی شاعری کو اپنے دور کا فوٹو بننے سے بچا لیا اور دوسری طرف اعلیٰ اقدار حیات کی ترجمانی کی۔ فوٹو بننے سے ہماری مراد سطحی حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری ہے جس میں محض واقعات کو دُہرا دیا جائے اور فنکار کی ذات' اس کا نقطۂ نظر اور ردِ عمل نظر نہ آئے۔ میر صاحب نے دلی کی زندگی کے ''پراسرار شاعرانہ عناصر'' کو گہرائیوں میں اتر کر دیکھا اور اس لیے ان کے یہاں افسردگی کی خاکستر میں بھی نصب العین اور بلند تصور حیات کی چنگاریاں چمکتی نظر آتی ہیں۔

میر صاحب کے ہم عصروں اور بعد کے دوسرے شاعروں کے یہاں ہمیں یہ عظمت اور فنی گہرائی تو نظر نہیں آتی جو خارجی حالات کے تذکرے کو حدیثِ دل و دلبری بنا دے' لیکن اسلوب اور پیرایۂ اظہار پر ان حالات و واقعات کے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں۔ ان شاعروں نے عشقیہ شاعری میں اس پیرایہ کو اپنا کر غزل کے دامن کو دامن حیات و کائنات سے باندھ دیا۔ میر قدرت اللہ (متوفی ۱۲۰۵ھ م ۱۔۱۷۹۰ء) کا شعر ملاحظہ ہو۔

---

۲۴ ڈاکٹر یوسف حسین خان' فرانسیسی ادب' صفحہ ۴۳۱' علی گڑھ' ۱۹۴۲ء

دل گم گشتہ! خبردار کہ یاں سینے میں تیر بیداد سدا درپئے ''جاسوسی'' ہے

مصحفی ''صفِ مژگاں'' کے حملے کو یوں پیش کرتے ہیں۔

یوں اس کی صفِ مژگاں بھالے ہی دکھاتی ہے
چڑھ آیا ہے عاشق پر گویا کہ دکن سارا

دکن کے چڑھ آنے کا اشارہ شمالی ہند پر بار بار مرہٹوں کے حملوں کی طرف ہے۔

انشاء بڑے ''ہنسوڑ'' تھے لیکن ان کی طبیعت کو لسانی مسائل سے فطری دلچسپی تھی۔ وہ زبان کے مزاج دان تھے۔ دہلی کے ہر محلّہ کے لہجہ اور گفتگو کا لسانی تجزیہ (اُس دور کی علمی سطح کے مطابق' بلکہ اس سے آگے) کرنے پر قادر تھے۔ ان کا جو کلام پیش کیا جا چکا ہے' خاص طور پر جارج سوم کی مدح میں قصیدہ' وہ اُردو شاعری میں انگریزی الفاظ کے استعمال کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انشاء کی غزلوں میں بھی کہیں انگریزوں کی اردو کے انداز و لہجہ کی پیروڈی ہے اور کہیں اُس عہد کے نئے حالات سے حاصل کردہ تشبیہیں ہیں۔ اِسی کے ساتھ ساتھ بتِ فرنگ کے حُسن کا تذکرہ ہے۔ حاتم نے ''فرنگستان کے حسن صبیح'' پر ''بُتانِ ہند کے رنگِ ملیح'' کو ترجیح دی تھی' مگر انشا کا انداز نظر مختلف تھا۔ انشا کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس کی وضاحت ذیل کے چار اشعار سے ہو جائے گی۔

کرچ لے کے آہ کی کہتا ہے یوں دل چرخ سے
تم سے دل بوگڑ بڑا صاحب لڑائی مانگتا

○○○

رواں ہیں آگے آگے لختِ دل یوں میرے آنسو کے
چلیں ہیں اردلی کے لوگ جوں کپتان کے آگے

○○○

گھڑی جیسے فرنگی بولتی ہے دل بھی ہے یوں ہی
یہ خطرہ ہے کہ تو کوئی بگاڑ اس کی نہ کل ڈالے

تری خاطر حرم سے آ ہوا راہب کلیسا کا　　　قسم عیسیٰ مریم کی تجھے، انشا کو مت ترسا

اس تشکیلی دور میں شاعری کے اسالیب میں ''ایہام'' بہت نمایاں تھا۔ اس کی وجہ شعری اور لسانی تراش خراش کا جذبہ تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ مجلسی زندگی اور تمدن کا تصنع ادب و شعر پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ ہمارے نزدیک ایہام کے فروغ کا ایک سبب فارسی سے مقابلہ بھی تھا۔ الفاظ کے معنوی پہلوؤں کو ابھارنے کے لیے جو صورت متقدمین کو سب سے آسان معلوم ہوئی وہ ایہام گوئی تھی۔ نفسیاتی طور پر ہم ایہام گوئی کو ''لسانی نمائش'' قرار دے سکتے ہیں۔ جس طرح عنفوان شباب میں قدم رکھتے ہوئے بہت سے افراد نرگسیت Exhibitionism کے اسیر ہوتے ہیں، اسی طرح زبانوں کے تشکیلی ادوار میں یہ مرحلہ آتا ہے۔ شاہ حاتم نے ولی کی شاعری کو اپنا نمونہ بنایا تھا۔ ولی کے یہاں دوسرے محاسن کی کمی نہیں، لیکن شمالی ہند کے شاعروں نے ولی کی ایہام گوئی کو ان کی عظمت کی اساس سمجھا۔ دوسری طرف خود فارسی کے شعرائے عصر ایہام گوئی کو اپنا فن بنائے ہوئے تھے۔ لیکن جس طرح صحت مند نو بالغ جلد ہی نرگسیت سے نجات پا لیتے ہیں، اسی طرح ہماری غزل نے بہت جلد ایہام گوئی کے مرحلہ کو طے کر لیا۔ ادبی فضا اور مذاق سخن میں اس تیز رفتاری کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ شاہ حاتم نے زمانے کے رُخ کو دیکھتے ہوئے اپنے دیوان کا انتخاب کیا۔ جن اشعار اور غزلوں کا انحصار ایہام پر تھا انہیں خارج کر دیا اور یوں وہ ''حاتم ثانی'' بن کر ''دیوان زادہ'' میں دنیائے ادب کے سامنے آئے اور اس دعویٰ کے ساتھ۔

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش　　　حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

میر اور سودا نے بھی ایہام کے خلاف اپنے خیالات کو قوت و شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کیا جانوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے　　　کچھ ایسی طرز بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

OOO

یک رنگ ہوں، آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی　　　منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

(سودا)

لکھنؤ میں شاعری کے تصور اور اسالیب میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ اب ہم زبان، اسلوب اور موضوعات کے مطالعہ کے بعد ایک مذموم مگر عام رجحان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے جو متقدمین کے پہلے ہی طبقہ سے ہماری شاعری اور غزل کا نمایاں داغ رہا ہے۔ ہماری مراد امرد پرستی سے ہے جس کا اظہار غزل، مثنوی، رباعی ہر صنف میں کیا گیا ہے۔

ولی کے یہاں محبوب بیشتر حالات میں ایک حسین اور باذوق خاتون (یا خواتین) ہے۔ ولی کو کسی نے ''جمال دوست'' شاعر ٹھیک ہی کہا ہے، لیکن ولی کے یہاں بھی امرد پرستی کی جھلکیاں بہت نمایاں ہیں۔

گر میری طرف ہوئے گزر اس شوخ پسر کا   سب راہ کروں فرش اپس نور نظر کا

ولی نے تو امارد کے ناموں کو اپنی غزلوں کی ردیف بنا دیا ہے۔

شمعِ بزمِ وفا ہے امرت لال   سروِ باغِ ادا ہے امرت لال
لعل تیرے بھرے ہیں امرت سوں   نام تیرا بجا ہے امرت لال
اے ولی کیا کہوں بیاں اُس کا   لطف میں دل رُبا ہے امرت لال

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اس مسئلہ کو بڑی ''معصومیت'' کے ساتھ پیش کیا ہے۔

> ''ولی کے دیوان میں اس کے اکثر احباب کا نام ملتا ہے۔ خصوصاً سید ابوالمعالی کا جن سے غیر معمولی محبت تھی...... اسی طرح شمس الدین سراج، کامل و اکمل محمد مراد اور محمد یار خاں کا بھی ذکر ان کے اشعار میں آیا ہے...... ولی نے اپنے ہندو دوستوں کا ذکر بھی اپنی متعدد غزلوں میں کیا ہے۔ امرت لال، گوبند لال، کھیم داس، بنود (صحیح نام ونود) وغیرہ کے نام کئی جگہ آتے ہیں''۔ [۲۵]

امرت لال کے بارے میں جو تین شعر پیش کیے گئے، کیا انہیں ''دوستوں کے ذکر'' تک محدود کیا جا سکتا ہے؟ ہمارا جواب نفی میں ہے۔ دہلی کے شاعروں نے ریختہ کی

---

[۲۵] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، مقدمہ کلیاتِ ولی، صفحہ ۲۵۔۲۶، کراچی ۱۹۵۴ء

ہر ''ادا'' اور ''انداز'' میں ولی کی پیروی کی ہے، لیکن یہ پیروی ادب تک محدود نہیں بلکہ زندگی، اجتماعی حالات اور تمدنی رجحانات کی پیدا کردہ ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم ''گلہری کا بچہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اردو شاعری میں اس رجحان کی تاریخ کو اجمالاً پیش کر دیا ہے۔

''نظم امرد پرستی کے رجحان کو بڑے عامیانہ انداز میں پیش کرتی ہے...... دلی پہنچ کر کج کلاہ لڑکوں کے قتل عام کرنے کا مضمون آبرو، مضمون، شاکر ناجی اور حاتم کے دور سے شروع ہو کر میر کے عطار کے لونڈے تک پہنچتا ہے۔ اس سب کو محض فارسی شاعری کا اثر سمجھنا غلط ہے...... اس عہد کے مردوں کو عورتوں سے ملنے کے جو کم مواقع ملتے تھے...... جنسی بھوک نے آسودگی کا یہ غیر فطری راستہ ڈھونڈ نکالا۔''[۲۶]

جن شاعروں کا اوپر ذکر کیا گیا ان میں آبرو اس کوچہ کے ''ماہر خصوصی'' نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس رجحان کو اتنے واضح اور متبذل انداز میں پیش کیا ہے کہ اسے دوستی یا ذہنی رویہ تک محدود رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی۔

جو لونڈا نام سُن امرد پرستی کا چڑھے چونکے
میں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں جوں لاسا

اسی طرح میر صاحب کے یہاں عطار کے لونڈے کے علاوہ زرگر پسر اور ایسے ہی دوسرے امرد موجود ہیں۔

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

ہمارے خیال میں امرد پرستی کے رجحان کی واحد وجہ عورتوں سے ملنے کے کم مواقع کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس قومی، اخلاقی اور روحانی بیماری کے اسباب بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ دہلی کے تمدنی تجزیہ میں یہ بات ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ طوائفوں کو اس سماج میں کیسا بلند مقام حاصل تھا۔ اسی طرح فائز کی شاعری میں عورتوں سے آزادانہ

---

[۲۶] ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، نظیر اکبرآبادی، اُن کا عہد اور شاعری، صفحہ ۲۶، ۲۷

ملنے کے مواقع کے مرقعے نظر آتے ہیں۔ امرد پرستی افراد کی انفرادی نفسیاتی بیماری تو ہے ہی، لیکن انسانی تاریخ کے کئی ادوار میں یہ رجحان ہمیں اجتماعی بیماری کے طور پر بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر قوم لوط کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ رجحان معاشرتی اور اخلاقی زوال کا ایک اہم مظہر ہے۔ آج کا انگلستان اس کی ایک مثال ہے، جہاں ہم صنفی جنسی تعلقات کو آئینی اور قانونی منظوری حاصل ہو گئی ہے۔ قدیم یونان میں کسی امرد سے وابستگی شرافت کی لازمی نشانی سمجھی جاتی تھی۔

> Every man was expccted to take to himself a boy...... The man was called the inspirer; the boy, the listener ۲۷

افلاطون نے ہم صنفی محبت اور جنسی عمل میں تفریق کی ہے۔ ایک کو جذبہ کہا ہے، دوسرے کو بیماری، ایک کو محبوب کی فلاح اور دوسرے کو دونوں کی تباہی۔ لیکن ایک غیر فطری جذبہ تباہی اور بیماری کی منزلیں جس تیزی کے ساتھ طے کرتا ہے اس پر یونانی فلسفی نے تو آنکھیں بند کر لیں، مگر تاریخ کی چشمِ وا نے وہ مناظر اور رفتار دیکھی ہے۔

ہمارے خیال میں امرد پرستی اور طوائف بازی کو ایک حد تک ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وجہِ اشتراک سماجی ذمہ داریوں سے گریز ہے۔ یہ ''دونوں ایسے مشاغل ہیں جو جنسی اور رومانی تسکین کا باعث تو ہو سکتے ہیں مگر ان سے کسی قسم کی سماجی ذمہ داریاں پیدا نہیں ہوتیں'' پھر ''امرد پرستی چونکہ فطری اور عمرانی جذبہ نہیں ہے لہٰذا اس میں کامرانی کا تصور وقتی، ناپائیدار اور غیر آسودگی بخش ہوتا ہے''۔ ۲۸

امرد پرستی میں کامرانی کے وقتی اور ناپائیدار حصول کی مطابقت اس عہد کے معاشرے کے عمومی حالات سے ہو جاتی ہے جہاں دنیا کی ناپائیداری کا شدید احساس تھا۔ ہر ذہن ناآسودگی کا نشیمن تھا اور جہاں دل ارمانوں کے مدفن تھے۔ یہی عارضی نشاط طوائف بازی سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ مجالسِ رنگین میں کئی طوائفوں کا تذکرہ

---

۲۷ Taylor, G.R., Sex in History, p.136, New York.

۲۸ ڈاکٹر محمد حسن، دہلی میں اُردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر، صفحہ ۹۹ اور ۱۰۰، علی گڑھ ۱۹۶۴ء

موجود ہے۔ رنگین ایک طوائف پر دو سال تک عاشق رہے۔ اس کے علاوہ طوائفوں کو دیکھتے ہی ان کا (اور ان کے ہم عمروں کا) دل ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ ایک طوائف مجرا کر رہی تھی۔ رنگین نے دیکھا:

''چوں طرفِ او نگاہ کردم دل از دست رفت۔ بدیہہ ایک مطلع گفتم و بآواز بلند از بے قراری خواندم''

تھی شعلہ یا وہ برق کہ جی میرا جل گیا
ایسی ہی کی نگاہ کہ بس دم نکل گیا[۲۹]

امرد پرستی کی جنسی معکوسیت کا ادبی اظہار ریختی میں ہوا ہے۔ ہم اسے امرد پرستی کا حصہ جدید نفسیات کی روشنی میں قرار دے رہے ہیں۔ امرد پرستی کے لیے Inversion کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق ''ہم صنفی جنسی رجحانات رکھنے والا فرد اپنے آپ کو عورت قرار دیتا ہے۔''[۳۰] یہ کیفیت ماں سے قربت اور باپ سے نفرت کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ عنصر اس راہ سے بہت سے افراد کی شخصیت میں داخل ہو جاتا ہے اور اس رجحان سے نپٹنے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اس رجحان کو تصورِ حیات' اخلاقی نصب العین اور دینی ضابطوں پر عمل کر کے ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر کے پیش نظر جب ہم دہلی کی شاعری میں اخلاقی اقدار اور بلند تصور حیات کی نمود دیکھتے ہیں تو پہلے پہل حیرت ہوتی ہے' لیکن تجزیہ کے بعد اس تضاد میں وحدت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تنقیدی نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ عظیم شاعر اور فنکار محض اپنے دور کی مخلوق نہیں ہوتا بلکہ آنے والے دور (اور اپنے دور) کا ذہنی خالق بھی ہوتا ہے وہ معاشرے سے اثرات قبول بھی کرتا ہے اور معاشرہ کو متاثر بھی کرتا ہے۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

۲۹۔ سعادت یار خاں رنگیں' مجالسِ رنگیں' صفحہ ۴۲

۳۰۔ ٹیلر' جنس تاریخ میں (انگریزی) صفحہ ۷۹

سیاسی اور تاریخی و معاشرتی حالات کی گرفت سے ہمیں انکار نہیں۔ اس مقالے کا تو موضوع ہی یہ ہے' مگر یہ حالات فنکار کی شخصیت سے گزر کر شعر و ادب بنتے ہیں اور پھر یہ حالات لفظوں کے ذریعہ شاعر کے وجود کی گہرائیوں سے ایک نئی شکل میں اُبھرتے ہیں۔ شاعر ایسی فضا کی تخلیق کرتا ہے جہاں ہمیں غم اور مسرت' اخلاقی زوال اور اخلاقی عظمت' گریہ و تبسم کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔

اس نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ہی دور اور ایک ہی سے خارجی حالات کا مقابلہ کرنے والے شاعروں کے فکر اور فن کے باہمی فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ میر' سودا اور درد ایک ہی عہد کے شاعر ہیں مگر خارجی حالات نے میر کی شخصیت کو اگر آبلہ صفت بنا دیا جس میں پھوٹ بہنے کی کیفیت ہے تو یہی حالات زہر خند بن کر سودا کی شاعری کے ہونٹوں پر تبسم کی صورت پھیل گئے' اور خواجہ میر درد کی بے نیازی اور اپنی دنیا آپ بنانے کی سعی انہیں حالات کا ایک پہلو ہے۔ تصوف کے سلسلہ میں ہم یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ یہ محض ایک ذہنی چیز نہیں بلکہ اس عہد کی تاریخ کی ایک قوت ہے۔ یہ قوت ہماری غزل کا حصہ اس درجہ بن گئی کہ غیر صوفیوں نے بھی تصوف کو شعر کے لیے لازم جانا۔ ''برائے شعر گفتن خوب است''۔ غالب کو بھی مسائلِ تصوف کے سلسلہ میں اپنے بیان پر ناز ہے۔ اگر حالات کے تحت اس عہد کی صوفیانہ فکر میں ''جبر'' کا پہلو ''قدر'' کی نسبت زیادہ ابھرا تو دوسری طرف تصوف ہماری شاعری کی فکری اساس بن گیا۔ عشق کی رہبری' انسانی بصیرت' رسوم پرستی کے خلاف ردعمل' خلوصِ نیت' ہم آہنگی' فکر و عمل اور وحدت آدم کے تصورات اس عہد کی شاعری کے لیے تصوف کا عطیہ ہیں۔ تصوف نے ضابطوں اور بے رُوح عقیدوں کو داخلی تجربوں اور مشاہدہ کی فضا سے ہم آہنگ کر کے اس عہد کی شاعری کو ایک بلند تصور حیات دے دیا۔ ایسا تصور حیات جس میں فلسفیانہ قلابازیاں نہیں بلکہ دل کی دھڑکنیں ہیں۔ کوئی ہنگامی اور عبوری دور افراد کے جسمانی اور روحانی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ امرد پرستی اور شاہد بازی کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اسی کا ثبوت ہے۔ ان حالات میں تصوف ''ذہنی پناہ گاہ'' بن گیا اور جذبات کے

نکاس کا ذریعہ۔ ''سماع'' کو اسی لیے اس عہد کے صوفیوں نے اپنایا کہ موسیقی کے ذریعہ جذبات کو رفعت دی جا سکے۔ یہ ''ترفع'' فنون لطیفہ کا بنیادی پہلو ہے۔

میر صاحب کے یہاں ہم نے ''عطار کے لونڈے'' اور ''زرگر پسر'' کو دیکھ لیا' لیکن انہیں کے کلام میں ہمیں اس عہد کا بلند تر تصور حیات بھی ملتا ہے۔ زندگیؒ کے عارضی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کا احساس بھی میر اور اس کے عہد کے بڑے شاعروں کو پوری طرح ہے۔ ان کے تصور حیات میں محبت' خودداری' عالی ہمتی' قلندرانہ زیست' مہر و وفا' وسیع المشربی اور انسان کی عظمت کے عناصر موجود ہیں۔[۱۳]

سرسری تم جہان سے گزرے   ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ   آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

یہ تصورات اس عہد کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی بڑے حسن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ حالی نے بڑا کام کرنے والوں کو بتایا ہے کہ ہر سانس عمر جاودانی ہے' لیکن خواجہ میر درد یہ پیغام پہلے دے چکے ہیں۔

بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کر اے درد   ہر دمِ دمِ عیسیٰؑ ہے' تجھے پاس نہیں ہے

یہ تصور حیات اور نظریۂ زندگی کا فیض تھا جس نے میر درد کو اپنے خارجی حالات سے بلند تر کر دیا۔ انہوں نے اپنی ''موج خون دل'' سے ''اپنا چمن'' آپ تعمیر کر لیا۔

کھلا دروازہ میرے دل پہ از بس اور عالم کا   نہ اندیشہ ہے شادی کا مجھے' نے فکر ہے غم کا

سودا کی عالی ہمتی ایک ایسے دور میں جو حوصلوں کی شکست کا زمانہ تھا' مطالعہ کا مستقل موضوع ہے۔ فرد میں یہ قوت اخلاقی تصورات اور اعلیٰ نظریۂ زندگی سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

گدا دستِ اہل کرم دیکھتے ہیں   ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

○○○

دہر بانٹے تھا متاعِ دو جہاں اے سودا   بے نوائی نے مری اس کو اشارا نہ کیا

---

[۱۳] خواجہ احمد فاروقی' میر تقی میر' حیات اور شاعری صفحہ ۴۰۸ تا ۴۱۴' علی گڑھ ۱۹۵۴ء

دہلی کے بعد لکھنؤ میں اُردو شاعری کی بزم آراستہ ہوئی۔ اس بزم کے پہلے مسند نشین دہلی کے مہاجر شاعر تھے۔ ان میں سے کچھ تو اپنے مذاق میں پختہ ہو گئے تھے اور کچھ لکھنؤ کے ماحول کے سانچے میں ڈھل گئے۔ لکھنؤ میں تعیش و آزادی کے لیے فضا سازگار تھی۔ بازاری عورتوں اور طوائفوں سے کوئی کوچہ خالی نہ تھا۔ دوسری طرف لکھنؤ میں تصوف کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ آتش کے انداز زیست اور قلندری نے انہیں صوفیانہ تصورات سے قریب تر کر دیا۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ اودھ آ کر دہلی کے شاعروں کو تنہائی اور ہجرت کے احساس نے اپنا اسیر بنالیا۔

صحرائیانِ پورب کیا جانتے ہیں اس کو　　اے مصحفی جُدا ہے انداز اس زباں کا

مصحفی کا یہ بیان لکھنؤ کی لسانی تبدیلیوں کے مطالعہ کا اظہار ہے۔ نسائیت اور ہم صنفی رجحانات نے اگر ایک طرف ریختی کو جنم دیا تو دوسری طرف زبان کے محاوروں کو متاثر کیا۔

(۱) معاملہ بندی: اس کے جلو میں رکاکت اور ابتذال کا کارواں آگے بڑھا۔

(۲) تکلف: آداب زندگی کا تکلف ادب میں صنعت گری بن جاتا ہے۔

(۳) صنعت گری الفاظ کی شعبدہ بازی بن گئی۔ عربی فارسی تراکیب کو دوبارہ رواج حاصل ہو گیا۔ رعایت لفظی اور دور از کار تشبیہ و استعارہ کا بھی اسی صنعت گری سے علاقہ ہے۔[۴۲]

ان حالات میں لکھنؤ میں غزل کے خد و خال بدل گئے۔ محبت کی جگہ محبوب نے اور جذبہ کی جگہ جسم نے لے لی۔ سوز و گداز کی جگہ بزم عشرت کے قہقہے چھا گئے' نالہ کی دل سوزی سے اربابِ محفل بے خبر ہو گئے۔ استعارہ' اپنی معنویت کھو بیٹھا اور الفاظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہونے لگے۔ مصحفی کو اس بدلے ہوئے اندازِ سخن کا شدید احساس تھا۔ انہوں نے لکھنؤ میں ایک جلاوطن کی سی زندگی گزاری۔

کیا چمکے اب فقط مرے نالے کی شاعری　　اس عہد میں ہے تیغ کی' بھالے کی شاعری

۴۲۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی' لکھنؤ کا دبستان شاعری' صفحہ ۵۵' ۱۹۶۷ء' طبع اول۔

غزل اور ریختی میں جذبہ کے فقدان نے ''پیکر پرستی'' کو ایک روایت بنا دیا۔ لکھنوی شعراء کے دیوانوں کی مدد سے اُس عہد کی خواتین کے زیورات و ملبوسات کی پوری فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ لکھنؤ میں عورتوں سے ملنے کے مواقع کی کمی نہ تھی لیکن امرد پرستی کے رجحانات یہاں کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔

آمدِ خط پر تو بوسہ کا نہ کر انکار یار　　شام کو ملتا ہے روزینہ ہر اک مزدور کا

(آتش)

ایسی مثالوں کی لکھنؤ شاعری میں کمی نہیں۔

ناسخ نے اردو زبان کی اصلاح کے سلسلہ میں تاریخی کارنامہ انجام دیا' لیکن ہماری زبان فرانسیسی کی طرح ایک ایسی زبان نہیں جس کی شیرازہ بندی کوئی اکادمی کر سکے (فرد کا تو ذکر ہی نہیں) اردو کی نشو ونما میں پورے معاشرہ کو دخل رہا ہے' اسی لیے ناسخ کے متروکات نے آہستہ آہستہ پھر ہماری شاعری اور زبان میں اپنی جگہ بنا لی۔ ''آئے ہے'' اور ''جائے ہے'' میں مضارع کی جو کیفیت تھی' اسے ناسخ نے محسوس نہ کیا۔ غالب سے لے کر عہد حاضر تک یہ افعال مسلسل نظر آتے ہیں' کیونکہ آتا ہے اور جاتا ہے وغیرہ ان کے مقابلہ میں محدود تر ہیں۔ اس نکتہ پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ آئے ہے اور جائے ہے جیسے افعال تذکیر و تانیث کی گرفت اور دائرہ سے بالاتر ہیں۔

زبان کی اصلاح کے جذبے میں لکھنؤ کا احساسِ انفرادیت بھی شامل ہے۔ لکھنؤ والوں نے دِلی کے سائے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے زبان میں غیر ضروری تراش خراش کی۔ بدلتے ہوئے سیاسی اسباب اور تقاضوں نے اس رجحان کو مزید تقویت دی۔ جب لکھنؤ کا ''نواب وزیر'' بادشاہ بن گیا تو لکھنؤ کی شاعری اور اس کی زبان پر بھی اس کا اثر پڑا' اور تصور شاعری بھی بدل گیا۔ ناسخ مضمون آفرینی اور تمثیل نگاری کو منتہائے شاعری سمجھتے ہیں۔ زبان کو شاعری میں غیر ضروری اہمیت دی گئی۔

لکھنؤ میں زبان اور فن کا مجسمہ تراشا گیا اور پھر جذبہ کو اس پر بھینٹ چڑھا کر اسی کی پوجا شروع کر دی گئی۔ آتش کے یہاں ''جذبہ'' مردہ نہیں ہوا' مگر اپنے عہد کے تصور شعر کو انہوں نے اپنے اس مقطع میں پیش کیا ہے۔

اُڑ کے آتش سے کہاں مضمونِ عالی جاسکے شاہِ تیر انداز کب چُوکا نشانہ دُور کا

اسی تصورِ شعر نے غزل میں خارجی انداز پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے پیکر پر بھی اثر ڈالا۔ ''غزل در غزل'' دوغزلہ' سہ غزلہ' چہار غزلہ کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں غزل اپنے پیکر کی رعنائی سے محروم ہو گئی' جیسے دیکھتے دیکھتے کسی نازک اندام کا منی سی عورت پر گوشت کی تہیں جم جائیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق لکھنؤ کی غزل سے ہے' عام شاعری سے نہیں۔ لکھنؤ کے خارجی انداز نے مثنوی اور مرثیہ کو فروغ بخشا اور ان اصناف کو ہماری شاعری میں آبرُومندانہ مقام عطا کر دیا۔ ان اصناف میں مقامی عناصر کے ساتھ ساتھ تہذیبی پس منظر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سحر البیان میں ''دہلی اور فیض آباد کا ملا جلا سماج اور ماحول نظر آتا ہے''[۴۳]

گلزار نسیم میں ہندو دیو مالا میں ایرانی اثرات لکھنؤ کی فضا کے زیر اثر شامل ہو گئے ہیں۔ خالص ہندوستانی عناصر نے مثنوی کے علاوہ مرثیہ میں بھی جگہ بنا لی۔ اس کا ذکر ''ملکی سرمایۂ موضوعات'' کے سلسلہ میں ہو چکا ہے کہ مرثیہ کے کردار عربی ہیں مگر فضا اور ان کرداروں کے جذبات میں ہندوستانی رنگ غالب ہے۔

لکھنؤ کے معاشرے میں جنسی عیش و عشرت کے ساتھ ساتھ ''موسیقی'' بھی شامل ہو گئی۔ موسیقی نے اگر ایک طرف رہس کو جنم دیا تو دوسری طرف ہماری شاعری کا موضوع بھی بن گئی۔ آلات موسیقی اور تقریبات کے موقعوں پر مجالس موسیقی کے ذکر کے ساتھ ساتھ راگ راگنیوں کا ذکر بھی لکھنؤ کی شاعری میں عام ہے۔ حزن اختر کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

کھرج کا وقار اور سُروں کی لکیر وہ تانیں کہ جن سے پڑیں دل پہ تیر
وہ انچیں' وہ پلٹے سنا مطربا! کہ ہر دانہ ہووے دو اشک کا
رکھب اور سُر اس طرح سے لگا کہ گندھار کا تنگ ہو حوصلا

---

۴۳ سید محمد عقیل' اُردو مثنوی کا ارتقا' الہ آباد ۱۹۶۵ء

لکھنؤ کے تمدن اور شاعری کی صورت گری میں ایرانی اثرات اور مذہبیت نے بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ نواب وزیران اودھ (اور بعد میں شاہان اودھ) اثنا عشری تھے' ان کے عقیدے کا اظہار فن تعمیر میں امام باڑوں کی صورت میں ہوا تو ادب میں مرثیہ کی صورت میں غزل کی فضا پر بھی یہ اثرات غالب ہیں۔ آہ و بکا' گریہ وزاری اور جنازہ و قبرستان کے مضامین لکھنؤ کی غزل میں بہت عام ہیں۔ اس کا سبب لکھنؤ کی ''ماتمی فضا'' کو قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بڑی حد تک یہ مذہبی عنصر تعصب سے الگ رہا اور احتشام حسین کے اس تجزیہ میں صداقت کا پہلو ہے کہ

> ''اس کا اظہار لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں فرقہ پرستی' تنگ نظری یا عصبیت کی شکل میں نہیں' ایک عقیدے سے جذباتی وابستگی کی شکل میں ہوا'' [۳۴]

۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اردو شاعری ان لسانی' فنی' تہذیبی اور فکری مراحل سے گزری۔ ۱۸۵۷ء میں برعظیم تاج برطانیہ کے زیرنگیں آ گیا اور تاریخ کے اس نئے دور کے ساتھ شعر و ادب کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا۔

---

۳۴ سید احتشام حسین' افکار و مسائل' صفحہ ۹۶' لکھنؤ ۱۹۶۲ء

منتخب کتابیات

اشاریہ

تاریخ برِ صغیر

﴿فارسی کتب﴾

مخطوطات

1	تاریخ اعظم الحرب	کامراج ولد نین سکھ	مائیکروفلم کتب خانہ جامعہ کراچی
2	بادشاہ نامہ عہد مبارک	مرزا دانش مند خاں	مائیکروفلم کتب خانہ جامعہ کراچی
3	ہفت گلشن محمد شاہی	محمد ہادی کامور خاں	مائیکروفلم کتب خانہ جامعہ کراچی
4	تاریخ محمدی	مرزا محمد حارثی	کتاب خانہ رامپور
5	چہار گلشن محمد شاہی	رائے چرمن	کتاب خانہ رامپور
6	تاریخ عالم شاہی	منالال منشی	کتاب خانہ رامپور
7	خلاصۃ التواریخ	منشی سبحان رائے	کتاب خانہ رامپور
8	منتخب اللباب	خافی خاں	مائیکروفلم کتب خانہ جامعہ کراچی

مطبوعہ

9	آئین اکبری حصہ دوم	ابوالفضل	مطبع نولکشور ۱۸۶۹ء
10	وقائع عالم شاہی	کنور پریم کشور (ترتیب امتیاز علی عرشی)	مطبوعات کتاب خانہ رامپور
11	سفر نامۂ مخلص	آنند رام مخلص	مطبوعات کتاب خانہ رامپور
12	مرقع دہلی	درگاہ قلی خاں	تاج پریس حیدر آباد دکن
13	خزانۂ عامرہ	غلام علی آزاد	مطبع نولکشور ۱۸۷۱ء

14	عمادة السعادہ	سید غلام علی خاں نقوی	مطبع نولکشور ۱۲۹۷ھ

اردو کتابیں

15	دستنبو	ترجمہ مخمور سعیدی مرتبہ نعیم الرحمٰن	
16	فسانۂ عبرت	مقدمہ وحواشی ابوالخیر کشفی	

مطبوعہ

17	سیر المتاخرین (مراۃ السلاطین)	ترجمہ گوکل پرشاد	نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۸ء
18	تاریخ ہندوستان	مفتی ذکاء اللہ	شمس المطابع دہلی ۹۸۔۱۸۹۷ء
19	موج کوثر	شیخ محمد اکرام	فیروز سنز لاہور۔ کراچی۔ پشاور
20	تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت	سید ہاشمی فرید آبادی	انجمن ترقی اردو پاکستان
21	ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	مکتبہ جامعۂ دہلی
22	قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر عابد حسین	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ
23	انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ	عبداللہ یوسف علی	ہندوستانی اکادمی الہ آباد و کراچی
24	تاریخ ہند (عہد جدید)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	جامعۂ عثمانیہ دکن
25	سید احمد شہید	غلام رسول مہر	کتاب منزل لاہور
26	سرگزشت مجاہدین	غلام رسول مہر	کتاب منزل لاہور

27	تاریخ اودھ	نجم الغنی خاں	مطبع نول کشور ۱۹۱۹ء
28	شباب لکھنؤ	مصنفہ ولیم نائیٹن مترجم (محمد احمد علی)	الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء
29	فسانۂ عبرت	رجب علی بیگ سرور مرتبہ مسعود حسن رضوی	کتاب نگر لکھنؤ
30	لکھنؤ اور جنگ آزادی	(مرتب کا نام درج نہیں)	ادبی اکیڈمی لکھنؤ
31	واجد علی شاہ اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری	کتاب منزل لاہور
32	رسالۂ اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
33	بہادر شاہ کا مقدمہ	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	ایڈیشن ۱۹۴۷ء
34	داستان غدر	ظہیر دہلوی	اکادمی پنجاب لاہور
35	سن ستاون	پنڈت سندر لال	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
36	۱۸۵۷ء	غلام رسول مہر	کتاب منزل لاہور
37	جنگ آزادی	خورشید مصطفیٰ رضوی	مکتبۂ برہان دہلی
38	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری	کتاب منزل لاہور
39	واقعات دار الحکومت دہلی	بشیر الدین احمد	شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء
40	حیات حافظ رحمت خاں	سید الطاف علی بریلوی	نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۳ء
41	رودِ کوثر	شیخ محمد اکرام	تاج آفس کراچی

42	حیاتِ ولی	مولوی محمد رحیم بخش	المکتبہ السلفیہ لاہور
43	شاہ ولی اللہ کی تعلیم	غلام حسین جلیانی	شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد
44	۱۸۵۷ء اور جانبازانِ حریت	مولانا سید محمد میاں	ایم۔ برادرس۔ دہلی

انگریزی کتابیں

45- The Evolution of British Policy towards Indian States, K.M. Panikar, 1929.

46- Selections from Calcutta Gazettes (Vol. V), 1869.

47- The Revolt in India, Evelyn Wood, 1908.

48- Bahadar Shah II, Mahdi Hassan, 1958.

49- Fall of the Mughal Empire, Vol. I, J.N. Sarkar, 1949.

50- The Indian Musalmans, W.W. Hunter, Calcutta, 1945.

51- The Muslim Community of the Indopak Subcontinent, I.H Qureshi, Hague, 1962.

52- The cambridge History of India, Vol V, 1929.

53- A History of the Freedom Movement, Pakistan Historical Society, Karachi.

54- A History of the Freeom Movement in India, Tara Chand, Delhi, 1961.

55- History of the Freedom Movement in India, Vo. I, R.C. Majumdar, 1963.

تذکرے

1	نکات الشعرا	میر تقی میر (مرتبہ عبدالحق)	انجمن ترقی اُردو ہند
2	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی	انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۲ء

3	ریاض الفصحا	مصحفی (مرتبہ عبد الحق)	انجمن ترقیٔ اردو ہند
4	تذکرۂ ہندی	مصحفی (مرتبہ عبد الحق)	انجمن ترقی اُردو ہند
5	مجموعۂ نغز	میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ محمود شیرانی	مطبوعہ لاہور ۱۹۳۳ء
6	عمدۂ منتخبہ	میر محمد خاں بہادر سرور	شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی
7	دستور الفصاحت	یکتا لکھنوی مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی	کتاب خانہ رامپور
8	تذکرۂ نادر	مرزا نادر لکھنوی مرتبہ مسعود حسن رضوی	کتاب نگر لکھنؤ
9	مجالس رنگین	سعادت یار خاں رنگین مرتبہ مسعود حسن رضوی	نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء
10	آب حیات	محمد حسین آزاد	شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۵۴ء
11	گل رعنا	سید عبدالحئی	دارالمصنفین ۱۳۶۴ھ (طبع سوم)
12	خم خانۂ جاوید	لالہ سری رام	مطبع نول کشور ۱۹۰۸ء
13	شعر الہند اول و دوم	عبدالسلام ندوی	دارالمصنفین ۱۹۵۴ء (طبع سوم)

تاریخ ادب و دبستان، شاعروں کی سوانح عمریاں اور تنقیدی مجموعے

1	تاریخ اردو ادب	رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا عسکری	مطبع نول کشور

2	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
3	اُردو ادب کی جدید تاریخ	نسیم قریشی	ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ
4	اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی
5	داستان تاریخ اُردو	حامد حسن قادری	لکشمی نرائن لال اگروال و کراچی
6	قدیم اُردو	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اُردو پاکستان
7	اُردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	مطبع نو لکشور لکھنؤ، جنرل پبلشنگ ہاؤس کراچی
8	پنجاب میں اردو	حافظ محمود خاں شیرانی	مکتبہ معین الادب لاہور
9	دکن میں اُردو	نصیر الدین ہاشمی	اُردو مرکز لاہور
10	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر زور قادری	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی
11	اُردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	عظیم پبلشنگ ہاؤس
12	اُردو نظم پر تنقیدی نظر	مرتبہ ناشر	تاج بک ڈپو لاہور
13	اُردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
14	اُردو غزل کی نشو ونما	ڈاکٹر رفیق حسین	لالہ رام نرائن الٰہ آباد
15	اُردو مثنوی کا ارتقا	ڈاکٹر سید محمد عقیل	الٰہ آباد یونیورسٹی
16	اردو ڈرامہ اور اسٹیج	مسعود حسن رضوی	کتاب نگر لکھنؤ
17	اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اُردو پاکستان
18	مذہب اور شاعری	ڈاکٹر اعجاز حسین	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی
19	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اُردو مرکز لاہور۔

20	دلی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	انجمن ترقی اردو پاکستان
21	دہلی میں اُردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر	ڈاکٹر محمد حسن	ادارۂ تصنیف علی گڑھ
22	تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب	سید محمد مبین نقوی	مطبع انوار احمدی الٰہ آباد
23	دریائے لطافت	انشاء اللہ خاں انشا مترجمہ کیفی	انجمن ترقی اُردو ہند
24	فارسی پر اُردو کا اثر	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	طبع اول ۱۹۵۲ء
25	فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	انجمن ترقی اُردو علی گڑھ
26	کبیر صاحب	پنڈت منوہر لال زتشی	ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد
27	سلطان محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر محی الدین زور قادری	سب رس کتاب گھر حیدر آباد دکن
28	نصرتی	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اُردو ہند
29	سرگزشت حاتم	ڈاکٹر محی الدین زور	ادارۂ ادبیات اردو دکن
30	مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اُردو کلام	عبدالرزاق قریشی	ادبی پبلشرز بمبئی
31	سودا	شیخ چاند مرحوم	انجمن ترقی اُردو پاکستان
32	ذکر میر	مرتبہ مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اُردو ہند
33	میر کی آپ بیتی	مترجمہ و مرتبہ نثار احمد فاروقی	مکتبۂ برہان دہلی

34	میر تقی میرؔ حیات اور شاعری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ
35	میر حسن اور ان کا زمانہ	ڈاکٹر وحید قریشی	استقلال پریس لاہور
36	مصحفی اور ان کا کلام	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	شیخ مبارک علی لاہور
37	انشاء اللہ خاں انشاء	اسلم پرویز	مکتبۂ شاہراہ دہلی
38	سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	انجمن ترقی اُردو پاکستان
39	جرأتؔ ان کا عہد اور عشقیہ شاعری	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی
40	نظیر اکبر آبادیؔ ان کا عہد اور شاعری	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی
41	ذوقؔ سوانح اور انتقاد	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	مجلس ترقی ادب لاہور
42	واقعات انیس	میر مہدی حسن	اصح المطابع لکھنؤ
43	حیات انیس	امجد علی اشہری	مطبع آگرہ اخبار ۱۹۰۷ء
44	حیات دبیر	سید افضل حسین ثابت	کوکب پریس لاہور ۱۹۱۳ء
45	غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	انجمن ترقی اُردو ہند
46	تلامذۂ غالب	مالک رام	مرکز تصنیف و تالیف نکو۔
47	حالی کی اُردو نثر نگاری	ڈاکٹر عبدالقیوم	مجلس ترقی ادب لاہور
48	دکھنی کے چند تحقیقی مضامین	نصیر الدین ہاشمی	آزاد کتاب گھر دہلی
49	ادبی تحریریں	ڈاکٹر محی الدین زور	ادارۂ ادبیات اُردو دکن

50	ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبۂ جدید لاہور
51	بحث و نظر	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبۂ اُردو لاہور
52	مباحث	ڈاکٹر سید عبداللہ	مجلس ترقی ادب لاہور
53	علمی نقوش	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	اعلیٰ کتب خانہ کراچی
54	افکار و مسائل	احتشام حسین	نسیم بک ڈپو لکھنؤ
55	ادب اور شعور	ممتاز حسن	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
56	اردو کے کلاسیکی شعرا (جلد اول)	مترتبہ ایم۔ حبیب خاں	انڈین بک ہاؤس علی گڑھ

57. History of Urdu Literature, Dr, M. Sadiq, 1964.

58	مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (اول و دوم)	مرتبہ مظہر محمود شیرانی	مجلسِ ترقی ادب لاہور

کلیات ودواوین

مخطوطات

1	کلیات زٹلی	میر جعفر زٹلی (دو مخطوطات)	کتاب خانہ رامپور
2	دیوان زادہ حاتم	شاہ حاتم	کتاب خانہ رامپور
3	دیوان آبرو	شاہ مبارک آبرو	کتاب خانہ رامپور
4	دیوان حسرت	میر جعفر علی حسرت	کتاب خانہ رامپور
5	دیوان واصل	واصل	کتاب خانہ رامپور
6	کلیات سودا	مرزا سودا	کتاب خانہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
7	دیوان سوز	میر سوز	کتاب خانہ رامپور
8	دیوان قائم	قائم چاندپوری	کتاب خانہ رامپور
9	دیوان حسن	میر حسن	کتاب خانہ رامپور
10	دواوین مصحفی (اول، دوم، سوم، چہارم اور ششم)	مصحفی	کتاب خانہ رامپور
11	دیوان رنگین	سعادت یار خاں رنگین	کتاب خانہ رامپور
12	دیوان جرأت	قلندر بخش جرأت	کتاب خانہ رامپور
13	دیوان نصیر	شاہ نصیر دہلوی	کتاب خانہ رامپور

14	دیوان منیر	منیر شکوہ آبادی	کتاب خانہ رامپور
15	دیوان اُردو	ناصر دہلوی	مملوکہ احمد سلیم اللہ' کراچی

مطبوعہ

16	کلیات محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر محی الدین زور	سب رس کتاب گھر دکن
17	کلیات شاہی	مرتبہ مبارز الدین رفعت	انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ
18	دیوان ہاشمی	مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل	ادارۂ ادبیات اُردو دکن
19	کلیات بحری	مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید	مطبع نول کشور
20	کلیات ولی	مرتبہ نور الحسن ہاشمی	انجمن ترقی اُردو پاکستان
21	کلیات میر جعفر زٹلی	میر جعفر زٹلی	مطبع محمدی ۱۲۸۹ھ
22	کلیات میر جعفر زٹلی	مرتبہ فرحت اللہ بلند شہری	تجارت بک ایجنسی بجنور
23	دیوان فائز	مرتبہ مسعود حسن رضوی	انجمن ترقی اُردو ہند
24	کلیات سودا حصہ اول و دوم	مرزا سودا	نول کشور پریس لکھنؤ
25	کلیات میر	مرتبہ عبدالباری آسی	نول کشور پریس لکھنؤ
26	کلیات میر	مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی	اُردو دنیا' کراچی
27	دیوان میر حسن	میر حسن دہلوی	مطبع نولکشور ۱۹۱۲ء

28	دیوان درد	مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی	مجلس ترقی ادب لاہور
29	دیوان یقین	مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ	مطبع مسلم یونیورسٹی ۱۹۳۰ء
30	دیوان بیدار	مرتبہ جلیل قدوائی	ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد
31	دیوان اثر	مرتبہ مولوی عبدالحق	مطبع مسلم یونیورسٹی ۱۹۳۰ء
32	نادرات شاہی	شاہ عالم ثانی آفتاب	کتاب خانہ رامپور
33	دیوان ذوق	مرتبہ انوار امراؤ مرزا	مطبع احمدی ۱۲۷۹ھ
34	دیوان فغان	مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن	انجمن ترقی اردو پاکستان
35	دیوان ذوق	مولف محمد حسین آزاد	آزاد بک ڈپو دہلی ۱۹۳۲ء
36	کلیات مومن	مومن خاں مومن	مطبع نولکشور
37	کلیات مومن	مرتبہ عبادت بریلوی	اُردو دُنیا کراچی
38	کلیات مومن حصہ اول و دوم	مرتبہ کلب علی خاں فائق	مجلس ترقی ادب لاہور
39	دیوانِ غالب	مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
40	کلیات حسرت و شیفتہ	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۶ء
41	دیوان شیفتہ	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	اکادمی پنجاب لاہور
42	کلام عاصی	منشی گھنشیام عاصی	کائستھ اُردو سبھا دہلی

43	کلیات ظفر (دیوان چہارم)	بہادر شاہ ظفر	مطبع نولکشور ۱۸۸۱ء
44	دیوان ظفر	بہادر شاہ ظفر	مطبع احمدی ۱۲۷۸ھ
45	کلیات ظفر	بہادر شاہ ظفر	مطبع مجیدی کانپور ۱۹۲۱ء
46	دیوان ظہیر	ظہیر دہلوی	مفید عام پریس آگرہ ۱۹۱۶ء
47	دیوان مجروح	میر مہدی مجروح	عبدالعزیز تاجر کتب لاہور
48	دفتر شگرف	نسیم دہلوی	مطبع مصطفائی لکھنؤ
49	مہتاب داغ	مرتبہ سید سبط حسن	مجلس ترقی ادب لاہور
50	کلیات نظیر اکبرآبادی	نظیر اکبرآبادی	مطبع نولکشور ۱۹۵۱ء
51	کشف البغاوت گورکھپور	سید احمد علی شاہ	مطبع حیدری آگرہ
52	کلیات ناسخ	امام بخش ناسخ	مطبع نولکشور ۱۲۷۹ھ
53	کلیات ناسخ	امام بخش ناسخ	مطبع اودھ گزٹ ۱۸۶۰ء
54	کلیات آتش	خواجہ حیدر علی آتش	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
55	گلدستۂ عشق	رند لکھنوی	مطبع نول کشور
56	دیوان اسیر	مظفر علی اسیر	مطبع نولکشور ۱۸۷۰ء
57	دیوان واجد علی شاہ	واجد علی شاہ اختر	مطبع محمدی
58	مثنوی حزن اختر	واجد علی شاہ	مطبع سلطانی کلکتہ
59	مثنوی حزن اختر	واجد علی شاہ	دائرہ ادبیہ لکھنؤ
60	مجموعہ رباعیات میر انیس	مرتبہ سید محمد عباس	نولکشور پریس لکھنؤ
61	دیوان رشک	علی اوسط رشک	نام مطبع غائب ہے کتب خانہ جامعہ کراچی
62	مراۃ الغیب	امیر مینائی	مطبع نولکشور کانپور
63	کلیات منیر شکوہ آبادی	منیر شکوہ آبادی	۱۲۹۶ھ (آغاز کے صفحات غائب)

شعری انتخابات

1	انتخاب سخن	مرتبہ مولانا حسرت موہانی	علی گڑھ اور کانپور
2	جواہر سخن (مکمل)	مرتبہ کیفی چڑیا کوٹی	ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد
3	اردو شاعری کا انتخاب	مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور قادری	ساہتیہ اکادمی دہلی
4	سفینۂ غزل	مرتبہ سید محمد عباس	تاج کمپنی کراچی و لاہور
5	فغان دہلی	مرتبہ تفضّل حسین کوکب	مطبع حیدری وصفدری بمبئی
6	نشید حریّت	مرتبہ شان الحق حقی	ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی
7	انتخاب کلام میر	مرتبہ مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو
8	مزامیر حصہ اول و دوم	مرتبہ جعفر علی خاں اثر لکھنوی	کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی
9	دیوان میر	مرتبہ علی سردار جعفری	ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی
10	انتخاب سودا	مرتبہ ثاقب کانپوری	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

متفرقات

اُردو

1	شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	مرتبہ خلیق احمد نظامی	علی گڑھ انڈیا

2	مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط	مترجمہ و مرتبہ خلیق انجم	مکتبۂ برہان دہلی
3	اردوئے معلّٰی حصہ اول و دوم	مرزا غالب	مطبع مفید عام آگرہ
4	خطوط غالب	مرتبہ غلام رسول مہر	کتاب منزل لاہور
5	نصیحت المسلمین	مولوی خرم علی	مخطوطہ، کتب خانہ خاص انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی
6	مجموعۂ فتاویٰ عزیزی جلد دوم		مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۴ھ

انگریزی

7- History of Political thought, R.G, Gettell, 1951.
8- Five Ideas that changed the World, Barbara Ward, 1959.
9- Sex in History-G. Rattary Taylor.
10- Folk Tales from China, 1961.

رسائل و جرائد

تمام اہم رسالوں کا حوالہ دینا ممکن نہیں جن رسالوں یا شماروں سے خصوصی طور پر استفادہ کیا گیا ان کے نام درج ذیل ہیں:

1	سہ ماہی ہندوستانی الٰہ آباد	فائل ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۳ء
2	ماہنامہ معارف اعظم گڑھ	۱۹۳۹ء اور ۱۹۵۳ء کے فائل
3	ماہنامہ اردوئے معلّٰی علی گڑھ	۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۵ء تک کے فائل
4	ماہنامہ ہمایوں لاہور	۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے فائل
5	ماہنامہ صبح امید لکھنؤ	نومبر ۱۹۱۸ء

6	ماہنامہ برہان دہلی	میر اور مصحفی پر سلسلہ مضامین
7	علی گڑھ میگزین	طنز وظرافت نمبر
8	ماہنامہ نگار لکھنؤ	مصحفی نمبر
9	نقوش لاہور	غزل نمبر
10	سہ ماہی نیا دور کراچی	۱۹۶۰ء (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مقالہ ثقافت اُردو)
11	ماہنامہ ''ماہ نو'' کراچی	مئی ۱۹۶۸ء (فضل قدیر کا مضمون احمد اللہ شاہ دلاور جنگ)

اِشاریہ

یہ رجال و کتب اور اہم موضوعات کا اشاریہ ہے۔ شہروں کے ناموں کو شامل نہیں کیا گیا ہے، البتہ بعض تاریخی جگہوں اور محلوں (مہتاب باغ، قیصر باغ، وغیرہ) کو شامل کر لیا گیا ہے۔

ترتیب میں شاعروں کے تخلص اور دوسرے لوگوں کے ناموں کی معروف صورت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

کتابوں اور رسالوں کے نام خط کشیدہ ہیں۔

(آ)

(ا)

(ب)

ت

ٹ

ث

ج

چ

ح

خ

د

ڈ

ذ

ر

ز

س

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

و

ہ

ی

ہماری دیگر کتابیں

کتاب	مصنف
علوم الحدیث	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
دروس سیرت	ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی
دنیائے اسلام میں سائنس وطب کا عروج	ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی
سیرت رسول قرآن کے آئینے میں	ڈاکٹر عبدالغفور راشد
تاج محل کے دیس میں	حکیم راحت نسیم سوہدروی
عورت عہد رسالت میں	عبدالحلیم ابوشقة
میاں عبدالعزیز مالواڈہ جدوجہد آزادی کا روشن ستارہ	محمد اسحاق بھٹی
آب زم زم غذا، دوا اور شفا	دکتور خالد جاد
امتحان میں کامیابی کے زریں اصول	خواجہ ولید سالک

ڈسٹری بیوٹرز

اردو بازار نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ پاکستان
فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ISBN 978-969-8983-15-4